ارمغانِ اقبال

مختلف مقالات کا فکر انگیز مجموعہ

رحیم بخش شاہین

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۱۳ - ای شاہ عالم مارکیٹ، لاہور (پاکستان)

طابع:- رانا اللہ داد خان، مینجنگ ڈائرکٹر
ناشر:- اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۱۳-ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور
مطبع:- زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور
اشاعت اول:- نومبر ۱۹۹۱ء ۱۱۰۰

قیمت : 66/ ۵۴/- روپے

زیر اہتمام
دار الاشاعت اسلامی
۱۱- الکریم مارکیٹ اردو بازار۔ لاہور

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

پیش لفظ

"ارمغان اقبال" میرے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو میں نے گذشتہ سالوں میں علامہ اقبال کی شخصیت اور سوانح سے متعلق بعض موضوعات پر تحریر کیے تھے اور وطن عزیز کے وقیع علمی مجلّوں میں شائع ہوئے تھے۔ ایک عرصے سے میرے احباب اور خود میری خواہش تھی کہ ان کو کتابی صورت میں مرتب کر دوں لیکن مصروفیات کی کثرت آڑے آتی رہی۔ خدا کا شکر ہے کہ کچھ عرصہ پیشتر مجھے اس خواہش کی تکمیل کا موقعہ مل گیا۔ میں نے بعض مقالات پر نظر ثانی کی اور انہیں زیر نظر مجموعے کی شکل دے دی۔ ان مقالات کا تعارف کچھ یوں ہے :-

ارمغان اقبال

اقبال اپنی زندگی کے آخری دنوں میں حقیقت اسلام اور فقہ اسلامی پر ایک کتاب لکھنے کی آرزو کرتے تھے۔ اس غرض سے انہوں نے انگریزی میں کچھ اشارات تحریر کیے تھے جو دو خطبوں پر مشتمل ہیں لیکن ان کی یہ آرزو تشنۂ تکمیل رہی اور ان اشارات کو کتاب کی صورت دینے کا انہیں موقع نہ مل سکا۔ اس کے باوجود ان اشارات کی بڑی اہمیت ہے ان کی بدولت فکر اقبال کے بعض پہلو بآسانی سمجھ میں آ سکتے ہیں اس لیے میں نے مناسب خیال کیا کہ ان اشارات کے پس منظر پر روشنی ڈالنے کے علاوہ ان کا ترجمہ اور تشریح بھی کر دوں۔ میرا یہ مقالہ اسی کاوش پر مشتمل ہے۔

شیخ نور محمد پدر و مرشد اقبال

شیخ نور محمد اقبال کے والد ماجد تھے۔ اقبال نے ان سے اخلاقی تربیت

بھی حاصل کی اور روحانی فیض بھی۔ انہیں اپنے والد ماجد پر بجا طور پر ناز تھا۔ شیخ نور محمد کون تھے اور انہیں قدرت نے کن کمالات سے نوازا تھا؟ میں نے اپنے اس مقالے میں شیخ نور محمد کی شخصیت کے بارے میں ان سوالات کا جواب مہیا کرنے کی کوشش کی ہے۔ قارئین محسوس کریں گے کہ اس مقالہ میں پہلی بار کئی حقائق مربوط صورت میں منظر عام پر آتے ہیں۔

علامہ اقبال اور اکبر الہ آبادی

اکبر حسین اکبر الہ آبادی سے کون واقف نہیں۔ اردو شاعری میں ان کا شمار صف اول کے شاعروں میں ہوتا ہے۔ طنز و ظرافت ان کا خاص میدان ہے اور اس میں شاید ہی کوئی شاعر ان کا مدمقابل ہو۔ علامہ اقبال اکبر کی فنی مہارت ہی کے قائل نہ تھے ان کی بصیرت اور انداز فکر و نظر کے بھی معترف تھے۔ خود اکبر بھی اقبال کی صلاحیتوں کے مداح تھے تاہم بعض مواقع پر اختلاف آرا بھی واقع ہوا اس کے باوجود دونوں کے محبت آمیز تعلقات میں فرق نہ آیا اس مقالے میں دونوں عظیم شاعروں کے تعلقات کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے ذریعے دونوں کی شخصیتوں کے نئے گوشے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

تیسری گول میز کانفرنس اور اقبال

گول میز کانفرنس برصغیر کی تحریک آزادی میں ایک اہم موڑ ہے حکومت برطانیہ نے یہ کانفرنس برصغیر کے سیاسی مسئلے کے حل کی غرض سے منعقد کی تھی۔ علامہ اقبال نے اس کے دوسرے اور تیسرے دور میں مسلمانانِ برصغیر کی نمائندگی کی تھی۔ دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے اقبال کے سفر کی تفصیلات محمد حمزہ فاروقی نے "سفر نامہ اقبال" کے نام سے کتابی صورت میں مرتب کی ہیں میں نے تیسری گول میز کانفرنس کے سلسلے میں ضروری معلومات کو اس مقالے میں مرتب صورت میں پیش کر دیا ہے۔

اقبال کا ایک نادر مکتوب

اقبال کی نظم و نثر کے باقیات پر بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن تلاش و جستجو کا عمل جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔ خصوصاً اقبال کے مکاتیب کی خاصی تعداد ابھی تک ہماری دسترس سے باہر ہے، گاہے گاہے کوئی نہ کوئی غیر مطبوعہ خط منظر عام پر آجاتا ہے۔ جس سے اقبال کے بارے میں نئی بات ہمارے علم میں آجاتی ہے، اقبال کا ایک نادر خط مجھے سید شاہد حسن دہلوی کی وساطت سے ملا جو اقبال کے مکتوب الیہ کے پوتے ہیں۔

اقبال کا ایک گم شدہ اہم مکتوب

سید نذیر نیازی مرحوم اقبال شناسی میں اونچا مقام رکھتے ہیں، ان کا قلم فکر اقبال کی اشاعت کے لیے وقف تھا۔ انہوں نے اقبال کے مکتوبات بھی مرتب کر کے شائع کیے ہیں ان کے مرتب کردہ مجموعے میں ایک خط کی کمی تھی یہ خط سید نذیر نیازی نے شیرازہ لاہور کے مدیر چراغ حسن حسرت کو دیا تھا جو انہوں نے شیرازہ کے اقبال نمبر میں شائع کر دیا تھا لیکن کسی وجہ سے اس کا علم سید نذیر نیازی کو نہیں ہو سکا۔ حسن اتفاق سے یہ خط مجھے مل گیا یہ خط فکر اقبال کے ایک اہم گوشے کو متعارف کراتا ہے۔

اقبال کا ذخیرۂ کتب

اس عنوان سے اقبال کی ان کتابوں کی موضوع وار فہرست دی گئی ہے جو انہوں نے آخر عمر میں اسلامیہ کالج کو بطور عطیہ عنایت کی تھیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر کتابیں اقبال کے زیر مطالعہ رہی ہیں اور ان کے حواشی پر اقبال نے اپنی آرا بھی تحریر کی ہیں، افکار اقبال کے پس منظر کی تلاش و جستجو میں یہ کتابیں بہت مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔

میں مجلہ اسلامی تعلیم لاہور، "اقبال"، "اقبال ریویو"، "ماہ نو"، اور صحیفہ کے ارباب اختیار کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے ان مقالات کی مجموعہ کی صورت میں اشاعت نو کی اجازت مرحمت فرمائی۔

۲۱/اپریل ۱۹۸۴ء

رحیم بخش شاہین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ارمغانِ اقبال

تاریخی پس منظر

۱۹۲۴ء کے لگ بھگ اقبال اس امر کے خواہشمند تھے کہ اجتہاد کے مسئلہ پر کام کیا جائے۔ علامہ اقبال نے سید سلیمان ندوی کو جو خطوط لکھے ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس موضوع پر سنجیدگی سے غور کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر علوم اسلامی کا کوئی ماہر ان سے معاونت کرے تو اس سلسلے میں مفید خدمت انجام دی جا سکتی ہے۔ اس زمانے میں ان کی نظر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری پر پڑی۔ اقبال ان سے بہت متاثر تھے۔ حسنِ اتفاق سے مارچ ۱۹۲۵ء میں جب مولانا انور شاہ کشمیری، انجمن خدام الدین کے ایک جلسے میں شرکت کے لیے لاہور تشریف لائے تو علامہ نے ایک دعوت کا اہتمام کیا جس میں مولانا انور شاہ کشمیری نے چند دیگر علماء کے ساتھ شرکت کی۔ علامہ اقبال کی خواہش تھی کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ مولانا کو مستقل طور پر لاہور بلا لیا جائے تاکہ ان سے مختلف علوم اسلامی خصوصاً فقہ میں استفادہ کیا جا سکے[1]۔ ۱۹۲۶ء میں جب مولانا بعض انتظامی اختلافات کی بنا پر دارالعلوم دیوبند سے علیحدہ ہوئے تو اقبال کو امید تھی کہ اب وہ ضرور لاہور آ جائیں گے۔ سعید احمد اکبر آبادی علامہ اقبال کی اس خواہش کے حوالے سے مولانا انور شاہ کشمیری پر اپنے مضمون "اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم" میں لکھتے ہیں:

"دارالعلوم دیوبند میں اختلافات کے باعث جب حضرۃ الاستاذ

---

[1] بادشاہی مسجد لاہور: عبدالرحمٰن چغتائی، کتاب خانہ نورس، ۱۹۷۲ء، صفحہ: ۳۸۔

نے اپنے عہدہ صدر الاساتذہ سے استعفیٰ دیا اور یہ خبر اخبارات میں چھپی تو اس کے چند روز بعد میں ایک دن ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا فرمانے لگے کہ آپ کا اور دوسرے مسلمانوں کا جو بھی تاثر ہو میں بہر حال شاہ صاحب کے استعفیٰ کی خبر پڑھ کر بہت خوش ہوا ہوں۔ میں نے بڑے تعجب سے عرض کیا "کیا آپ کو دار العلوم دیوبند کے نقصان کا کچھ ملال نہیں"؟ فرمایا کیوں نہیں؟ مگر دار العلوم کو تو صدر المدرسین اور بھی مل جائیں گے اور یہ جگہ خالی نہ رہے گی لیکن اسلام کے لیے جو کام میں شاہ صاحب سے لینا چاہتا ہوں، اس کو سوائے شاہ صاحب کے کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔ اس کے بعد انہوں نے اس اجمال کی تفصیل یہ بیان کی کہ آج اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی جدید تدوین ہے جس میں زندگی کے ان سینکڑوں ہزاروں مسائل کا صحیح اسلامی حل پیش کیا گیا ہو جن کو دنیا کے موجودہ قومی اور بین الاقوامی، سیاسی، معاشی اور سماجی احوال و ظروف نے پیدا کر دیا ہے۔ مجھ کو پورا یقین ہے کہ اس کام کے لیے میں اور شاہ صاحب دونوں مل کر ہی کر سکتے ہیں۔ ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی شخص اس وقت عالمِ اسلام میں ایسا نظر نہیں آتا جو اس عظیم الشان ذمہ داری کا حامل ہو سکے۔ پھر فرمایا یہ مسائل کیا ہیں؟ اور ان کا سرچشمہ کہاں ہے؟ میں ایک عرصہ سے ان کا بڑے غور سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ یہ سب مسائل میں شاہ صاحب کے سامنے پیش کروں گا اور ان کا صحیح اسلامی حل کیا ہے؟ یہ شاہ صاحب بتائیں گے۔ اس طرح ہم دونوں کے اشتراک و تعاون سے فقہ جدید کی تدوین عمل میں آجائے گی۔"[1]

---

[1] حیات انور: مرتبہ سید محمد ازہر شاہ قیصر، ص۲۵۔ اس امر کی تصدیق مولانا حافظ عبد الرؤف نے بھی کی ہے جو مظفر آباد میں مقیم ہیں اور ان دنوں لاہور میں جامعہ فتحیہ اچھرہ میں درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔

اقبال نے مولانا انور شاہ کی علیحدگی پر انہیں ایک تفصیلی تار دیا تاکہ مولانا کو لاہور منتقل ہونے پر آمادہ کر سکیں لیکن افسوس کہ اقبال اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے جناب عبدالرشید مولانا عبدالحنان ہزاروی کی زبانی لکھتے ہیں :۔

"جب علامہ شاہ صاحب نے دارالعلوم سے استعفیٰ دے دیا، میں ان دنوں لاہور آسٹریلیا جامع مسجد میں خطیب تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے دیوبند ایک تفصیلی تار دیا جس میں شاہ صاحب سے درخواست کی گئی تھی کہ اب آپ لاہور تشریف لے آئیں اور یہیں قیام فرمائیں۔ جوابی تار تھا، جس کا کوئی جواب نہ آیا۔ جس پر ڈاکٹر صاحب نے مجھ کو دیوبند بھیجا کہ تم جا کر زبانی عرض کرو۔ میں گیا تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کو وہ تار اس وقت دیا گیا جب ڈابھیل والوں نے اصرار کر کے وہاں تشریف لے جانے پر رضامند کر لیا تھا۔ میں ملا تو فرمایا افسوس کہ آپ کا پیغام بعد میں ملا اور میں ڈابھیل والوں سے وعدہ کر چکا تھا۔" [۱]

مولانا لاہور نہ آ سکے لیکن اقبال ان سے مختلف علمی و دینی مسائل میں بھرپور استفادہ کرتے رہے۔ [۲]

۱۹۲۴ء میں اقبال نے انگریزی میں ایک مقالہ "اجتہاد" پر لکھا اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی کو بھیجا تاکہ وہ اس کے بارے میں اپنی رائے دیں۔ مولانا ماجد نے مقالے کے بارے میں جو رائے دی وہ خاصی مخالفانہ تھی۔ علامہ اقبال نے مولانا ماجد کے نام اپنے مکتوب محررہ ۲۲ مارچ ۱۹۲۵ء میں اس رائے پر یوں تبصرہ کیا ہے :۔

---

[۱] بیس بڑے مسلمان : عبدالرشید ارشد، صفحہ : ۳۷۷

[۲] تفصیل کے لیے دیکھیے، اقبال کے ممدوح علما، مرتبہ قاضی افضل حق قرشی۔

"آپ کا نوٹ پڑھ کر مجھے بہت تعجب ہوا۔ معلوم ہوتا ہے عدیم الفرصتی کی وجہ سے آپ نے وہ مضمون بہت سرسری نظر سے دیکھا ہے۔ بہرحال میں آپ کا خط زیرِ نظر رکھوں گا۔ مضمون کا مسودہ ارسال فرمائیے۔" [1]

اس رائے پر غور کرنے کے نتیجے میں علامہ اقبال کو اپنی تحقیقات پر اطمینان نہ رہا۔ لہٰذا انہوں نے اس کی اشاعت کا خیال دل سے نکال دیا۔ ۲ ستمبر ۱۹۲۵ء کو صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام ایک خط میں پہلے تو بڑی انکساری اور فراخدلی سے مذہبی معلومات میں کمی کا اظہار کرتے ہیں:-

"میری مذہبی معلومات کا دائرہ نہایت محدود ہے، البتہ فرصت کے اوقات میں میں اس بات کی کوشش کیا کرتا ہوں کہ ان معلومات میں اضافہ ہو۔ یہ بات زیادہ تر ذاتی اطمینان کے لیے ہے نہ کہ تعلیم و تعلّم کی غرض سے۔" [2]

پھر لکھتے ہیں:-

"کچھ مدت ہوئی میں نے اجتہاد پر ایک مضمون لکھا تھا۔ مگر دورانِ تحریر میں اس کا احساس ہوا کہ یہ مضمون اس قدر آسان نہیں ہے جیسے میں نے اسے ابتداء میں تصور کیا تھا۔ اس پر تفصیل سے بحث کرنے کی ضرورت ہے۔ موجودہ صورت میں وہ مضمون اس قابل نہیں کہ لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ کیونکہ بہت سی باتیں جن کو مفصل لکھنے کی ضرورت ہے اس مضمون میں نہایت مختصر طور پر اشارۃً بیان کی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اسے آج تک شائع نہیں کیا۔ اب میں انشاء اللہ اسے ایک کتاب کی

---

[1] اقبال نامہ مجموعہ مکاتیب اقبال حصہ اوّل مرتبہ شیخ عطاء اللہ ایم اے صفحہ ۲۳۸۔
[2] ایضاً صفحہ ۴۶۔

صورت میں منتقل کرنے کی کوشش کروں گا۔ جس کا عنوان یہ ہوگا۔

(Islam as I understood it.) مقصود یہ ہے

کہ کتاب کا مضمون میری ذاتی رائے تصوّر کیا جائے۔ جو ممکن ہے غلط ہو۔[1]

علامہ اقبال نے قریب قریب یہی عندیہ اس مضمون میں بیان کیا ہے جو انہوں نے ۱۸ مارچ ۱۹۲۶ء کو علامہ سیّد سلیمان ندوی کے نام تحریر کیا:۔

"اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے۔ اس بحث پر مصر میں ایک چھوٹی سی کتاب شائع ہوئی تھی جو میری نظر سے گزری ہے مگر افسوس ہے کہ بہت مختصر ہے اور جن مسائل پر بحث کی ضرورت ہے مصنّف نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو مَیں ان سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا۔ موجودہ صورت میں سوائے آپ کے اس کام کو کون کرے گا۔ مَیں نے ایک رسالہ اجتہاد پر لکھا تھا مگر چونکہ میرا دل بعض امور کے متعلق خود مطمئن نہ تھا۔ اس واسطے اس کو اب تک شائع نہیں کیا۔"[2]

۱۹۲۵ء میں مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی کے نام خط میں اقبال نے اس مضمون کے سلسلے میں یہ انکشاف کیا کہ "کچھ مدّت ہوئی مَیں نے "اجتہاد" پر ایک انگریزی مضمون لکھا تھا جو یہاں ایک جلسے میں پڑھا گیا تھا مگر بعض لوگوں نے مجھے کافر کہا۔"[3] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون پر اقبال کو خاصی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔

---

[1] اقبال نامہ مجموعہ مکاتیب اقبال حصہ اوّل مرتبہ شیخ عطاء اللہ ایم اے صفحات ۴۶، ۴۷،

[2] ایضاً صفحات ۱۴۲، ۱۴۳۔

[3] انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار، صفحہ ۳۱۷۔

لیکن علامہ اقبال بڑی سنجیدگی سے اس مسئلہ کے متعلقات کی تحقیق میں مصروف رہے۔ سید سلیمان ندوی ہی کے نام ۷؍ اپریل ۱۹۲۶ء کو رقمطراز ہیں:۔

"عبادات کے متعلق کوئی ترمیم و تنسیخ میرے پیشِ نظر نہیں ہے بلکہ مَیں نے اپنے مضمون اجتہاد میں ان کی ازلیت و ابدیت پر دلائل قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہاں معاملات کے متعلق بعض سوالات دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں چونکہ شرعیت احادیث (یعنی وہ احادیث جن کا تعلق معاملات سے ہے) کا مشکل سوال پیدا ہو جاتا ہے اور ابھی تک میرا دل اپنی تحقیقات سے مطمئن نہیں ہوا اس واسطے وہ مضمون شائع نہیں کیا گیا۔ میرا مقصود یہ ہے کہ زمانہ حال کے جُورِس پروڈنس (فہم قانون) کی روشنی میں اسلامی معاملات کا مطالعہ کیا جائے مگر غلامانہ انداز میں نہیں بلکہ ناقدانہ انداز میں۔ اس سے پہلے مسلمانوں نے عقائد کے متعلق ایسا ہی کیا ہے۔"[۱]

بہر حال دسمبر ۱۹۲۸ء کے آخری ایام میں علامہ اقبال جب مدراس مسلم ایسوسی ایشن کے بانی سیٹھ محمد جمال کی دعوت پر مدراس (جنوبی ہند) تشریف لے گئے تو آپ نے وہاں تین لیکچر دیئے جو بعد میں آپ کی معرکہ آرا تصنیف تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ Reconstruction of Religious Thought in Islam. میں شامل ہوئے۔ اس کتاب کا چھٹا خطبہ "اجتہاد فی الاسلام" کے موضوع پر ہے۔ یہ کہنا تو بہت مشکل ہے کہ مذکورہ تین خطبات میں یہ بھی شامل تھا یا نہیں۔ تاہم اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی اشاعت اوّل (۱۹۳۰ء) تک علامہ یہ خطبہ ضرور تیار کر چکے تھے۔ لیکن وہ صرف اس خطبے پر اکتفا کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ انہوں نے اب یہ ارادہ کیا کہ اگر "اجتہاد" پر کتاب تیار نہیں ہو سکتی تو قرآن مجید کے حواشی (Introduction to the Study of Islam.)

---

[۱] اقبال نامہ مجموعہ مکاتیب اقبال حصہ اوّل مرتبہ شیخ عطاء اللہ ایم اے صفحات ۱۴۶، ۱۴۷۔

یا Aid to the study of Quran. لکھ دیئے جائیں۔ علامہ اقبال کے اس ارادے کے بارے میں عبدالرشید طارق صاحب اپنے مضمون "مئے شبانہ" میں لکھتے ہیں:۔

"(اقبال نے فرمایا) ذرا صحت اچھی ہو تو لکھنا شروع کر دونگا۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی پڑھا لکھا وسیع النظر اور صحیح المشرب فاضل دیوبند میسر آجائے، مجھے حوالہ جات تلاش کر کے دیتا رہے اور لکھتا جائے۔ انگریزی سے واقف ہو تو نہایت ہی اچھی بات ہے۔ میں تنخواہ بھی دینے کو تیار ہوں۔ ایک بار کتاب شروع کی تو انشاءاللہ اسلام کے بارے میں یورپ کی تمام Theories. (نظریات) کو توڑ پھوڑ کر رکھ دونگا۔ ارادہ ہے کہ قانون کی تمام کتابیں بیچ کر فقہ، حدیث اور تفاسیر خرید کروں۔ یہ اب میرے کس کام کی ہیں"۔[1]

خواجہ عبدالوحید مرحوم نے علامہ اقبال سے متعلق اپنی ذاتی ڈائری شائع کروائی ہے۔ ۸ر اکتوبر ۱۹۳۴ء کی ڈائری میں لکھتے ہیں:۔

"ایک بہت بڑی خوشخبری آپ نے یہ سنائی کہ "میرے دل میں اس بات کی بڑی زبردست خواہش تھی کہ قرآن پر اپنے خیالات تفصیل سے ایک کتاب میں پیش کر دوں" انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے اپنے خیالات کا اظہار بڑی تفصیل سے اپنے اشعار میں کر دیا ہے لیکن ابھی میرے دل میں اس سے بھی بڑی ایک چیز ہے جو قرآن حکیم کی شرح کی صورت میں ظاہر کرنے کی آرزو رکھتا ہوں" اس کے بعد آپ نے یہ بھی فرمایا کہ وہ اس کام کو ایک ہی صورت میں یکسوئی کے ساتھ کر سکتے ہیں کہ کم از کم پانچ سال کے لیے ان کو افکار روزگار سے فرصت مل جائے"۔[2]

---

[1] ملفوظات اقبال مرتبہ محمود نظامی، صفحہ ۲۲۶ - ۲۲۷۔
[2] مجلہ "دبستانِ اقبال"، مرتبہ پروفیسر ایم آئی ملک صفحہ ۶۴۔

۳۱ر جنوری ۱۹۳۵ء کو علامہ اقبال جب سر راس مسعود کی دعوت پر بھوپال تشریف لے گئے تو دوسرے دن نواب حمید اللہ خان والئ بھوپال سے ملاقات ہوئی۔ جس کی تفصیل سر راس مسعود کے پرسنل سیکرٹری ممنون حسن خان نے بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"...... اس کے بعد گفتگو کا موضوع بدل گیا ـــــ نواب صاحب نے An Interpretation of Holy Quran in the light of Modern Philosophy. کے بارے میں دریافت کیا۔ علامہ اقبال نے بتایا کہ اس کتاب کا خاکہ میرے ذہن میں ہے، کچھ تیار بھی کیا ہے لیکن کچھ کتابیں بیرون ملک میں ہیں انہیں دیکھ لینا چاہتا ہوں۔ مجھے آکسفورڈ اور کیمبرج میں Extensive Lectures کے لیے بلایا جا رہا ہے۔ اگر میں وہاں گیا تو ان کتابوں کو دیکھنے کی کوشش بھی کروں گا۔ نواب صاحب نے کہا کہ اگر یہ کتاب مکمل ہو جائے تو ساری ملتِ اسلامیہ بلکہ ساری دنیا کے لوگ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور آپ نے مجھے جو تحفے دیئے ہیں ان میں سب سے بڑا تحفہ ہو گا اگر اس میں کچھ امداد کی ضرورت ہو تو جیسا کہ میں نے مسعود سے کہا ہے ہر طرح کی امداد کے لیے تیار ہوں۔"[۱]

علامہ اقبال کو معلوم ہوا کہ ان کے مخلص دوست سر راس مسعود ان کی مالی اعانت کے لیے نواب بھوپال کو آمادہ کر رہے ہیں تو آپ نے ۲۶ر اپریل ۱۹۳۵ء کو راس مسعود کے نام مکتوب میں لکھا۔

"مجھے کچھ عرصہ پہلے تو اس خیال سے مسرت تھی کہ آپ کی

---

[۱] اقبال اور بھوپال مرتبہ صہبا لکھنوی۔ صفحہ: ۵۶

اس کوشش میں کامیاب ہونے کی قوی امید تھی اور اس طرح میرے لیے ممکن ہو سکتا تھا کہ میں قرآن کریم پر عہد حاضر کے افکار کی روشنی میں اپنے وہ نوٹ تیار کر لیتا جو عرصہ سے میرے زیر غور رہیں۔ لیکن اب تو نہ معلوم کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اگر مجھے حیات مستعار کی بقیہ گھڑیاں وقف کر دینے کا سامان میسر آجائے تو میں سمجھتا ہوں قرآن کریم کے ان نوٹوں سے بہتر میں کوئی پیش کش مسلمانان عالم کو نہیں کر سکتا۔ بہرحال دریں بار، ہر امر اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے، اگر عالم جدید میں اسلام کی اس خدمت کا شرف میرے لیے مقدر ہو چکا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل کے لیے ضروری ذرائع بہم پہنچا دے گا۔" [۱]

جوں جوں وقت گزرتا چلا جا رہا تھا۔ علامہ اقبال اس کام کو سرانجام دینے کے لیے مضطرب ہو رہے تھے۔ ۳۰ مئی ۱۹۳۵ء کو سر راس مسعود کے نام خط میں لکھتے ہیں :-

"چراغ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں، تمنا ہے مرنے سے پہلے قرآن کریم سے متعلق اپنے خیالات قلمبند کر جاؤں جو تھوڑی سی ہمت اور طاقت بھی مجھ میں باقی ہے اسے اسی خدمت کے لیے وقف کر دینا چاہتا ہوں تاکہ قیامت کے دن آپ کے جدِ امجد (حضور نبی کریم) کی زیارت مجھے اس اطمینان سے میسر ہو کہ اس عظیم الشان دین کی جو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہم تک پہنچایا کوئی خدمت بجا لا سکا۔" [۲]

---

[۱] اقبال نامہ مجموعہ مکاتیب اقبال حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ ایم اے صفحات ۳۵۷-۳۵۸

[۲] ایضاً صفحات ۳۶۱، ۳۶۲-

سر راس مسعود کی مخلصانہ کوششیں رنگ لائیں۔ نواب حمید اللہ خان والی بھوپال نے مئی ۱۹۳۵ء میں علامہ اقبال کی پانچ سو روپے ماہانہ تاحیات پنشن مقرر کر دی تو علامہ نے یکم جون ۱۹۳۵ء کو سید نذیر نیازی کو لکھا۔

"اعلیٰ حضرت نواب صاحب نے میری لائف پنشن پانچ (سو) روپیہ ماہوار مقرر کر دی ہے۔ خدا تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔ انہوں نے میرے ساتھ عین وقت پر سلوک کیا۔ اب اگر صحت اچھی رہی تو بقیہ ایام قرآن شریف پر نوٹ لکھنے میں صرف کرونگا۔"[1]

سید نذیر نیازی اس خط میں مذکور قرآن شریف کے نوٹ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"۱۹۳۵ء میں جب اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے حضرت علامہ کی لائف پنشن مقرر کر دی اور حضرت علامہ نے راقم الحروف کو اس کی اطلاع کی تو اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا "اب اگر صحت اچھی رہی تو بقیہ ایام قرآن شریف کے نوٹ لکھنے پر صرف کر دوں گا۔" یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ قرآن مجید کے ان تفصیلی حواشی کی تکمیل جب ہی ممکن تھی جب حضرت علامہ کو صحت ہو جاتی۔ مگر اس کے باوجود لوگ دریافت کرتے ہیں کہ اس قسم کے کچھ حواشی کیا پہلے سے لکھے ہوئے موجود تھے، یا ان کا کچھ حصہ بعد میں لکھا گیا، یا نہیں تو اگر یہ حاشیے لکھے جاتے تو ان کی نوعیت کیا ہوتی؟ کیا حضرت علامہ اپنے ذہن میں مطالب قرآنی کا کوئی خاص نقشہ قائم کر چکے تھے؟ ان کے خیالات اس سلسلے میں کیا تھے؟ یہ سوالات نہایت ضروری ہیں اور قوم کا ذہنی تجسس بجا طور پر

---

[1] مکتوباتِ اقبال بنام سید نذیر نیازی، صفحات ۲۷۶، ۲۷۷۔

اس امر کا مقتضی ہے کہ ان کا کوئی ٹھیک ٹھیک جواب مل سکے۔ بالخصوص اس لیے کہ ناقدین کی رائے کچھ بھی ہو حضرت علامہ کا اپنا ارشاد یہی تھا کہ ان کے افکار کا سرچشمہ قرآن پاک اور اسوۂ حضور رسالتمآب صلعم کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ اسی ذاتِ گرامی سے جس پر قرآن مجید نازل ہوا، والہانہ عشق و محبت کا تعلق تھا۔ جس کی بدولت کتاب — کتاب اللہ — کی حکمت ان پر عیاں ہوئی۔ پس چہ باید کرد کے یہ اشعار کس کی نظر سے نہیں گزرے۔

در جہان ذکر و فکر انس و جاں
تو صلوٰۃِ صبح تو بانگ اذاں
ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی
قطرۂ در دریا و طوفانم توئی
گرد تو گردد حریم کائنات
از تو خواہم یک نگاہِ التفات"

قرآن پاک سے حضرت علامہ کو جو عشق تھا اور اس کا مطالعہ انہوں نے جس محنت اور کاوش سے کیا تھا وہ کوئی ایسی بات نہیں جس سے لوگ ناواقف ہوں۔ ان کی طالب علمی اور ابتدائی زمانے کے دوست بھی اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ بڑے سحر خیز تھے۔ فجر کی نماز اوّل وقت میں ادا کرتے اور پھر قرآن مجید کی تلاوت بڑے ذوق و شوق سے فرماتے۔ اپنی آخری علالت میں جب ان کی آواز بیٹھ گئی اور کچھ گلے کی تکلیف، کچھ حبس دم کے باعث تلاوتِ قرآن کا سلسلہ چھوٹ گیا تو انہوں نے کس حسرت سے کہا:۔

در نفس سوزِ جگر باقی نماند
لطفِ قرآنِ سحر باقی نماند

علی بخش ان کے مدت العمر کے ملازم کا بھی، جو ہمیشہ ان کے ساتھ سایہ کی طرح لگا رہا، یہی بیان ہے کہ فجر کی نماز کے لیے اسے وضو اور جائے نماز کا اہتمام سونے سے پہلے ہی کرنا ہوتا تھا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ تعلیماتِ قرآنی کے بارے میں ان کا ایک خاص نقطۂ نظر تھا جس کی اپنے اشعار اور خطبات میں انہوں نے وضاحت بھی کی لیکن جہاں تک ان تفسیری حواشی کا تعلق ہے وہ کبھی سپردِ قلم نہیں ہوئے اور اس کی وجہ ظاہر ہے یعنی علالت۔ البتہ اس سلسلے میں ان کی دو ایک تحریریں ضرور دستیاب ہوئیں اور وہ شاید اب اقبال اکیڈمی کے پاس محفوظ ہیں۔ ایک تحریر میں تو فقہ اسلامی کی بحث میں بعض قرآنی مصطلحات مذکور ہیں۔ دوسری تحریر صرف چند ایک قرآنی مصطلحات پر مشتمل ہے۔ لیکن ان دونوں تحریروں کی حیثیت حواشی کی نہیں۔ حضرت علامہ نے ان تحریروں میں کوئی جملہ بھی رقم نہیں فرمایا، صرف چند الفاظ مستفسرانہ انداز میں لکھے ہیں۔ جس سے کچھ مترشح ہوتا ہے تو یہی کہ انہوں نے یادداشت کے لیے چند ایک باتیں بطور اشارات لکھ لی تھیں۔ رہا یہ امر کہ وہ ان باتوں کی تشریح اور تفصیل کس انداز میں اور کس نہج پر کرتے۔ اس کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ اِلّا یہ کہ ان کی روزمرہ کی گفتگوؤں یا ان ارشادات سے جو وقتاً فوقتاً انہوں نے اس سلسلے میں فرمائے، سامعین کو ان کے خیالات کا شاید ایک حد تک اندازہ ہو سکے۔ کوئی بھی بحث ہو اس کا خاتمہ اس پر ہوتا تھا کہ قرآن پاک کا ارشاد اس سلسلے میں کیا ہے یا یہ کہ حضور رسالتمآب صلعم نے اس بارے میں کیا طرزِ عمل اختیار کیا تھا۔ بسا اوقات وہ یہ بھی فرماتے کہ قرآن مجید کا مطالعہ کس نہج پر کرنا چاہیے... اور پھر باتوں باتوں میں تعلیماتِ قرآنی کی طرف بڑے لطیف اشارات کر جاتے۔ مختصراً یہ کہ ان کے ذہن میں تعلیماتِ قرآنی کو ایک باقاعدہ شکل میں پیش کرنے کا تصور تو ضرور تھا لیکن بسبب علالت وہ اپنا یہ ارادہ پورا

نہ کر سکے جس کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔ چنانچہ راقم الحروف نے اکثر محسوس کیا کہ ان کے پیشِ نظر شاید یہی ایک مسئلہ تھا جس پر وہ انتہائی تجسس اور تحقیق سے قلم اٹھانا چاہتے ہیں۔ رسالۂ اردو کے اقبال نمبر میں میں اپنے مضمون اقبال کی آخری علالت میں اس امر کی طرف اشارہ بھی کر چکا ہوں کہ ان کا ذہن کس طرح ہر وقت اسی فکر میں الجھا رہتا تھا۔[۱]

خواجہ عبدالوحید جن کی ذاتی ڈائری کا ذکر پہلے آ چکا ہے، اپنی ڈائری میں ۴ر جولائی ۱۹۳۵ء کو رقمطراز ہیں:-

"حضرت علامہ کی تمام گفتگو بڑے دقیق فلسفیانہ موضوعات پر تھی۔ آپ نے نبوت پر عمومی اور نبوتِ محمدیہؐ پر خصوصی طور پر روشنی ڈالی۔ حضرت علامہ کا پختہ خیال ہے کہ نبوتِ محمدیہؐ کی معنوی حیثیت کو ابھی تک انسان نہیں سمجھا۔ ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ بعض بزرگانِ سلف بھی اس کی کُنہ کو نہیں پہونچے۔ وہ مدعی تھے کہ خود ان کو اس حقیقت کو سمجھنے کی توفیق حاصل ہوئی ہے اور اس موضوع پر وہ تفصیل سے اپنی مجوزہ کتاب "تمہید القرآن" میں روشنی ڈالیں گے۔"[۲]

۲۲ر جولائی ۱۹۳۰ء کو بھوپال سے ڈاکٹر تاثیر کو لکھتے ہیں۔

"اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے نہایت دردمندی سے میرا علاج کرایا ہے۔ اس کے علاوہ جب ان کو سر راس مسعود سے معلوم ہوا کہ میں ایک کتاب مقدمۃ القرآن لکھنا چاہتا ہوں تو اس ارادے کی تکمیل کے لیے مجھے انہوں نے

---

[۱] مکتوباتِ اقبال بنام سید نذیر نیازی صفحات ۳۴۲، ۳۴۵۔

[۲] مجلہ "دبستان اقبال"، مرتبہ پروفیسر ایم آئی ملک صفحہ ۶۸۔

تاحیات پانچ سو روپیہ ماہوار کی لٹریری پنشن عطا فرمائی ہے۔
آپ کو شاید اس کا علم اخباروں سے ہو گیا ہو گا۔ اب ذرا صحت اچھی ہولے تو اس کتاب کو لکھنا شروع کر دوں گا۔ اسی سال کے دوران میں امید ہے "صور اسرافیل" بھی ختم ہو جائے گی۔ پھر کچھ مدت کے لیے مقدمۃ القرآن کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دونگا۔"[1]

اسی کتاب میں وہ قوانین اسلام کو بھی زیر بحث لانا چاہتے تھے۔ یعنی وہی "اجتہاد" کے موضوع پر لکھنے کی خواہش بار ستور ان کے نہاں خانۂ دل میں موجود تھی۔ ۷ر اگست ۱۹۳۶ء کو سید سلیمان ندوی کے نام خط میں رقمطراز ہیں:-

"انشاء اللہ موسم سرما میں وہ انگریزی کتاب لکھنا شروع کرونگا۔ جس کا وعدہ میں نے اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال سے کر رکھا ہے۔ اس میں آپ کے مشورہ کی ضرورت ہے۔ بدور البازغہ بھی اسی مطلب کے لیے منگوائی ہے۔ اس کتاب میں زیادہ تر قوانین اسلام سے بحث ہو گی کہ اس وقت اسی کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس کے متعلق جو کتب آپ کے ذہن میں ہیں مہربانی کر کے ان کے ناموں سے آگاہ فرمائیے اور یہ بھی فرمائیے کہ کہاں کہاں سے دستیاب ہوں گی۔"[2]

یہ خط علامہ کے اس احساس کی ترجمانی کرتا ہے کہ عہد حاضر میں تشکیل جدید الٰہیات

---

[1] انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار صفحہ ۲۰۶۔
خط کی تاریخ غلط معلوم ہوتی ہے۔ ۱۹۳۰ء کی بجائے ۱۹۳۵ء درست ہے کیونکہ پنشن مئی ۱۹۳۵ء میں جاری ہوئی تھی۔ مرتب سے سہو ہوا ہے "صور اسرافیل" سے مراد ضرب کلیم ہے جو ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی جس کی پیش کش نواب حمید اللہ خاں والئ بھوپال کے نام ہے۔

[2] اقبال نامہ مجموعہ مکاتیب اقبال حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ ایم اے صفحہ ۱۹۹۔

اسلامیہ کی طرح فقہ اسلامی کی تشکیل جدید بہت ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے یورپ اور مصر کی بعض مطبوعات بھی فراہم کرنا شروع کر دی تھیں اور ابتدائی خاکہ بھی تیار کر چکے تھے۔ لیکن جیسا کہ خواجہ غلام السیدین کے نام ۱۱ ستمبر ۱۹۳۷ء کے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کام ضعفِ بصارت کی وجہ سے سرانجام نہ پا سکا:۔

"اسلامی اصول فقہ کے متعلق ایک کتاب لکھنے کا ارادہ تھا لیکن اب یہ امید موہوم معلوم ہوتی ہے۔" [1]

مولانا عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:۔

"وہ جوانی ہی کے زمانے میں محسوس کر چکے تھے کہ اگر اسلام کو ایک ضابطۂ حیات کی حیثیت سے آج کل کے زمانے میں کامیاب و آبرومند بنانا ہے تو اس کا طریقہ یہی ہے کہ زمانہ حال کے "جورس پروڈنس" یعنی اصول قانون کی روشنی میں شرع اسلامی کے اساسات دنیا کے سامنے پیش کیے جائیں اور دلیل و برہان سے اصول فقہ اسلامی کی برتری آج کل کے قانون پر ثابت کی جائے۔ مجوزہ کتاب کا نام تھا Re-Construction of Islamic Jurisprudence انہوں نے بارہا یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ ایک کتاب لکھیں گے۔ جس کا نام ہو گا Islam as I understood it. (یعنی اسلام میرے نقطۂ نظر سے) جس میں اسلام پر ایک جدید تعلیم یافتہ سائنس دان اور فلسفی کے زاویۂ نگاہ سے روشنی ڈالی جائے گی اور ایسی زبان اختیار کی جائے گی جسے زمانۂ حال کے علمی حلقے سمجھتے ہیں۔"

---

[1] اقبال نامہ مجموعہ مکاتیب اقبال حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ ایم اے، صفحہ ۳۲۰۔

"اواخر حیات میں قریب قریب ہر روز یہی ذکر رہتا تھا کہ میں ایک کتاب لکھ کر چھوڑ دوں گا۔ جس کا منشا یہ ہوگا کہ پڑھنے والوں کے دلوں میں مطالعہ قرآن کا صحیح ذوق پیدا ہو جائے اور جتنے نظریے یورپ کے مستشرقین نے قرآن اور ادبیات اسلامی کے متعلق قائم کر رکھے ہیں وہ سب کے سب خاک میں مل جائیں۔ اس کتاب کا نام کبھی کبھی Aids to the study of Quran بتایا کرتے تھے۔"[1]

اس مقصد کے لیے علامہ اقبالؒ نے ہندوستان کے ممتاز علماء کو دعوت دی کہ وہ ان کے منصوبہ کے مطابق فقہ پر تحقیقی کام میں ان کی مدد کریں۔ چوہدری نیاز علی خان صاحب (جنہوں نے علامہ کے کہنے پر پٹھان کوٹ میں ایک زمین وقف کی تھی اور جہاں بعد میں مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام کے فکری محاذ کا اجراء کیا تھا) مولانا مودودی کے حیدر آباد دکن چھوڑ کر پٹھان کوٹ آنے کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"میرا خیال ہے حضرت علامہ ایک کتاب فقہ اسلامی پر لکھنا چاہتے تھے اور اس کے لیے ان کو ایک اچھے صاحب قلم عالم کی ضرورت تھی۔ مگر ان کے کہنے پر مولانا صاحب نے انکار کر دیا تھا کہ وہ ایک کام میں لگ چکے ہیں اُسے چھوڑ نہیں سکتے۔"[2]

علامہ اقبال کے قلب و ذہن پر اس خواہش کا غلبہ کس قدر تھا۔ اس کا اندازہ شاید اس اقتباس کے مطالعے سے ممکن ہو جو مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر سید

---

[1] ذکر اقبال از عبد المجید سالک، صفحات ۲۱۱-۲۱۲

[2] اوراق گم گشتہ، صفحہ: ۹۰

عبداللطیف کے مضمون "ایک گنجِ گرانمایہ کی تلاش" سے لیا گیا ہے :۔

"ستمبر یا اکتوبر ۱۹۳۷ء کا ذکر ہے کہ میں اپنے قدیم دوست مرحوم مولوی عبدالحق (بابائے اُردو) کے ہمراہ ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے علی گڑھ گیا ہوا تھا۔ یہاں مجھے ڈاکٹر اقبال کا ایک خط ملا۔ جس میں انہوں نے اپنی گرتی ہوئی صحت کا ذکر کیا تھا اور یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ میں علی گڑھ سے براہِ راست لاہور چلا آؤں اور کم از کم دو ہفتے ان کے ساتھ گزاروں تو انہیں بڑی خوشی ہو گی۔ چنانچہ میں علی گڑھ سے سیدھا لاہور پہنچا اور کوئی تین ہفتے ان کے ساتھ رہا۔ میرا بستر انہیں کے کمرہ میں کیا گیا تھا۔ اس قیام کی یاد ابھی تک میرے دل میں تازہ ہے۔

اس دوران میں انہوں نے مجھ سے خواہش کی کہ میں ایک معتد بہ مدت کے لیے لاہور میں سکونت اختیار کر دوں تاکہ ایک طرف اسلامیہ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے ان کی کچھ خدمت کر سکوں اور دوسری طرف ان کے ایک منصوبہ میں ان کی مدد کر سکوں، وہ منصوبہ یہ تھا :۔

انہوں نے اسلامی اصول فقہ کی تجدید کے مسئلہ پر اپنی فکر کے نتائج کو نوٹس کی شکل میں قلمبند کیا تھا۔ یہ نوٹس انگریزی میں تھے لیکن وہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ اپنی گرتی ہوئی صحت کے زمانہ میں ان نوٹس کی ترتیب و تہذیب اور انہیں کوئی قطعی شکل دینا اور شائع کرنا ان کے لیے دقت سے خالی نہیں۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ میں اس کام میں ان کا ہاتھ بٹاؤں۔

میں بہت خوشی سے اس کام کو انجام دینے کے لیے آمادہ تھا، لیکن ایک دشواری میری راہ میں حائل تھی۔ ان دنوں میری

اہلیہ مرحومہ ایک عرصہ سے بیمار تھیں اور ایسے وقت میرا حیدرآباد سے باہر رہنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے یہ تجویز پیش کی کہ بیماری کی حالت بہتر ہو جائے تو میں چند دن کے لیے لاہور آسکوں گا اور ان نوٹس کو ان کی حسب خواہش ترتیب دوں گا لیکن انہوں نے کہا کہ بیماری کا علاج لاہور میں بھی خاطر خواہ کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ماڈل ٹاؤن میں جہاں کی آب و ہوا بہت اچھی ہے میرے لیے ایک مکان کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔" ؎۱

اسی پر بس نہیں بلکہ علامہ نے ڈاکٹر صاحب کو میاں محمد شفیع صاحب کی ہمراہی میں مکان منتخب کرنے کے لیے بھیجا۔ واپسی پر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ وہ اپنی بیوی کی مرضی معلوم کریں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیوی حیدرآباد سے لاہور آنے پر رضامند نہیں ہوئیں لہٰذا ڈاکٹر صاحب یہ کام نہ کر سکے جس کا انہیں بہت افسوس رہا۔

بات واضح ہے کہ علامہ اقبال کی وفات کے ساتھ ہی یہ خبر مشہور ہو گئی تھی کہ وہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ایک ایسی کتاب لکھنے کا عزم رکھتے تھے جس میں حقیقت اسلام اور اسلامی قوانین وغیرہ موضوعات پر بحث کرنا چاہتے تھے۔ بعض لوگوں کے خیال میں علامہ نے اس کتاب کا بیشتر حصہ لکھ بھی لیا تھا لیکن زیادہ باخبر حضرات نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے اس کتاب کے صرف عنوانات اور ابواب قائم کیے اور ان کے ساتھ کچھ تشریحی نکات لکھے تھے۔

۱۹۵۵ء کے قریب چوہدری غلام احمد پرویز کو اخبارات کے ذریعے معلوم ہوا کہ پنجاب اسمبلی کے سابق رکن میاں محمد شفیع صاحب نے علامہ اقبال کے

؎۱ ہفت روزہ "چٹان" لاہور ۱۹ر جون ۱۹۶۷ء۔

اپنے ہاتھوں کے لکھے ہوئے کچھ نوٹس اقبال اکیڈمی کراچی کو دیئے ہیں جو مذکورہ کتاب کے متعلق ہیں تو انہوں نے ان نوٹس کی ایک نقل ممتاز حسن صاحب سیکرٹری وزارت مالیات حکومت پاکستان کی وساطت سے لی اور ہفت روزہ "طلوعِ اسلام" میں ان نوٹس کا ترجمہ شائع کیا۔ میاں محمد شفیع صاحب نے ان نوٹس کا تعارف جن لفظوں میں کرایا ہے وہ یوں ہے۔

"۱۹۳۷ء میں جب مجھے حضرت علامہ اقبال کے کاتب کی حیثیت سے کام کرنے کی سعادت حاصل تھی انہوں نے مجھے چند کاغذات مرحمت فرمائے جس میں خود ان کے قلم سے کچھ نوٹس لکھے ہوئے تھے یہ نوٹس اس کتاب سے متعلق تھے جس کی تصنیف ان دنوں ان کے پیش نظر تھی اس کتاب کا نام تھا

Introduction to the study of Islam

اور اس میں اسلامی فقہ کو خاص طور پر پیش نظر رکھنا مقصود تھا چونکہ ان کی بینائی دن بدن کمزور ہو رہی تھی اس لیے ان کا ارادہ تھا کہ اپنی زیرِ نظر کتاب کو مجھے املا کرا دیں۔ یہ کتاب اسلامی سیاست اور فقہ کے متعلق ایک عدیم النظیر کوشش کا مظہر بننے والی تھی لیکن افسوس کہ ان کی صحت اس تیزی سے خراب ہوتی گئی کہ وہ اپنے اس ارادہ کو عملی شکل نہ دے سکے حتیٰ کہ ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کو ان کی شمع حیات بجھ گئی۔ (واضح رہے کہ حضرت علامہ کی خدمت میں اس کتاب کی تصنیف کی تجویز والیٔ بھوپال نے پیش کی تھی)"[1]

اس وقت سے یہ نوٹس میرے پاس تھے اور میں نے ملّی امانت کے طور پر ان کی حفاظت کی۔ ایک دفعہ میں نے قائداعظم مرحوم سے بھی عرض کیا تھا کہ میرے پاس اس قسم کے نوٹس ہیں تو انہوں نے ۲۴ر مارچ ۱۹۴۳ء کو مجھے جواب میں لکھا کہ:-

---

[1] اقبالیات کا تنقیدی جائزہ۔ از اختر میاں جوناگڑھی، اقبال اکیڈیمی پاکستان کراچی ۱۹۶۵ء، ص ۲۵، ۲۶، ۲۸

"فقہ اسلامی کی تشکیل جدید کے متعلق اقبال جو کتاب لکھنا چاہتے تھے میں اس کے متعلق ان کے نوٹس دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ اس کے بعد میں اس پر غور کر سکوں کہ کون سی قابل شخصیت ایسی ہے جو اس کام کی تکمیل کر سکے گی۔ چونکہ موضوع کا تعلق فقہ اسلامی سے ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس کے لیے کسی قانون دان کی ضرورت ہو گی۔"

"چونکہ حضرت علامہ کے یہ نوٹس پنسل سے لکھے ہوئے تھے۔ اس لیے مرور زمانہ سے ان کے نقوش مدہم پڑتے چلے جا رہے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں جب میں سنٹرل جیل ملتان میں نظر بند تھا تو میں نے ان نوٹس کو اپنے قلم سے الگ لکھ لیا۔ اب میں یہ نوٹس بغیر کسی قسم کے رد و بدل کے قوم کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ جو حضرات اس کی استعداد رکھتے ہوں وہ حکیم الامت کی منشا کے مطابق ایک ایسی کتاب کی تصنیف کر سکیں جو حیاتِ ملی میں ایک زندہ عنصر کی حیثیت رکھتی ہیں۔"[1]

ادارہ طلوع اسلام نے نوٹس کا ترجمہ دینے سے پیشتر نوٹس کی کیفیت پر جو تبصرہ کیا ہے اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔[2]

"واضح رہے کہ علامہ اقبال نے اپنی پیش نظر کتاب کے محض عنوانات لکھے تھے اور کہیں کہیں ایک ایک دو دو لفظوں میں یہ بھی لکھ لیا تھا کہ فلاں عنوان کے تحت کیا کچھ لکھا جائے گا۔ اس سے زیادہ ان نوٹس میں انہوں نے کچھ نہیں لکھا۔ ان نوٹس کو پھیلا کر ایک مضمون بھی مرتب کیا جا سکتا تھا لیکن ہم ان نوٹس کو بغیر کسی قسم کی تشریح یا اضافہ کے ان کی اصل شکل میں قارئین کے سامنے پیش

---

[1] اقبال کامل از مولانا عبد السلام ندوی دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۶۹ء ص ۱۰۷ - ۱۰۹

[2] ہفت روزہ "طلوع اسلام" بابت ۲۲ اکتوبر ۱۹۵۵ء

کرنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ جو کچھ حضرت علامہ نے لکھا ہے اس پر کسی دوسرے کا خیال اثر انداز نہ ہو۔ بعض مقامات پر بات مبہم رہ گئی ہے۔ اس لیے کہ حضرت علامہ نے ان نوٹس کو محض اپنی یادداشت کے لیے لکھا تھا۔ نیز بعض مقامات پر ان کی تکرار ہو گئی ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ اس ضمن میں جو جو باتیں ان کے ذہن میں آتی رہتی تھیں وہ انہیں بطور یادداشت نوٹ کرتے رہتے تھے۔ بہر حال ان نوٹس کا ترجمہ حسب ذیل ہے (اصل انگریزی زبان میں ہے)۔

علامہ اقبال کے کسی مضمون کا ترجمہ کرنا کس قدر مشکل ہوتا ہے، ارباب علم اس سے واقف ہیں۔ لیکن جہاں صورت یہ ہو کہ انہوں نے اپنا مافی الضمیر فقروں میں نہیں بلکہ متفرق الفاظ اور اشارات میں ادا کیا ہو اس کا ترجمہ جس قدر مشکل ہو گا اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بہر حال ہم نے کوشش کی ہے کہ ترجمہ میں ان کا مفہوم سامنے آجائے۔[1]

ادارہ طلوع اسلام کا یہ تبصرہ اور نوٹس کے ترجمے کی دقتوں کا ذکر قابل قبول ہے لیکن اصل چیز تو مسودہ کے الفاظ کا صحیح صحیح نقل کرنا ہے۔ ترجمانی وغیرہ تو بعد کی باتیں ہیں اور بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ادارہ نے اس اہم کام کی طرف بالکل توجہ نہیں دی اور غالباً عجلت یا روا روی میں اس کا ترجمہ پیش کر دیا جو کسی صورت بھی معیاری کہلانے کے لائق نہیں بلکہ بعض مقامات پر تو بات کچھ کی کچھ بن گئی ہے۔

نوٹس کو صحیح صحیح نقل کرنے کی ایک اور کوشش مشہور ماہر اقبالیات سید عبدالواحد معینی نے کی ہے۔ انہوں نے اپنی مرتب کردہ کتاب "Thoughts and Reflections of Iqbal" میں چوہدری غلام احمد پرویز کی اس کاوش پر یوں اظہار کیا ہے:-

---

[1] ہفت روزہ "طلوع اسلام"، بابت ۲۲ / اکتوبر ۱۹۵۵ء۔

In the Tulu-i-Islam of 22nd October, 1958 Chaudhry Ghulam Ahmed Pervez, the Editor, published a translation of these notes.This translation differs in important details from the notes as reproduced here, especially as it is more detailed in parts. And it is very difficult to say if the aditional notes which form a part of the translation were also written by Iqbal.

لیکن جناب عبدالواحد کا اعتراض درست نہیں معلوم ہوتا کیونکہ نوٹس کے حصول کے ذرائع میاں محمد شفیع اور ممتاز حسن صاحبان نے غالباً کبھی یہ نہیں کہا کہ "طلوعِ اسلام" میں نوٹس کا کچھ حصہ ایسا چھپ گیا ہے جو اصل نوٹس میں شامل نہیں۔ بلکہ جناب ممتاز حسن نے بشیر احمد ڈار صاحب کی کتاب ——— Letters and Writings of Iqbal کا پیش لفظ لکھا ہے اور نوٹس کی اس حیثیت پر لب کشائی نہیں کی حالانکہ ڈار صاحب نے علامہ اقبال کے خود نوشت نوٹس کی جو نقل کی ہے وہ بڑی حد تک وہی ہے جس کا ترجمہ (اچھا یا بُرا) ادارہ طلوعِ اسلام نے کیا ہے۔

مجلہ "ہمایوں"، لاہور، شمارہ دسمبر ۱۹۵۵ء کے صفحات ۴۵۶ تا ۴۵۹ پر میاں محمد شفیع صاحب کا ایک مضمون " وہ کتاب جسے اقبال لکھنا چاہتے تھے " شائع ہوا۔ اس مضمون میں اقبال کی مجوزہ کتاب ——— Introduction to the Study of Islam کے انگریزی میں پنسل سے لکھے ہوئے نوٹس اور مضمون کا اردو میں ترجمہ پیش کیا گیا ہے[۱۵]۔ یہ مضمون میری نظر سے نہیں گزرا۔ بہر حال میں اس کی تلاش میں تھا کہ میری نظر سے "عبدالقوی دیسنوی

Thoughts and Reflections of Iqbal by S.A. Vahid. [۱۵]

کی کتاب علامہ اقبال بھوپال میں" گزری۔ جو ۱۹۶۷ء میں علوی پریس بھوپال میں شائع ہوئی اور اپنے موضوع پر غالباً اوّلین اور جامع تالیف ہے لیکن اس میں اقبال کی مجوزہ کتاب کو صرف ضمناً زیر بحث لایا گیا ہے۔ جس سے کوئی واضح بات سامنے نہیں آتی۔ تاہم میری جستجو جاری رہی۔

حال ہی میں ایک کتاب "اقبال اور بھوپال" کے نام سے اقبال اکادمی کراچی نے شائع کی ہے (اپریل ۱۹۷۳ء) اس کے مصنف مدیر "افکار" کراچی جناب صہبا لکھنوی ہیں۔ اس کے آخر میں صفحات ۲۸۹ تا ۳۰۰ میں "قرآن مجید کے حواشی" کے عنوان سے ایک مقالہ ملتا ہے۔ جس میں روزنامہ "آفاق" لاہور ۴ ستمبر ۱۹۵۱ء: صفحہ ۵ کے حوالے سے میاں محمد شفیع صاحب کے بہم پہنچائے ہوئے وہ نوٹس شامل ہیں جو اقبال نے کسی وقت مرتب کیے تھے لیکن بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ نہ تو مترجم نے کما حقہٗ ترجمانی کی اور نہ مرتب "اقبال اور بھوپال" نے اس کی تصحیح کی ضرورت سمجھی حالانکہ اس سے پیشتر بشیر احمد ڈار کی مذکورہ تالیف منظر عام پر آچکی تھی۔ شاید انہوں نے اس ترجمے کو بھی ایک علمی تبرک سمجھ کر شامل کتاب فرما لیا[2]۔

اس بحث سے مندرجہ ذیل نکات سامنے آتے ہیں:۔

۱۔ ۱۹۲۴ء یا ۱۹۲۵ء میں اقبال نے "اجتہاد" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا لیکن مولانا عبدالماجد دریابادی کی مخالفانہ رائے اور ذاتی اطمینان نہ ہونے کی وجہ سے اسے شائع نہ کرایا۔

۲۔ علامہ کو احساس تھا کہ ان کی مذہبی معلومات کا دائرہ تنگ تھا، اس کے باوجود وہ اس اہم مسئلہ پر لکھنے کے لیے مختلف طریقوں سے تیاری کر رہے تھے۔

---

[1] کلید اقبال مرتبہ ملک نذیر احمد، صفحہ ۳۳۱۔

[2] اقبال اور بھوپال کا اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہو چکا ہے۔ ص ۲۸۹ تا ۳۰۰

۳۔ ۱۹۲۵ء کے آواخر میں اقبال نے یہ ارادہ کیا کہ وہ اسلام کے بارے میں صرف اپنی رائے کا اظہار کریں اور اپنی اس کاوش کا نام انہوں نے "Islam as I understood it" تجویز کیا۔

۴۔ علامہ اسلامی فقہ کی تاریخ قلمبند کرنے کے خواہشمند تھے۔ اس سلسلے میں ان کی نظر انتخاب سید سلیمان ندوی پر پڑی۔

۵۔ ۱۹۲۶ء میں اقبال چاہتے تھے کہ زمانہ حال کے جورس پروڈنس کی روشنی میں اسلامی معاملات کا مطالعہ ناقدانہ انداز میں کیا جائے نہ کہ غلامانہ انداز میں۔

۶۔ جنوری ۱۹۲۹ء میں انہوں نے مدراس کا سفر کیا اور وہاں تین لیکچر دیئے۔ بعد میں تین دیگر لیکچروں کے اضافے سے ۱۹۳۰ء میں جو مجموعہ شائع کیا، اس میں ایک خطبہ "اجتہاد" کے بارے میں بھی ہے۔

۷۔ لیکن وہ اس موضوع پر ایک آدھ مقالہ اور وہ بھی مختصر مقالہ کو کافی نہ سمجھتے تھے۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کا یہ ارادہ پختہ ہوتا جاتا تھا کہ وہ اپنے بعد آنے والے لوگوں کے لیے قرآن کے حواشی یا اسلام کا تعارف پوری تفصیل سے لکھ جائیں۔ لیکن مالی پریشانیوں، جسمانی عوارض وغیرہ کی وجہ سے یہ ارادہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔

۸۔ بالآخر راس مسعود کی کوششوں سے مئی ۱۹۳۵ء میں نواب حمید اللہ خان والئ بھوپال نے علامہ کا پانچ سو روپے ماہانہ تاحیات وظیفہ مقرر کر دیا۔ لیکن یہ وظیفہ غیر مشروط تھا البتہ نواب صاحب نے اقبال سے یہ ضرور کہا تھا کہ وہ مقدمہ قرآن کو مکمل کریں تو یہ نوعِ انسانی پر بڑا احسان ہوگا۔

۹۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ضروری کتب بھی اکٹھی کر لی تھیں اور مناسب معاون کی تلاش میں بھی تھے۔ لیکن حسب دلخواہ معاون میسر نہ آسکا۔ نیز ضعفِ بصارت کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا۔ تاہم آخری وقت تک ان کے دل میں اس عظیم الشان کام کو سرانجام دینے کی حسرت رہی۔

۱۰- علامہ نے جو نوٹس (اشارات) مرتب کیے تھے وہ میاں محمد شفیع کے سپرد کر دیئے تھے۔ جنہوں نے ۱۹۴۷ء میں ان کو اپنے خط میں منتقل کیا اور غالباً سب سے پہلے ۱۹۵۱ء میں روزنامہ آفاق، لاہور کے ذریعے منظرِ عام پر آئے۔

۱۱- یہی تحریر ماہنامہ "ہمایوں"، لاہور، دسمبر ۱۹۵۵ء کے شمارہ میں شائع ہوئی۔ انہی نوٹس کا ایک ترجمہ طلوعِ اسلام نے اکتوبر ۱۹۵۵ء میں شائع کیا لیکن یہ دونوں ترجمے ناقص تھے۔ ان ترجموں کے شائع ہونے کی فوری وجہ شاید ۱۹۵۶ء میں بننے والے دستور کے سلسلے کی بحث تھی۔

۱۲- ۱۹۶۴ء میں سید عبدالواحد نے قومی عجائب گھر کراچی کے حوالے سے نامکمل صورت میں ان نوٹس کو شائع کیا۔ غالباً ان سے کبھی یہ نوٹس صحیح طور پر پڑھے نہیں گئے۔

۱۳- نومبر ۱۹۶۷ء میں بشیر احمد ڈار نے ان نوٹس کو مکمل صورت میں اور زیادہ صحیح حالت میں پیش کیا تاہم بعض الفاظ ان سے کبھی پڑھے نہیں جا سکے۔ مثلاً "Atner" وغیرہ۔ بہرحال یہ وہی نوٹس ہیں جن کا ترجمہ میاں محمد شفیع صاحب بہت عرصہ پہلے شائع کروا چکے تھے اور ممتاز حسن صاحب نے ان الفاظ میں ان کی تصدیق کی۔

"This plan was reproduced first in Tulu-i-Islam and later in Thoughts and Reflections of Iqbal". The former was a complete reproduction but defective in several places as many words and phrases were left undeciphered. The latter was incomplete with several defective readings here and there.

The Editor has tried his best to give a full and faithful reproduction of this important plan, to which reference of the Quranic Verses used in the text have been added. One word (Second lecture part E(i); athar, however, remains doubtful. The Editor shall be grateful for any suggestion in this respect".[1]

بشیر احمد ڈار نے علامہ اقبال کے فلسفہ پر خاصا کام کیا ہے اور اس موضوع پر انہیں خاص عبور حاصل ہے۔ مجھے بجا طور پر ان سے توقع تھی کہ وہ ان نوٹس کو قابلِ فہم بنانے کی کوشش کریں گے لیکن انہوں نے چند ایک حواشی لکھنے پر اکتفا کی۔ مجھے اعتراف ہے کہ ڈار صاحب نے نوٹس کو پڑھنے اور ان کے بعض حواشی لکھنے کی جو خدمت سرانجام دی ہے وہ انتہائی قابلِ قدر ہے لیکن انہیں اس سے آگے بڑھ کر ان نوٹس کو علامہ اقبال کے منصوبے کے مطابق پھیلانا چاہیے تھا۔[2] بہر حال یہ میدان اب بھی اقبال کے دیگر شیدائیوں کے لیے خالی ہے۔ میں نے اُن نوٹس کا ترجمہ بھی کیا ہے اور ان پر حواشی تحریر کئے ہیں۔

ترجمہ کی بنیاد کون سے نوٹس ہیں

مَیں نے ڈار صاحب کے پیش کردہ متن کو ترجمہ کی بنیاد بنایا ہے اور مزید حواشی لکھنے کی کوشش کی ہے۔ سہولت کے لیے انگریزی متن کے بالمقابل اردو ترجمہ دیا گیا ہے:

---

[1] Letters and Writings of Iqbal by B.A.Dar Pages 86-87.

[2] افسوس کہ بشیر احمد ڈار ۲۹ مارچ ۱۹۷۹ء کو فوت ہو گئے۔ انہوں نے اقبال پر انتہائی وقیع کام کیا ہے لیکن جہاں تک مجھے علم ہے مرحوم یہ کام نہ کر سکے۔ بشیر احمد ڈار کے حالات و خدمات کے لیے ایک مختصر مضمون محمد عبداللہ قریشی نے لکھا جو مجلہ "اقبال"، لاہور بابت اپریل ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔

18988

A. It is necessary to study Islam.

(i) It has power and vitality.

At times it has shown its power of getting rid of accretions. New Movements. I pin no faith on them but they indicate confusion and inner unrest.

(ii) Islam and modern world and British Empire.

B. Islam and Empire.

The effect of Arab Empire on Islam.
They destroyed Rome and Persia and built another Imperialism. Causes of Empire building:

(i) Religious zeal; burning ardour to regenerate mankind;

(ii) Hunger,

Whatever may be the causes the effect was not good. Empire brought men belonging to earlier ascetic cultures, which Spengler describes as Magian, within the fold of Islam. The result was the conversion of Islam to a pre-Islamic creed with all the philosophical controversies of these creeds: روح، نفس، قرآن، حادث، یا قدیم وغیرہ (Ruh, Nafs, Quran: Haadith, Qadim). Real Islam had very little chances.

C. Difficulties of modern student of Islam. He must wade through a tremendous literature and read the Quran. I have done so and try to give you what I honestly believe to be real Islam.

ا۔ اسلام کا مطالعہ ضروری ہے۔

(ا) اس میں قوت اور استعداد حیات ہے۔

بسا اوقات اس نے اپنے اندر نمو پانے والے خارجی عناصر Accretions سے چھٹکارا پانے کی قوت کا اظہار کیا ہے۔

نئی تحریکات:۔ میں ان پر اعتماد نہیں رکھتا۔ لیکن یہ اندرونی انتشار Confusion

اور اندرونی خلفشار Unrest کو ظاہر ضرور کرتی ہیں۔

(۲) اسلام اور جارحیار دنیا اور سلطنت برطانیہ۔

ب اسلام اور مملکت Empire

اسلام پر عرب مملکت کا اثر

انہوں (عربوں) نے روم اور ایران کو تباہ کر دیا اور ایک نئی ملوکیت (شاہیت) کی تعمیر کی۔

تعمیر کے اسباب:-

(۱) دینی حرارت جس نے انسانیت کی تولید نو Regenerate کے لیے ذوق فروزاں پیدا کیا۔

(۲) بھوک Hunger

اسباب خواہ کچھ بھی ہوں۔ اس کا نتیجہ اچھا نہ نکلا۔ مملکت ان لوگوں کو اسلام کے دائرے میں لے آئی جو قدیم راہبانہ ثقافت Ascetic Culture سے تعلق رکھتے تھے اور جنہیں سپنگلر Spengler مجوسی۔ Magian کہہ کر پکارتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام، زمانہ قبل از اسلام کے مسلک Creed میں تبدیل ہو کر رہ گیا ہے اور اس میں ان تمام مسالک کے متنازعہ فیہ فلسفیانہ مباحث شامل ہو گئے۔ روح، نفس، قرآن، حادث یا قدیم وغیرہ حقیقی اسلام کے ابھرنے کے مواقع بہت کم رہ گئے۔

ج اسلام کے جدید طالب علم کی مشکلات

اسے ضخیم لٹریچر کا مطالعہ کرنا ہوگا اور قرآن کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ میں نے ایسا ہی کیا ہے اور اب میں کوشش کروں گا کہ اس اسلام کو آپ کے سامنے پیش کروں جسے میں حقیقی اسلام سمجھتا ہوں۔

What is Islam?

It is religion: Etymology of religion. دین (din) as used in the Quran. Obedience to the law (read v. 18, Quran). Characteristics of early Asiatic religions.

(i) Revelation in early religion........a mystic process. Islam laid the foundations of understanding it scientifically. Quran, Ibn Khaldun, Sufism.

(ii) Salvation نجات (Najat)

(iii) Wholly unworldliness لارہبانیہ caves, catacombes, cf. Christianity and Islam, Jesus: Saint
والله یخرجکم من الظلمت الی النور

(iv) Fear of the invisible لاخوف علیھم ولھم یحزنون

(v) Some secret teaching cf Spengler, Vol, II, page 246. Read also Martineau, Vol: I.

(vi) Belief in the unreality of the world and time.

(vii) Fatalism. ما خلقت ھذا باطلا، ھل اتی علی الانسان

(viii) Theocracy

Islam was a protest against all pre-Islamic religions in the world as it was found at the time Islam appeared. The world is real. Time is real. No more prophets (Expected ones). No freedom from limitation. No mediation. No Qismat (Fatalism). Is Islam a Theocracy? Relation of Church and State.

What is State? A contract like marriage.

E. But Islam is much more than religion
Peace internal and external (cf. V. 18)

د اسلام کیا ہے؟

کیا یہ مذہب Religion ہے؟ اس لفظ کے مشتقات Etymology

دین جیسا کہ قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ قانون کی اطاعت (قرآن ۵: ۱۸) [1]

قدیم راہبانہ مذاہب Ascetic Religion [2]

(۱) قدیم مذہب میں الہام، القاء Revelation کا تصور ——

ایک باطنی یا متصوفانہ عمل Mystic Process

اسلام نے اسے سائنسی انداز سے سمجھنے کی بنیاد رکھی۔ قرآن، ابن خلدون، تصوف۔

(۲) مکتی، نروان یا نجات Salvation

(۳) کامل ترک دنیا کا عقیدہ (لا رہبانیہ)(۱)

غاریں، تہہ خانے۔

اسلام اور عیسائیت کا تقابل۔ حضرت عیسیٰؑ بحیثیت ولی۔ واللہ یخرجکم من الظلمٰت الی النور(۲)

(۴) ہستی غیب (الغیب) کا خوف۔ لاخوفٌ علیہم ولا ھم یحزنون۔(۳)

(۵) بعض باطنی تعلیمات بحوالہ سپنگلر، جلد دوم صفحہ ۲۴۶۔

نیز مارٹینیو Martineau جلد اول (۴)

(۶) مکان (کائنات) اور زمان کے غیر حقیقی ہونے کا عقیدہ۔ ما خلقت ھذا باطلا۔ ھل اتی علی الانسان۔(۵)

(۷) عقیدۂ مشیت (تقدیر) Fatalism

---

[1] یہ حوالہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ سورۂ مائدہ کی آیت ۱۸ ان موضوعات سے متعلق نہیں۔ اس آیت میں یہود کے اس زعم کو باطل ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں۔

[2] انگریزی متن میں لکھا گیا ہے Asiatic Religion جو درست معلوم نہیں ہوتا۔ یہ لفظ اس مقام کے علاوہ نوٹس میں کہیں بھی نہیں آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ Ascetic ہے نہ کہ Asiatic اس لیے ترجمے میں Ascetic ہی کا مفہوم لکھا گیا ہے۔

(۸) مذہبی ریاست **Theocracy**

اسلام دنیا میں قبل از اسلام (عہدِ جاہلیت) کے ان تمام مذاہب کے خلاف احتجاج تھا جو اس کے ظہور کے وقت موجود تھے۔ زمان و مکان دونوں حقیقی ہیں۔

انبیاء کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ (نبیٔ منتظر)

مقررہ حدود سے آزادی نہیں (بندہ اور خدا میں) واسطہ **Mediation**

بھی نہیں۔ عقیدہ مشیت (تقدیر) کوئی چیز نہیں۔ کیا اسلام ایک مذہبی ریاست **Theocracy** ہے۔

کلیسا اور ریاست کا تعلق

ریاست کیا ہے؟ نکاح کی طرح ایک معاہدہ

۵ لیکن اسلام مذہب سے بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے۔

داخلی اور خارجی امن (۵ : ۱۸) [1]

(i) It is deracialisation of man (external peace);

(ii) It aims at economic equality (internal security).

This lecture to close.

Two closing observations:

(i) The message of Islam:

(ii) Islam is not the foe or even rival of christianity. In the work of civilization it is co-worker.

Second Lecture: The law of Islam.

See book of Dickinson, "After Two Thousand years".

In Magian culture 'Revelation' a mystical process. In Islamic sufism this mystical process understood scientifically.

It is morality touched with emotion?

---

[1] یہ حوالہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ سورۂ مائدہ کی آیت ۱۸، ان موضوعات سے متعلق نہیں۔ اس آیت میں یہود کے اس زعم کو باطل ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں۔

A. **Religion.** It is belief in a God or gods with some kind of worship? in caves?

(i) It is wholly other worldliness (Monasticism).

لا رہبانیہ فی الاسلام، لا تنس نصیبک فی الدنیا

(Mithraism) (Darkness) (Mosque)

(ii) Is it fear of the invisible?

لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون

(iii) Is it intimacy with the supersensible?
Partly Yes, But the supersensible opened, to be approached in scientific spirit. Ibn Khaldun, idea of finality.

(iv) Is it some secret teaching to be handed orally (mystery)? All early magian religions believed in it (spengler, P.246 Vol:II);
Islam: No. قد تبین الرشد من الغی

(v) Religion (origin of word).
(Mazhab) not used in the Quran. Words used in the Quran;

یہ انسان کو نسلی امتیازات سے بلند کرتا ہے۔ (خارجی امن)

معاشی مساوات اس کا نصب العین ہے (داخلی سلامتی)

و خطبہ اول کا اختتامیہ

دو اختتامی توضیحات

(۱) اسلام کا پیغام

(۲) اسلام عیسائیت کا دشمن بلکہ حریف بھی نہیں۔

تہذیب و تمدن کے معاملہ میں یہ اس کا رفیق کار ہے۔

دوسرا خطبہ:۔ اسلامی قانون

ملاحظہ ہو ڈکنسن Dickinson کی کتاب "دو ہزار سال بعد" After Two"

Thousand Years (۶) مجوسی ثقافت میں وحی ایک متصوفانہ عمل ہے۔ اسلامی تصوف میں یہ متصوفانہ عمل سائنسی انداز سے سمجھا جاتا ہے

کیا یہ جذبہ یہ امیزا خلاقیت ہے ؟

ا مذہب :- کیا یہ کسی قسم کی پرستش کے ساتھ ایک خدا یا بہت سے بے نادیدہ ناؤں پر ایمان لانے کا نام ہے؟ نادروں ہیں ؟

(۱) کیا یہ کامل ترک دنیا ہے ؟ رہبانیت Monasticism متزائیت

Mosque مسجد Darkness ظلمت Mithraism

(۱ح) ھبانیہ نی اسلام اور لاتنس نصیبك نی الدنیا[(۷)]

(۲) کیا یہ ہستیٔ غائب (الغیب) کے خوف کا نام ہے۔ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون[(۸)]

(۳) کیا یہ مافوق الحواس ہستی Supersensible سے تعلق خاطر ہے؟ ایک حد تک اس کا جواب اثبات میں ہے۔ لیکن مافوق الحواس ہستی تک رسائی سائنسی انداز سے ہوگی۔ ابن خلدون، تصورِ خاتمیت Finality

(۴) کیا یہ کوئی باطنی تعلیم ہے جو سینہ بسینہ آگے چلتی ہے (پراسرار ؟)

تمام قدیم مجوسی مذاہب اس امر میں یقین رکھتے تھے (سپنگلر صفحہ ۲۴۲، جلد دوم)۔

اسلام ! نہیں قد تبین الرشد من الغی[(۹)]

(۵) مذہب (اس لفظ کا مادہ)

"مذہب" (کا لفظ) قرآن میں استعمال نہیں کیا گیا۔

قرآن میں استعمال ہونے والے الفاظ۔ Millat, Minhaj, Din
ملت، منہاج، دین

What is the meaning of ملت and دین

(vi) Martineau, vol. I

B. Islam....... a protest against all religions

in the old sense of the word. ومن ورائهم برزخ

(i) Abolition of prophethood: الی یوم یبعثون
Islam and Time هل أتی علی الانسان

(ii) The idea of Salvation (Najat) in Islam.
Is it a Salvation-religion?
(Najat) is used only once in the Quran
What is Najat?

(iii) No secret teaching.

(iv) Belief in God: غیب (Ghaib)
Deracialisation of mankind وشعوباً and اختلاف
Economic equality قل العفو المستنکوالخ

C. Church and State?
Is Islamic community a juristic person?
Is Islamic State a juristic person?
Relation of Church and State.
What is State? Like marriage a contract.
The Amir is the Shaikhul Islam, etc.
Hereditary Monarchy. History of Islam.
Priesthood.
Karbala? Effect of it.

D. Islam and the Woman

E. Islam and Capitalism.

(i) To the Magian culture 'Revelation' is a mystical process in which some spirit enters the body of a person who speaks it. In Islam

ـــــ ملت، منہاج، دین۔ ملت اور دین کے معنی کیا ہیں؟

(۶) مارٹینیو، جلد اوّل

ب اسلام ـــــ تمام مذاہب (جن معنوں میں لفظ مذہب قدیم زمانہ میں استعمال ہوتا رہا ہے) کے خلاف احتجاج ہے۔

(۱) ختم نبوت :۔ ومن ورائهم برزخ الی یوم یبعثون (۱۰)

اسلام اور زمان۔ هل أتی علی الانسان (۱۱)

(۲) اسلام میں نجات کا تصور

کیا یہ نجات دلانے والا مذہب ہے؟

لفظ "نجات" قرآن میں صرف ایک مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ نجات کیا ہے؟

(۳) کوئی متصوفانہ (باطنی) تعلیم نہیں۔

(۴) ایمان باللہ — غیب

نوعِ انسانی سے نسلی تفریق مٹانا۔ اختلاف السنتکم الخ اور شعوبا[۱۲]

معاشی مساوات (قل العفو وغیرہ)[۱۳]

ج کلیسا اور ریاست **Church and State**

کیا امت اسلامیہ ایک فقہی تشخص **Juristic Person** ہے؟

کیا اسلامی ریاست ایک فقہی تشخص ہے؟

کلیسا اور ریاست کا تعلق

ریاست کیا ہے؟ نکاح کی طرح ایک معاہدہ

امیر، شیخ الاسلام ہے وغیرہ وغیرہ

موروثی ملوکیت، تاریخ اسلام — پیشوائیت **Priesthood**

کربلا؟ اس کا نتیجہ

د اسلام اور عورت

ہ اسلام اور سرمایہ داری

(۱) مجوسی ثقافت کی رُو سے الہام یا القاء ایک متصوفانہ (باطنی) عمل ہے۔ جس میں کوئی رُوح آدمی کے بدن میں داخل ہو جاتی ہے اور اس روح کی باتیں اس آدمی کی زبان سے باہر آتی ہیں: اسلام میں

Wahy (Quote verses: او من وراء حجاب) is universal property of life in which a man comes into contact with the ultimate springs of life. It manifests itself in

three ways. It is abolished as a source of knowledge. In Islam contemplation of Athar spreads into thought and action. It realises the immensity of the world in which old conceptions of race, community, creed dwindle into nothings. It is light اللہ نور السموت والارض. It draws the world from caves to the open day light.

واللہ یخرجکم من الظلمت الی النور

(ii) The word Salvation (نجات)

What is Najat? Liberation from what?

.......Not from the limitations of individuality جئتمونا فرادی not liberation from the tension of consciousness. It is relief of the Ego's loneliness in the Universe. The conception of God.... Comrade: ھو معکم والی رفیق الاعلیٰ

(a) Sleep liberates لا تاخذہ سنۃ ولا نوم، قم اللیل الا قلیلا

(b) Wine liberates and breaks the vigour of واجتنبوہ consciousness:

(c) Dancing also liberates: مروا باللغو، مروا کراما

All these means of escape from space and time are discouraged. You should overcome space and time by الا بسلطان الخ i.e. mastering actuality by understanding.

تفکروا فی خلق السموت الخ

Fear of the visible actually. i.e Space and time is removed when we begin to understand things as causal relations.

لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون

کہ این جا جز ما و او نیست الخ

الہام (آیات کا حوالہ دیجئے، یرسل من ورائی حجاب[14]) حیات کا وہ عالمگیر عنصر ہے جس میں انسان زندگی کے سرچشمہ ہائے اولیٰ Ultimate springs of life سے تعلق قائم کرلیتا ہے۔ اس کا اظہار

تین طریقوں سے ہوتا ہے۔ اب یہ سلسلہ بطور ذریعہ علم ختم ہو چکا ہے۔

اسلام میں آثار میں[15] استغراق وانہماک **Contemplation of Athar** فکر اور عمل دونوں میں سرایت کر جاتا ہے۔ یہ عالم کی وسعتوں اور پہنائیوں **Immensity** کا ادراک کرتا ہے جس سے نسل، قوم اور عقیدہ کے قدیم تصورات کی نفی ہو جاتی ہے۔ یہ نور ہے۔ اللہ نور السمٰوات والارض[16]۔ یہ دنیا کو غاروں سے نکال کر اجالے میں لاتا ہے۔ واللہ یخرجکم من الظلمٰت الی النور[17]۔

(۲) لفظ "نجات" **Salvation**

نجات کیا ہے؟ کس بات سے نجات؟ انسانی ذات کے انفرادی تشخص **Individuality** کی حدود سے چھٹکارا نہیں وجتمونا فرادیٰ[18] شعور کی کشمکش **Tension of Consciousness** سے بھی چھٹکارا نہیں۔ یہ کائنات میں "انا" کے کرب تنہائی سے نجات **Relief** ہے۔

خدا کا تصور رفیق کی حیثیت سے۔ ھو معکم[19] اور والی رفیق الاعلیٰ[20]۔

ا نیند چھٹکارا دلاتی ہے۔ لا تاخذہٗ سنۃ ولا نوم، قم اللیل الا قلیلا[21]۔

ب شراب چھٹکارا دلاتی ہے اور شعور کی توانائی کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ اجتنبوہ[22]۔

ج رقص بھی چھٹکارا دلاتا ہے۔ مروا باللغو مروا کراما[23]۔

زمان و مکان سے فرار کے ان تمام ذرائع کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔ تمہیں زمان و مکان پر الا بسلطان۔ الخ[24] سے غالب آنا چاہیے۔ یعنی فہم و فراست سے واقعیت **Actuality** پر تسلط پانا۔ تفکروا فی الخلق السمٰوٰت الخ[25]

جب ہم اشیاء کو اسباب و علل کے رشتوں سے سمجھنے لگتے ہیں تو مرئی واقعیت ــــ زمان و مکاں کا خوف مٹ جاتا ہے۔ لاخوف علیہم ولاھم یحزنون [۲۶] کہ این جا جز ما و او نیست الخ۔

Knowledge of World as nature.....actuality.
Fear overcome not by charms but by formula.

(d) Knowledge of world as movement.......... history ....sufism.

(iii) ایمان (Iman............Security.

Religious movements in Islam:

Ibn Taimiyya
Abdul Wahhab
Babi — Prophecies
Ahmadiyya etc. — All more or less magian
Syed Ahmed...... — Rationalism.
The new movement.
The coming of the expected one
مسیح (Jesus) وغیرہ

(i) No return ومن ورائهم برزخ الى يوم يبعثون

(ii) Traditions........... Bukhari.

دنیا کا علم بحیثیت فطرت ۔ واقعیت خوف، سحر و افسوں سے نہیں جاتا بلکہ صحیح علم Formula سے مٹتا ہے۔

د ــ دنیا کا علم ایک تحریک کی حیثیت سے ــــ تاریخ ــــ تصوف

(۳) ایمان ــــ سلامتی

اسلام میں مذہبی تحریکات

ابن تیمیہ

عبدالوہاب

بابی | پیش گوئیاں (Prophesies)

احمدیت وغیرہ | یہ تحریکیں کم وبیش مجوسی ہیں۔

نئی تحریک

نبیٔ منتظر کی آمد، مسیح Jesus وغیرہ۔

(۱) کسی کی واپسی نہیں۔ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ۔ (۲۷)

(۲) احادیث (بخاری)

حواشی

۱۔ لا رهبانية في الاسلام (حدیث رسولؐ)

"اسلام میں ترک دنیا کا کوئی تصور قابل قبول نہیں۔"

۲۔ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا۔ (سورۃ الاحزاب: ۴۳)

"وہی ہے جو تم پر رحمت فرماتا ہے اور اس کے ملائکہ تمہارے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں تاکہ وہ تمہیں تاریکیوں سے روشنی میں نکال لائے وہ مومنوں پر بہت مہربان ہے۔"

یہ اللہ کی رحمت ہے جس کا باعث رسول اللہؐ کی ذات ہے، اسی کے ذریعے ایمان اور اعلیٰ انسانی اخلاق کی دولت نصیب ہوئی، کفر و جاہلیت کی تاریکیوں سے نجات ملی۔ صلوٰۃ کا لفظ جب علیٰ کے صلے کے ساتھ اللہ کی طرف سے بندوں کے حق میں استعمال ہو تو مراد رحمت ہوتی ہے اور جب ملائکہ کی طرف سے انسانوں کے حق میں استعمال ہو تو اس کے معنی "دعائے رحمت" کے ہوتے ہیں۔

هوالذی ینزل علیٰ عبدہٖ اٰیٰتٍ لیخرجکم من الظلمٰت
الی النورؕ وان اللہ بکم لرءوفٌ رحیم۔ (الحدید: ۹)

"وہی ہے جو اپنے بندے پر صاف صاف آیتیں نازل کر رہا ہے تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تم پر نہایت شفیق اور مہربان ہے۔"

۳۔ قلنا اھبطوا منھا جمیعًا فاما یاتینکم منی ھدًی
فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ (بقرہ ۳۸)

"ہم نے کہا کہ تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے، ان کے لیے کسی کو خوف اور رنج کا موقعہ نہ ہوگا۔"

حضرت آدم ؑ سے جو بھول چوک ہوگئی تھی اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں ان کی توبہ قبول کر لی تھی۔ البتہ اللہ نے آدم کو جنت سے زمین پر چلے جانے کا حکم دے دیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے دامن پہ نافرمانی یا گناہ گاری کا دھبہ نہیں تھا، بلکہ اس کے بعد انہیں نبوت کا منصب بھی عطا کیا، گویا جنت سے نکلنا کوئی سزا کے طور پر نہیں بلکہ مرضئ رب کے تحت تھا، لہٰذا عیسائیت کا پیدائشی گناہگاری کا تصور باطل ٹھہرتا ہے، جب انسان گنہگار نہیں اور وہ ہدایت رب پر کلی عمل کرتا ہے تو وہ ایک ایسا رفیق پا لیتا ہے جس کی موجودگی میں کسی قسم کا ڈر خوف یا حزن وغیرہ نزدیک نہیں آسکتا۔

۴۔ ذیل کی کتاب کی طرف اشارہ ہے۔

A Study of Religion by Martineaus J.
2 Volumes, Clarendon Press, Oxford, 1889.

۵۔ ان فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف الیل و النہار لآیٰت لاولی الالباب ۝ الذین یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلیٰ جنوبہم ویتفکرون فی خلق السمٰوٰت والارض ج ربنا ما خلقت ھٰذا باطلا ج سبحٰنک فقنا عذاب النار۔ (اٰل عمران : ۱۹۱)

"زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں ان ہوشمند لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں و زمین کی ساخت میں غور کرتے ہیں (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) پروردگار یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے، تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس اے رب! ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔"

ھل اتیٰ علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیئا مذکورا۔ (الدھر : ۱)

"کیا انسان پر لامتناہی زمانے کا ایک وقت ایسا نہیں گزرا ہے جب وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا۔"

اس میں انسان پر اللہ کے ایک خصوصی احسان (تخلیق) کی بنیاد پر قیامت میں اسے دوبارہ زندہ کرنے کا شعور دلایا گیا ہے، نیز حین من الدھر میں دہر سے مراد وہ لامتناہی زمانہ ہے جس کی ابتداء و انتہاء انسان کو معلوم نہ ہو اور حین سے مراد وہ خاص وقت ہے جو دہر میں کبھی پیش آیا ہو۔ گویا لامتناہی زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آیا جب انسان کو پیدا کیا۔

۶۔ After Two Thousand years by Galsworthy Lowes Dickinson (1862-1932)
Allen and Unwin, (1930) A Dialogue between Plato and a Modern Youngman

۷۔ وابتغ ما آتٰک اللہ الدار الآخرۃ ولا تنس نصیبک من الدنیا واحسن کما احسن اللہ الیک ولا تبغ الفساد فی الارض ان اللہ لا یحب المفسدین۔ (القصص: ۷۷)

"جو مال اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔ احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے اور زمین میں فساد پیدا کرنے کی کوشش نہ کر، اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔"

یہ وہ بات ہے جو قوم موسیٰؑ نے قارون سے کہی اور اسے صحیح روش اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن یہی بات قرآن ہر انسان سے کہتا ہے کہ نہ تو آخرت کی فکر ترک کی جائے اور نہ دنیا سے دست برداری اختیار کی جائے، بلکہ دونوں کام اعتدال و توازن کے ساتھ جاری رکھے جائیں۔ اس طرح دین، اسلام ترکِ دنیا کے نظریئے کو رد کر دیتا ہے۔

۸۔ قرآن (البقرہ: ۳۸) ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۳۔

۹۔ قد تبین الرشد من الغی (بقرہ: ۲۵۶)

"صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔"

یعنی حیات و کائنات کی بنیادی حقیقتوں اور صراطِ مستقیم کی معرفت کوئی راز کی بات نہیں کہ جو قدیم مذاہب کے پیشواؤں کی طرح سینہ بسینہ چلی جاتی ہو اور دوسرے انسانوں کو اس کی خبر تک نہ ہو، قرآن مجید نے حق کی معرفت کے جو تقاضے ہیں انہیں بڑی وضاحت سے پیش کر دیا ہے۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ اپنی عقل و فہم کو کام میں لا کر انہیں سمجھنے کی کوشش کرے۔

۱۰۔ ومن ورائہم برزخ الیٰ یوم یبعثون۔ (المومنون: ۱۰۰)

"اب ان سب (مرنے والوں) کے پیچھے ایک برزخ حائل ہے، دوسری زندگی کے دن تک۔"

برزخ سے مراد پردہ یا روک ہے، موت ایک حدِ فاصل ہے دنیا اور آخرت کے درمیان۔

۱۱۔ قرآن (الدھر: ۱۱) ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۵

۱۲۔ ومن آیٰتہٖ خلق السمٰوٰت والارض واختلاف السنتکم والوانکم ط ان فی ذالک لاٰیٰتٍ للعٰلمین۔ (الروم: ۲۳)۔

"اور اس کی نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانشمند لوگوں کے لیے۔"

یعنی کائنات کی تمام اشیا کی تخلیق ایک ہی طرح کے عناصر سے ہوتی ہے اور ایک ہی قانون فطرت ان میں کارفرما ہے اس سے ایک ہی خالق کائنات کا واحد ہونا واضح ہوتا ہے۔

یاایہا الناس انا خلقنکم من ذکرٍ وانثیٰ وجعلنٰکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ط ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم ط ان اللہ علیم خبیر۔ (الحجرات: ۱۳)

"لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے عزت والا ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔"

۱۳۔ یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو۔ (بقرہ: ۲۱۹)

"وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجیے جو اپنی ضرورت سے زیادہ ہو۔"

اسلام میں دولت انسان کی ملک نہیں بلکہ اس کے پاس خدا کی امانت ہے جس میں سب انسان شریک ہیں۔ لہٰذا جس پر اللہ کا خاص فضل ہو وہ دولت کو

اپنے پاس روک کے رکھنے کی کوشش نہ کرے بلکہ اسے معاشرے میں گردش کے لیے خرچ کرے۔ اس مقصد کے لیے اسلام نے جو پابندیاں لگائی ہیں مدینہ کی اسلامی ریاست میں ان کے موزوں اور نتیجہ خیز ہونے کا تجربہ کیا جا چکا ہے۔ مسلمانوں کے لیے صرف یہی ضروری نہیں کہ وہ مال کو زکوٰۃ، صدقہ، فطر، انفاق، وراثت، عن سوی الزکوٰۃ کی مدوں میں خرچ کریں بلکہ اسلام کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ ان کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ جو کچھ ہے وہ خدا کی راہ میں دوسروں کی بھلائی کے لیے خرچ کریں۔

۱۴۔ وما کان لبشرٍ ان یکلمہ اللہ الا وحیاً او من وراءِ حجابٍ او یرسل رسولاً فیوحی باذنہٖ ما یشاءُ انہٗ علیٌّ حکیمٌ۔ (الشوریٰ: ۵۱)

"کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے رو برو بات کرے۔ اس کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے، یا پردے کے پیچھے سے، یا پھر وہ کوئی پیغام بر (فرشتہ) بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے وہی کرتا ہے، وہ برتر اور حکیم ہے۔"

عربی زبان میں لفظ وحی کے معنی اشارہ لطیف کے ہیں۔ انگریزی میں اس سے قریب تر لفظ Inspiration ہے، اس کی تین صورتیں ہیں:-

(۱) براہ راست وحی (القاء والہام)

(۲) پردے کے پیچھے سے کلام۔

(۳) فرشتے کے ذریعے۔

وحی لازماً ایک ہی صورت میں نہیں ہوتی، وہ ایک خیال کی شکل میں بھی ہو سکتی ہے جو دل میں ڈالا جائے، وہ ذہن و فکر کے لیے ایک رہنمائی بھی ہو سکتی ہے، معاملہ کا صحیح فہم بخشنے اور مسئلے کا درست حل یا حسب موقع تدبیر سجھا دینے کی صورت بھی ہو سکتی ہے۔ وہ ایک سچا خواب بھی ہو سکتی ہے نیز ایک ایسی روشنی

بھی جس میں آدمی اپنا راستہ صاف دیکھ کر منزل کی طرف گامزن ہو سکے۔

۱۵ آثار Athar

اس سے مراد اللہ کی وہ نشانیاں ہیں جو حیات و کائنات یا انفس و آفاق میں بکھری ہوئی ہیں۔ معرفت حق کا ایک طریقہ تو پیغمبروں پہ نازل ہونے والی وحی ہے، اس کے علاوہ نفس انسانی، زندگی اور کائنات کا تنوع مگر وحدت انسان کو خدا کی پہچان کے قابل بناتی ہے۔ مثلاً

در عالم میں نہیں موجود و مشہود
بجز ذات و صفات، افعال و آثار

۱۰- اللہ نور السمٰوٰت والارض ط مثل نورہٖ کمشکوٰۃٍ فیہا مصباح ط المصباح فی زجاجۃ ط الزجاجۃ کانہا کوکب دری یوقد من شجرۃ مبرکۃ زیتونۃ لاشرقیۃ ولاغربیۃ لا یکاد زیتہا یضیٓئ ولولم تمسسہ نار ط نور علیٰ نورٍ یہدی اللہ لنورہٖ من یشآء ط ویضرب اللہ الامثال للناس ط واللہ بکل شیءٍ علیم۔ (النور: ۳۵)

"اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے (کائنات میں) اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو، چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا یہ حال ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا، اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی، جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو چاہے آگ اس کو نہ لگے (اس طرح) روشنی پر روشنی (بڑھنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں) اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے رہنمائی کرتا ہے۔ وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔"

اس آیت میں اللہ کو نور کہا گیا ہے۔ نور اللہ کی حقیقت نہیں اس کو نور محض

اس کے کمالِ نورانیت کی وجہ سے کہا گیا ہے۔

اقبال کے خیال میں نور ایک استعارہ ہے جس سے اللہ کی مطلقیت کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ دیکھیے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ترجمہ سید نذیر نیازی صفحات ۹۷-۹۸۔

۱۷۔ قرآن (۲۴:۳۵ اور ۵۷:۹) ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۲۔

۱۸۔ وکلھم اٰتیہ یوم القیٰمۃ فردًا۔ (مریم: ۹۵)

"سب قیامت کے روز فردًا فردًا اس کے سامنے حاضر ہونگے۔"

۱۹۔ اللّٰھم الرفیق الاعلیٰ۔ (حدیث نبویؐ)

یہ کلمات وفات کے وقت زبان مبارک پر جاری تھے۔ اقبال کے نزدیک اسلام جس خدا کا تصور دیتا ہے وہ کائنات کے ہولناک سکوت اور اس کی دنیاوی مشکلات میں اس کے رفیق و دمساز کا تصور ہے۔ اور یہی تصور دُعا اور عبادت کی صورت اختیار کرتا ہے، اقبال نے اس موضوع پر اپنے خطبہ "ذات الٰہیہ کا تصور اور حقیقتِ دعا" میں بحث کی ہے۔ دیکھیے تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ ترجمہ سید نذیر نیازی صفحات: ۱۳۳-۱۴۱۔

۲۰۔ وھو معکم این ما کنتم۔ (الحدید: ۴)

"وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں تم ہو۔"

اللہ کے علم، قدرت، فرمانروائی اور اس کی تدبیر کائنات سے انسان باہر نہیں ہوسکتا۔

۲۱۔ لاتاخذہ سنۃ ولانوم۔ (البقرہ: ۲۲۵)

"وہ نہ سوتا ہے نہ اسے اونگھ آتی ہے۔"

قم اللیل الا قلیلا۔ (المزمل: ۲)

"رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم۔"

ایک معنی تو یہ کہ رات نماز میں کھڑے رہ کر گزارو اور اس کا کم حصہ سونے

میں صرف کرو اور دوسرے معنی یہ کہ آرام بھی کرو اور رات کا قلیل حصّہ نماز میں صرف کرو۔ یہاں اوّلین معنی زیادہ مناسب ہیں۔ اس کی تائید سورۂ الدہر کی آیت ۲۶ سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے :۔

ومن الیل فاسجد لہٗ وسبحہ لیلاً طویلاً۔

"رات کو اللہ کے آگے سجدہ ریز رہو اور رات کا طویل حصّہ اس کی تسبیح کرتے ہوئے گزارو۔"

۲۲۔ یاایہا الذین اٰمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطن فاجتنبوہ لعلکم تفلحون۔ (المائدہ : ۹۰)

"اے ایمان والو! یہ شراب اور جوا، اور یہ آستانے اور پانسے، یہ سب گندے اور شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی۔"

اس آیت میں چار چیزیں قطعی طور پر حرام کی گئی ہیں: (۱) شراب (۲) قماربازی (۳) وہ مقامات جہاں غیر کی عبادت یا غیر اللہ کے لیے قربانی یا نذر وغیرہ کی جائے (۴) پانسے ــــ اس سے اگلی آیت میں شراب اور جوئے پر پابندی کی حکمت بھی بتا دی کہ یہ شیطانی کام مسلمانوں کو خدا کی یاد اور عبادت سے روکتے ہیں۔

۲۳۔ والذین لا یشہدون الزور واذا مروا باللغو مروا کراماً۔ (الفرقان : ۷۲)

اور (رحمٰن کے بندے وہ ہیں) جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے اور کسی لغو چیز پر ان کا گزر ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرح گزر جاتے ہیں۔ نہ تو وہ خلاف واقعہ بات کی شہادت دیتے اور نہ ہی جھوٹ کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ دوسرے معنوں میں جھوٹ سے مراد ہر باطل، ہر گناہ اور ہر بدی ہے جو اپنی جھوٹی چمک دمک کی وجہ سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ مومن چونکہ حق کی معرفت حاصل

کر لینا ہے اس لیے وہ جھوٹ سے نفرت کرتا ہے۔ خواہ وہ دلفریب دلائل، نظر فریب آرٹ یا سماعت فریب خوش آواز کا جامہ پہن کر آئے۔

دراصل اسلام انسان کو وقت کی قدر و قیمت کا صحیح احساس اور انسان کی اعلیٰ صلاحیتوں کا شعور بیدار کرتا ہے۔ جن کا مقصد انسانی کمال حاصل کرنا نہ کہ بیہودہ اور بے معنی کاموں میں مصروف رہنا ہے۔ اس طرح انسان خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کو ٹھکرانے کی کوشش کرتا ہے جو مومن کی شایانِ شان نہیں ہے۔

۲۴۔ یٰمعشر الجن والانس ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السمٰوٰت والارض فانفذوا، لا تنفذون الا بسلطٰن۔ (الرحمٰن: ۳۳)

"اے گروہ جن و انس اگر تم زمین اور آسمانوں کی سرحدوں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ دیکھو۔ نہیں بھاگ سکتے۔ اس کے لیے بڑا زور چاہیے۔"

یعنی اگر کوئی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ وہ خدا کی گرفت سے نکل بھاگے اور اس طرح اپنے آپ کو اعمال کی جواب دہی سے بچا لے جائے تو یہ ناممکن ہے۔ احتساب عمل سے بچنا اس لیے کہ اس آیت سے پیشتر روزِ حساب ہی کا ذکر ہے۔

۲۵۔ قرآن (آل عمران: ۱۹۱) ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۵

۲۶۔ قرآن (البقرہ: ۳۸) دیکھیے حاشیہ نمبر ۳

۲۷۔ قرآن (المومنون: ۱۰۰) دیکھیے حاشیہ نمبر ۹

ضروری تشریحات

ذیل میں بعض اہم نکات کی مختصر تشریح کی جاتی ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ ان میں سے ہر نکتہ بہت زیادہ تفصیل چاہتا ہے:۔

سپنگلر، مجوسیت، مہدی منتظر

سپنگلر وہ فاضل ہستی ہے جس نے مجوسی ثقافت کے متعلق مبسوط ترین

نظریہ اپنی مشہور زمانہ تالیف "زوال مغرب" Decline of the West
کی جلد دوم، باب ہشتم "مجوسی روح" میں پیش کیا ہے۔ اس کے خیال میں یہ مجوسیت تھی جس نے زرتشتی مذہب کی روحانیت پسندی کو ثنویت سے بدل دیا۔ جس سے نور و ظلمت، خیر و شر، اہرمن و یزداں کی مسلسل آویزش اور اس میں کسی آنے والے کے ہاتھوں خیر کے بالآخر غلبے کا تصور پیدا ہوا۔ جس کا نتیجہ نفی خودی کی صورت میں نکلا اور اس مذہب کے پیرو کار سیاسی و اجتماعی زندگی میں فعال حصہ لینے کی بجائے کسی طاقتور حکمران کی بے چون و چرا اطاعت پر آمادہ ہو گئے۔ اس میں علم و حکمت یا عقل و فکر کی بجائے ایسے مکاشفات اور مشاہدات پر زور دیا گیا جن سے گویا ایک پراسرار طریق پر حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔ وہ حقائق جو خود بھی ایک راز ہیں اور عقل کی گرفت سے باہر ہیں۔ مجوسی ثقافت کے خدوخال پر بحث کرتے ہوئے سپینگلر نے اسلام کو بھی اسی کا ایک مظہر قرار دیا ہے۔ اقبال نے ٹھوس دلائل سے اس کے دعوے کا رد کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ خالص اسلام کا مجوسیت اور اس کے مضمرات سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس سلسلہ میں اقبال نے ظہور مہدی کے تصور کو بھی درست قرار نہیں دیا۔ دیکھئے

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ سید نذیر نیازی صفحات ۲۱۸-۲۲۲

اقبال کے خیال میں "احمدیت" کے مسیح موعود اور مہدی وغیرہ کا تصور بھی مجوسی اثرات کا نتیجہ ہے، اس سلسلہ میں ان کے بیانات بسلسلہ "احمدیت اور اسلام" لائق مطالعہ ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:-

حرف اقبال مرتبہ لطیف احمد شروانی صفحات ۱۱۴، ۱۱۶ تا ۱۲۵۔

نیز دیکھئے مکتوبات اقبال بنام سید نذیر نیازی صفحات ۳۵۷، ۳۵۸۔

اقبال نے ہر اس شخص کو مہدی اور آخر زمانی قرار دیا ہے جس کی خودی بیدار ہو گئی ہے۔

مثلاً
ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار
وہی مہدی وہی آخر زمانی (ارمغان حجاز)

نیز تفصیل ملاحظہ ہو:-

ضربِ کلیم صفحات ۴۰، ۴۶، ۴۷، ۵۱، ۵۳، ۵۶ وغیرہ

اس موضوع پر مزید بحث کے لیے دیکھئے:-

تجدید و احیائے دین از سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ صفحات ۱۳۳، ۱۳۹، ۱۶۲، ۱۷۳۔

قرآن اور روح ــــ حادث یا قدیم

مسلمانوں میں جب فلسفیانہ مباحث اور علمی موشگافیوں کی طرف توجہ کی گئی تو معتزلہ نے نفئ صفات اور تنزیہہ صفات کا عقیدہ نکالا۔ اسی سلسلہ میں ذات باری سے صفت کلام کی نفی کے بعد قرآن کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کا سوال پیدا ہوا۔ سب سے پہلے دوسری صدی کے آغاز میں جعد بن درہم نے قرآن کی مخلوق ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس کے بعد جہم بن صفوان نے اس کا تتبع کیا۔ محدثین نے اس کو خلاف اسلام قرار دیا۔ جہم کی نسبت سے اس کی جماعت کو فرقہ جہمیہ کہا جانے لگا۔ مامون الرشید (۸۱۳-۸۳۳ھ) کے عہد میں اس مسئلہ نے شدت اور حامیانِ خلق قرآن نے بڑا اثر اور اہمیت حاصل کر لی، بادشاہ اور اس کے درباری اس کے ہم خیال ہو گئے۔ حکومت نے علمائے اہل سنت پر بڑے مظالم ڈھائے لیکن امام احمد بن حنبل اس فتنے کے مقابلے میں ڈٹ گئے باوجود شدید اذیتوں کے انہوں نے اس عقیدے پر صاد نہ کیا۔ حتیٰ کہ متوکل علی اللہ (۸۴۷، ۸۶۱ء) کا دور آیا اور اس فتنے کا استیصال کیا گیا۔ امام احمد کا ایک رسالہ "رد جہمیہ" اسی موضوع پر ہے۔

اسی طرح روح کی فنا و بقا اور اس کے حادث و قدیم ہونے کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔ حالانکہ قرآن میں واضح طور پر کہہ دیا گیا تھا کہ یسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی "یعنی اے پیغمبر آپ سے روح کے بارے میں لوگ پوچھتے ہیں تو آپ فرما دیجئے کہ روح میرے رب کے امر میں سے ہے۔" پھر بھی بعض لوگوں نے اس کی تحقیق کو ضروری سمجھا۔ اور اسی قسم کی بحثیں، جن کا عملی زندگی سے

تعلق نہ تھا۔ بعد میں زوال کا باعث ثابت ہوئیں۔ علامہ اقبال چونکہ ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کے علمبردار ہیں۔ اس لیے وہ ان کلامی بحثوں کی بجائے ان پہلوؤں پر زور دیتے ہیں جن کا تعلق حرکت، عمل اور ترقی سے ہے، اقبال نے "ارمغان حجاز" کی مشہور نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں اپنے مدعا کی خوب وضاحت کی ہے۔ نیز ملاحظہ کیجئے:

مقالات اسلامیین — از امام ابوالحسن الاشعری
الملل والنحل — از قاضی ابن حزم
الملل والنحل — از علامہ شہرستانی

دین و مذہب

عہد قبل از اسلام میں چار مذہبوں کو امتیاز حاصل تھا، ہندو مت، بدھ مت، یہودیت اور عیسائیت ان میں سے بعض مذاہب اپنی موجودہ صورت میں صرف انفرادی زندگی کے معاملات میں اخلاقی ضابطہ مہیا کرتے ہیں اور یا تو اجتماعی زندگی سے علیحدگی پر ابھارتے ہیں یا اجتماعی زندگی کے لیے کوئی ہدایات ہی نہیں دیتے، پہلی صورت انسانی تمدن کی ترقی و توسیع کی راہ میں رکاوٹ ہے تو دوسری صورت اس کی اخلاقی و روحانی معراج میں سد راہ کی حیثیت رکھتی ہے اس کے برعکس اسلام کوئی نجی اور شخصی معاملہ نہیں بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں ایک رہنما قوت کی حیثیت کا مالک ہے۔ گویا اسلام قدیم تصور کے مطابق محض ایک مذہب نہیں بلکہ ایک مکمل نظام زندگی ہے جسے دین کے نام سے پکارا گیا ہے۔ اقبال اسلام کے اس منصب اور مقام کی تصریح کے لیے مذہب اور دین میں فرق کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے "دین" کا لفظ چار معنوں میں آیا ہے:۔

۱۔ حاکمیت واقتدار اعلیٰ — المومن: ۶۴، ۶۵، الزمر: ۱۱-۱۷، الزمر: ۲، ۳
۲۔ حاکمیت کے مقابلہ میں تسلیم و اطاعت — النحل: ۵۲، آل عمران: ۸۳، البینہ: ۵

۳- وہ نظامِ فکر و عمل جو اس حاکمیت کے زیر اثر بنے] یونس: ۱۰۴، ۱۰۵، یوسف: ۴۰، الروم: ۲۶-۳۰، النور: ۲

التوبہ: ۳۶ یوسف: ۷۶، انعام: ۱۳۸

الشوریٰ: ۲۱، الکافرون،

۴- مکافات جو اقتدارِ اعلیٰ کی طرف سے اس نظام کی وفاداری یا سرکشی کے صلے میں دی جائے } الذاریات: ۶، الماعون: ۱-۲، انفطار: ۱۷-۱۹

قرآن لفظ دین کو عموماً ایک جامع اصطلاح کے طور پر استعمال کرتا ہے جس سے مراد ایک ایسا نظامِ زندگی ہے جس میں انسان کسی کا اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کر لے، اس کی اطاعت و فرمانبرداری قبول کر لے، اس کے ضوابط اور قوانین کے تحت زندگی بسر کرے، اس کی فرمانبرداری پر عزت، ترقی اور انعام کا امیدوار ہو، اس کی نافرمانی پر ذلت و خواری اور سزا سے ڈرے۔

دنیا کی کسی زبان میں اس لفظ کا متبادل نہیں البتہ موجودہ زمانہ کا لفظ ریاست یا مملکت State کسی حد تک اس کے مفہوم کی ترجمانی کرتا ہے تاہم مکمل نہیں۔ مزید تشریح کے لیے دیکھئے۔

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں از سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، صفحات:- ۱۳۹-۱۵۴

دین ہی کا ہم معنی لفظ "ملت" ہے اور دوسری طرف شریعت کا مترادف منہاج ہے، ملت اور منہاج کی مختصر مگر جامع تشریح علامہ اقبال نے مولانا حسین احمد مدنی رح کے بیان کے جواب میں ایک بیان میں فرمائی۔ ملاحظہ ہو۔

حرفِ اقبال مرتبہ لطیف احمد شروانی صفحات ۲۳۲-۲۴۰

وحی، نبوت اور ختمِ نبوت

وحی وہ اشارۂ لطیف ہے جس سے گویا بلا قیدِ زمانہ ہمیں آنکھ جھپکنے میں کسی حقیقت کا علم ہو جاتا ہے، یہ وہ صفت ہے جو خالقِ کائنات نے زندگی کو عطا کی ہے۔ اور اتنی ہی عام ہے جتنی زندگی۔ صوفیانہ واردات بھی اس سے ملتی جلتی ہے۔ تصوف میں احوال، مشاہدات، کشف، الہام، حدس اور وجدان وغیرہ

بلا منت حواس ہمارے لیے ذریعہ علم بنتے ہیں۔ لیکن ان دونوں میں فرق ہے۔ وحی نبوت، جس طرح عقل سے بلند تر ہے اسی طرح صوفیانہ الہام وغیرہ پر بھی فضیلت کی حامل ہے، نیز یہ اللہ کی خاص عنایت ہے نہ کہ کسی کسب و ریاضت کا نتیجہ، پھر یہ کہ صوفی کا تجربہ و مشاہدہ اس کی اپنی ذات کے لیے ہوتا ہے جبکہ نبی وحی کی مدد سے حیات و کائنات کی تعمیر نو کا فریضہ سرانجام دیتا ہے نیز انسان کے لیے حجت و معیار حق صرف وحئ نبوت اور شعور نبوت ہے۔ صوفیانہ واردات اور عقلی نتائج بھی وہی معتبر ہیں جو وحئ نبوت کی کسوٹی پر پورے اتریں اس لیے صوفیانہ واردات تنقید سے بالاتر نہیں۔

اقبال کا عقیدہ ہے کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا ہے، اور اب کسی نبی کے آنے کی نہ ضرورت ہے نہ توقع ہے، زندگی اور انسانی عقل ارتقار کی اس منزل تک آ پہنچی ہے جہاں وہ وحی کی روشنی اور رہنمائی میں آزادانہ طور پر کام کر سکتی ہے۔ لہٰذا کسی نئی نبوت پر ایمان لانا اقبال کے نزدیک سراسر مجوسی نظریے کی تقلید، مقام محمدیؐ کی توہین تنقیص اور نسل انسانی کی خداداد ذہنی صلاحیتوں کی تحقیر و تذلیل ہے۔ اقبال نے متعدد مقامات پر ان حقائق کی تشریح کی ہے مثلاً

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ مترجمہ سید نذیر نیازی	صفحات :	۱۹۰-۱۹۵
حرفِ اقبال مترجمہ لطیف احمد شروانی	″ :	۱۲۷
اسرار و رموز	″ :	۱۱۵-۱۱۸
ختم نبوت کا عمرانی پہلو از عبدالحمید صدیقی	″ :	
اقبال نامہ (مکاتیب اقبال) حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ	″ :	۱۸۸-۲۰۰

ابن خلدون

علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون (۲۷ مئی ۱۳۳۲ء - ۱۴۰۶ء) تیونس (افریقہ) میں پیدا ہوئے۔ رابرٹ فلنٹ نے اس مسلم حکیم کے بارے میں لکھا ہے کہ ”افلاطون، ارسطو اور

آگسٹائن ابن خلدون کی برابری نہیں کر سکتے اور دوسرے تمام سیاسی مفکرین تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا ذکر ابن خلدون جیسی مایۂ ناز ہستی کے ساتھ کیا جائے۔

"آپ کی شخصیت متنوع اوصاف کی مالک تھی۔آپ بیک وقت سپاہی، منتظم، سیاستدان، عالم، فقیہہ اور مؤرخ وغیرہ تھے۔آپ نے اپنی تاریخ کا مقدمہ لکھ کر عمرانیات کو بحیثیت علم سب سے پہلے آپ ہی نے متعارف کرایا نیز آپ ہی نے جدید فلسفہ تاریخ پیش کیا۔ علامہ اقبال نے متعدد خصوصیات کی بنا پر آپ کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ابن خلدون نے سب سے پہلے عقلی انداز میں وحی، نبوت، ختم نبوت، عقیدۂ ظہور مہدی، مسئلہ خلافت، نفس تحت الشعور وغیرہ مسائل پر بحث کی اور اس طرح بقول اقبال خالص اسلام کی تہذیبی و ثقافتی قدروں کو اجاگر کیا۔اس سلسلہ میں ملاحظہ ہو:۔

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ مترجمہ سید نذیر نیازی صفحات: ۲۵، ۲۶، ۱۴۵، ۲۱۳، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۲۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۹۵۔

ابن خلدون کے حالات زندگی اور علمی کارناموں کے لیے رجوع کیجئے:۔

مقدمہ ابن خلدون مترجمہ مولانا سعد خان یوسفی صفحات: ۳-۳۰

افکار ابن خلدون مرتبہ محمد حنیف ندوی " : ۱۷-۸۸

تاریخ فلاسفۃ الاسلام مترجمہ ڈاکٹر میر ولی الدین " : ۲۲۴-۲۴۹

عقیدہ نجات

نجات، مکتی، نروان یا سالویشن **Salvation** عیسائیوں اور بعض دیگر مذاہب کے پیروکاروں کا بنیادی عقیدہ ہے، عیسائیوں کے عقیدہ کی رُو سے گناہ کی مزدوری موت ہے، تمام پیغمبر گناہ گار تھے (نعوذ باللہ) وہ صرف اپنی ذات کے لیے فوت ہوئے، لیکن مسیح چونکہ گناہوں سے پاک تھا۔اس لیے اس کی موت اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے تھی، عیسائیت کی رُو سے انسان

خدا کی شریعت توڑنے سے لعنتی ہوا، اور مسیح خود لعنتی بنا تا کہ ہم کو شریعت کی لعنت سے بچائے، گویا وہ جناب مسیح کی موت کو شرعی اور پیدائشی دونوں قسم کے گناہوں کا کفارہ قرار دیتی ہے، اسی طرح بدھ مت میں ترک دنیا کو ذریعہ نجات قرار دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس اسلام فطری مذہب ہے، وہ دین و دنیا کے امتزاج کا قائل ہے، اور دوسری طرف وہ فطری گناہ گاری کے اصول کا بھی حامی نہیں، اس کے نزدیک ہر انسان پیدائشی طور پر بے گناہ اور معصوم ہوتا ہے اور شریعت کے ذریعے اس پر حق و باطل بھی واضح کر دیا جاتا ہے، اس دنیا میں اس کی عملی آزمائش ہو رہی ہے، قیامت کے دن اس کے اعمال کا حساب ہوگا۔ جس کے نیک اعمال اس کے بُرے اعمال سے بڑھ جائیں گے وہ اللہ کی بخشش کا مستحق ہوگا، ہر آدمی صرف اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے، وہ صرف کفارہ و شفاعت پر بھروسہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا، کیونکہ حضورؐ کی شفاعت بھی ان کے لیے ہوگی جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے باوجود بعض فطری کوتاہیوں کا ارتکاب کر بیٹھے ہوں۔

اقبال نے اس سلسلہ پر ایک اور انداز سے غور کیا ہے اور وہ یہ کہ انسانی زندگی کا تسلسل موت سے ختم نہیں ہوتا لہٰذا نجات کا تصور بے معنی اور بے عملی کی دعوت دینے والا ہے، اس کے خیال میں زندگی ایک لامتناہی زمانہ میں ارتقائی منازل طے کر رہی ہے۔ لہٰذا نجات وغیرہ کا وہ عقیدہ جس پر قدیم مذاہب نے زور دیا ہے ہرگز لائق التفات نہیں۔

حقیقت زمان اور تقدیر پرستی

Philosophy of Time and Space

فلسفہ زمان و مکان | اقبال کا محبوب موضوع بحث تھا، وہ اس موضوع کو مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے انتہائی اہم قرار دیتے ہیں، کیونکہ وقت کی حقیقت سے آگاہ ہو کر ہی انسان اس کائنات کی تسخیر پر آمادہ ہو سکتا ہے، یہی کیفیت مسئلہ جبر و قدر کی بھی ہے، بعض لوگوں

کے خیال میں انسان اپنے جملہ افعال میں قدرت اور اختیار کا مالک ہے، کچھ لوگوں کے نزدیک کوئی چیز اور فعل اللہ کے ارادے اور مرضی کے بغیر ممکن نہیں ہے، فاعل حقیقی صرف اللہ کی ذات ہے۔ انسان قدرت کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی حیثیت رکھتا ہے۔ گویا انسان بھی نباتات و جمادات وغیرہ مخلوق کی طرح مجبور ہے۔ پہلے عقیدے کی رو سے خدا کی ہستی بے کار ٹھہرتی ہے اور دوسرے عقیدے کی رو سے انسان کی تخلیق بے معنی قرار پاتی ہے اور نیکی و بدی کے مسئلے میں جزا اور سزا کا تصور باطل ٹھہرتا ہے، دراصل قرآن میں ان مابعد الطبیعاتی مسائل کی تشریح نہیں کی گئی بلکہ ان کی طرف بقدرِ ضرورت اشارے کیے گئے ہیں۔ مثلاً جبر و قدر کے مسئلے کی طرف اشارہ سے مقصود یہ ہے کہ انسان میں صبر و قناعت، مستقل مزاجی، عزم راسخ، دنیاوی قوتوں سے بے خوفی و بے نیازی پیدا ہو اور اس میں ایسی قوت پیدا کر دی جائے جس کی موجودگی میں مایوسی، پریشانی، خوف، حسد، لالچ، بزدلی اس کے پاس نہ پھٹکنے پائیں۔ اور انسان اپنی زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے لیے کوشاں رہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات میں انسان کو صرف مجبور پیدا نہیں کیا بلکہ اُسے اپنے منصوبے میں جس حد تک مناسب سمجھا، آزادی و اختیار بھی بخشا، لیکن اس آزادی و اختیار کی حقیقت مکمل طور پر انسان کو معلوم نہیں اور نہ ہی یہ ممکن ہے۔ تاہم ہمارا فرض ہے کہ ہم اس آزادی کو قوانینِ فطرت کے مطابق کام میں لائیں اور انسانیت کے مراتب بلند پر فائز ہونے کے لیے جہد مسلسل میں مصروف ہوں۔ ملاحظہ کیجیے:-

۱۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ترجمہ سید نذیر نیازی صفحات: ۱۰۱-۱۲۰

۲۔ اقبال کا نظریۂ زمان و مکان از ڈاکٹر رضی الدین صدیقی

۳۔ مسئلہ جبر و قدر از سید ابو الاعلیٰ مودودی۔

مذہب اور ریاست

علامہ اقبال دین و سیاست کی علیحدگی کے قائل نہ تھے، اور اسے عیسائیت

کے زیر اثر مغربی فلسفہ قرار دیتے تھے، اُن کے خیال میں سیاسی قوت اگر دین کی رہنمائی سے محروم ہو تو شدید نقصان کا باعث بنتی ہے:۔

۱۔ لادیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر (ضرب کلیم: ۲۲)
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

۲۔ جلال بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو (بال جبریل: ۶۲)
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اقبال اسلام کو ایک اخلاقی نصب العین ہی نہیں بلکہ ایک مکمل نظام حیات قرار دیتے ہیں، گویا اسلام ایک مملکت ہے جس کی نظریاتی تشکیل روسو Jean Jacques Rousseau (1712-1798) کے نظریہ سیاسی سے بہت پیشتر ہو چکی تھی۔ اقبال نے اسلام کی اس برتر اور جامع حیثیت کی وضاحت تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے صفحات ۲۴۰-۲۴۱ پر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ عیسائیت کی ابتداء کسی وحدتِ سیاسی یا مدنی کے طور پر تو نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ ایک نظام رہبانیت تھا اور جب رومی سلطنت حلقہ بگوش عیسائیت ہوئی تو کلیسا اور ریاست دو حریف قوتیں بن گئیں اور ان کے حدود و فرائض کی تعیین ایک نہ ختم ہونے والا مسئلہ بن گیا اس کے برعکس اسلام کا ظہور بطور ایک اجتماع مدنی کے ہوا اور قرآن مجید کی بدولت اسے ایک واضح اور قابل عمل مجموعہ قوانین مل گیا۔ لہٰذا اسلام میں مذہب اور ریاست کی تفریق بے معنی چیز ہے۔ مزید وضاحت کے لیے دیکھیے:۔

۱۔ حرف اقبال مرتبہ لطیف احمد شروانی صفحات: ۱۷-۵۴
۲۔ بال جبریل از اقبال 〃 : ۱۶۰
۳۔ ضرب کلیم از اقبال 〃 : ۱۵۴
۴۔ ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر از اقبال
۵۔ اسلام اور تھیا کریسی مرتبہ عبدالحمید صدیقی

۶- The Political Philosophy of Iqbal
By Parveen Feroze Hassan

۷- جادہ و منزل از سید قطب مترجمہ خلیل حامدی

رہبانیت

وہ نظریہ جو جسم کو شر سے بھرا ہوا اور ناپاک سمجھ کر جسمانی تقاضوں کو زیادہ سے زیادہ کچلنے اور روحانی بالیدگی حاصل کرنے کی کوشش کو پسند کرتا ہے رہبانیت Ascetism کہلاتا ہے، عیسائیت اور بدھ مت میں یہی نظریہ غالب رہا لیکن اسلام نے اس کی شدید مخالفت کی۔ اقبال کہتے ہیں :-

"میرا مذہب یہ ہے کہ اسلام نے دین و دنیا کے فرائض کو یکجا کیا ہے اور اس طرح بنی نوع انسان کے لیے ایک معتدل راہ قائم کی ہے۔ جہاں یہ سکھایا ہے کہ تمہارا مقصود اصلی اعلائے کلمۃ اللہ ہے وہاں یہ بھی تعلیم دی ہے کہ لا تنس نصیبك فی الدنیا (دنیا میں اپنا حصہ فراموش نہ کر) دنیا ہیچ است و کار دنیا ہمہ ہیچ، اسلام کی تعلیم نہیں بلکہ صحیح اسلامی تعلیم یہ ہے جو شرح عقائد میں چند الفاظ میں نہایت خوبی کے ساتھ بیان کی گئی ہے، ترک الاسباب جہالت یعنی اسباب دنیا کا ترک کرنا جہالت ہے، والاعتماد علیہا شرکٌ، اور ان پر اعتماد کرنا شرک ہے۔"

(مقالات اقبال صفحہ : ۱۷۲)

وہ تصوف جو رہبانیت کے زیر اثر ہو اور مسلمان کو عملی زندگی میں حصہ لینے اور تسخیر کائنات سے روکتا نیز ترک دنیا کا عادی بناتا ہے، اقبال کے نزدیک عجمی اور غیر اسلامی ہے، علامہ نے "اسرار خودی" اور اس سلسلے کی بحث میں اپنا مقصود و مدعا وضاحت سے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے

مقالاتِ اقبال مرتبہ سید عبدالواحد صفحات: ۱۵۲-۱۸۶-

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ مترجمہ سید نذیر نیازی " : ۲۳۱-۲۳۵۔
تفہیم القرآن جلد پنجم از سید ابوالاعلیٰ مودودی " : ۳۲۵-۳۳۲
تاریخ تہذیب حصہ اوّل مترجمہ مولانا غلام رسول مہر " : ۱۹۵-۱۹۸

متھرائیت

سورج، دیوتا یا متھرا Mithra ایک ہندی ایرانی دیوتا جس کی پرستش حضرت عیسیٰ سے پیشتر ایک طویل عرصے تک ہندوستان، ایران اور دیگر متعدد ممالک میں کی جاتی رہی۔ قدیم مذہبی کتابوں مثلاً ژند اوستا وغیرہ میں متھرا کو سب سے بڑا ایزد، آسمانی روشنی کا دیوتا، اور تمام ممالک کا شہنشاہ بیان کیا جاتا ہے، وہ انسان کا محافظ اور مددگار ہے اس کی روح کو شیطانی اثرات سے بچاتا ہے، زردشتی مذہب کی ثنویت میں وہ (متھرا) خیر مطلق (اہورامزدا) کی جانب سے بدی (اہرمن) سے لڑتا ہے، چونکہ ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ متھرا کی پیدائش غار میں ہوئی تھی اس لیے وہ اس کی پرستش کی رسوم غاروں یا پوشیدہ جگہوں پر سرانجام دیتے تھے، اس کے سب سے بڑے رسمی عمل میں سانڈ کی قربانی کی جاتی تھی اور ہر یہ عقیدہ اختیار کرنے والے کو سانڈ کے خون سے بپتسمہ دیا جاتا تھا۔ یہ مذہب افواج میں بہت مروج تھا۔ اس مذہب کو متھرائیت Mithraism کہا جاتا ہے، مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے:۔

Chamber's Encyclopaedia, Vol. VII, Pages 238-239
Edition 1891.

چونکہ اس مذہب میں نیکی کرنے اور اس کی حمایت کرنے کی جملہ ذمہ داری ایک دیوتا پر ڈال دی گئی تھی۔ جس سے انسان کی غیر ذمہ داری کو تحفظ ملا نیز چونکہ اس مذہب کی رسوم عبادت کی ادائیگی رہبانی طریقے کے مطابق ادا کی جاتی تھی۔ اس لیے اقبال اس مذہب کو انسان کے حق میں زہر قاتل سمجھتے ہیں اور آج بھی ہر وہ طریقہ جو انسان کو ترکِ دنیا وغیرہ کی تلقین کرے اسے ناپسندیدہ

قرار دیتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اسلام ہے جو عبادت کو جنگلوں، صحراؤں یا غاروں وغیرہ کے ساتھ مختص نہیں قرار دیتا بلکہ حضورؐ کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ساری زمین اِن کے لیے مسجد قرار دے دی گئی ہے۔

حدیث نبویؐ ہے:۔

"ہمیں تین باتوں میں سب انسانوں پر فضیلت دی گئی ہے۔ ہماری صفوں کی مثال ملائکہ کی صفوں کی ہے، ہمارے لیے ساری زمین مسجد ٹھہرائی گئی ہے اور جب پانی نہ ملے تو ہمارے لیے اس کی مٹی پاک ٹھہری" (صحیح مسلم)

انسانی زندگی پر عقیدہ توحید کے اثرات

توحید، اسلام کے بنیادی ارکان میں پہلا رکن ہے، یعنی خدا کو ایک مانا جائے ان صفات کے ساتھ جن کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے نیز اس کی ذات میں کسی کو شریک نہ تسلیم کیا جائے، یہی وہ بیج ہے جس سے اسلام کا شجر پیدا ہوتا ہے۔ اس کا انسانی زندگی پر ہمہ گیر اثر ہوتا ہے، اسی کی بدولت انسان ہر نوع کی غلامی سے نجات پالیتا اور سچی آزادی و حریت سے ہمکنار ہوتا ہے وہ ہر قسم کے مادی امتیازات (رنگ، خون، زبان، وطن وغیرہ) سے بالاتر ہو کر وسیع تر انسانی برادری کا ایک رکن تصور کرتا ہے۔ جس سے قوموں کو جنگ و جدل سے نجات مل جاتی ہے اور اس طرح ہر معاشرہ اور قوم خارجی امن سے بہرہ ور ہوتی ہے۔ پھر توحید سے یہ احساس بھی پروان چڑھتا ہے کہ انسان دنیا کی کسی شئے کا حقیقی مالک نہیں بلکہ امین ہے۔ اُسے چاہیے کہ وہ اللہ کی امانت کو اُس کے قوانین کے مطابق اسی کی مخلوق کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرے۔ یہی صورت ہے معاشرے کو معاشی و اقتصادی استحصال سے نجات دلانے اور افراد معاشرہ میں ہر پہلو سے مساوات قائم کرنے کی۔ اس طرح معاشرہ داخلی امن و سلامتی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ مزید وضاحت کے

لیے دیکھیئے :-

۱۔ اسرار و رموز صفحات : ۱۰۷-۱۱۴
۲۔ اسرار و رموز 〃 : ۱۸۱-۱۹۳
۳۔ حقیقت توحید از امین احسن اصلاحی
۴۔ رسالہ دینیات از سید ابوالاعلیٰ مودودی صفحات : ۷۸-۹۶

ملوکیت

اس سے مراد وہ شخصی نظام حکومت ہے جو ایک ہی خاندان میں جاری رہتا ہے۔ اس میں خاندان، اہلیت پر ترجیح رکھتا ہے اس نظام میں بادشاہ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون اور قابلِ اتباع قرار پاتا ہے۔ بادشاہ کو غلط فیصلوں سے روکنے والی کوئی قوت نہیں ہوتی۔ ہوسِ ملک گیری اس کا خاصہ ہے۔ اسلام نے ملوکیت اور اسی طرح کے دوسرے نظاموں کے برعکس ایک خاص شورائی نظام یا نظامِ خلافت کو متعارف کرایا ہے۔ اقبال بھی اسی قسم کے نظامِ حکومت کے حامی ہیں اسی لیے وہ ملوکیت، مغربی جمہوریت وغیرہ کو انسان کے لیے مفید نہیں سمجھتے۔ مثلاً

سروری در دینِ ما خدمت گری ست عدلِ فاروقی و فقرِ حیدری ست
(پیامِ مشرق)
خلافت بر مقامِ ما گواہی ست حرام است آنچہ بر ما پادشاہی ست
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی ست
(ارمغانِ حجاز: ۱۲۶)

اقبال مغربی جمہوریت کو بھی ملوکیت ہی کا مظہر قرار دیتے ہیں مثلاً

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردے میں نہیں غیر از نوائے قیصری
(بانگِ درا: ۲۹۶)

اسلامی نظامِ خلافت کے بارے میں علامہ اقبال کا ایک اہم مضمون ملاحظہ ہو۔ ملوکیت پر تنقید کے لیے دیکھیئے :-

Thoughts and Reflections of Iqbal
By S.A. Vahid, (Pages 56 to 75)

جاوید نامہ از اقبال صفحات : ۶۹-۷۰

خلافت و ملوکیت کے تقابلی مطالعے کے لیے ملاحظہ کیجئے :-

خلافت و ملوکیت از سید ابو الاعلیٰ مودودی صفحات : ۱۵۷-۲۰۵

حادثۂ کربلا کے اثرات

اسلام میں حکومت کا صرف وہی طریقہ قابلِ قبول ہے جس میں حکمران فرد یا افراد کی جماعت حکومت کو خدا کی امانت تصور کرتے ہوئے خدا اور رسولؐ کی قانونی بالاتری تسلیم کرلے اور مطلق العنانی سے دستبردار ہو جائے۔ اس کا مقصد منکر کو مٹانا، معروف کو فروغ دینا، لوگوں میں عدل قائم کرنا، افراد معاشرہ میں اخوت و مساوات کو پروان چڑھانا، کلمۃ اللہ کے غلبہ کی کوشش کرنا، ہر قسم کے تعصبات کو مٹانا، حدود اللہ کو نافذ کرنا ہو اس حکومت کے تمام امور مسلمانوں کے مشورے سے طے پائیں، عوام صرف معروف میں حکمران کی اطاعت کے مکلف ہوں، کسی شخص کو اقتدار کی حرص نہ ہو نیز حکمران اپنے آپ کو خدا اور عوام کے سامنے جوابدہ سمجھے وغیرہ، حضرت علیؓ کے دور تک ان اصولوں پر عمل ہوتا رہا۔ اسی لیے حضرت ابو بکر صدیقؓ سے لے کر حضرت علیؓ کے دور کو عہد خلافت راشدہ کہا جاتا ہے، حضرت معاویہؓ سے ملوکیت کا آغاز ہوا، جس کا اظہار یزید کی ولی عہدی کی صورت میں ہوا، حضرت حسینؓ نے اسلامی خلافت کا قیصر و کسریٰ کی ملوکیت میں تبدیل ہونا گوارا نہیں کیا اور یزید کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور کربلا کے میدان میں اپنی اور اپنے اہل خانہ کی قربانی پیش کردی۔ اس طرح حضرت حسینؓ نے اپنی شہادت کے ذریعے ثابت کردیا کہ اسلام میں شخصی حکومت کا کوئی مقام نہیں، فاسق و فاجر حکمران کی اطاعت مسلمانوں پر فرض نہیں بلکہ غلط حکومت کو مٹانے کی عملی جدوجہد کرنی چاہیے کیونکہ ایسی حکومت شرک کا درجہ رکھتی ہے۔ مزید مطالعہ کے لیے دیکھیے " در معنی حریت اسلامیہ و سر حادثہ کربلا "

۱۔ اسرار و رموز از اقبال صفحات : ۱۲۵-۱۲۸
۲۔ شہادت حسینؓ از سید ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام اور عورت

دنیا کے اکثر مذاہب نے عورت کو انتہائی حقارت کی نظر سے دیکھا۔ حضورؐ نے عورت کو انسانیت کے شرف و عظمت کا مالک قرار دیا۔ اسلام نے انسانی تمدن کی ترقی کے لیے مرد و زن کے لیے الگ دائرہ کار تجویز کیے، عورت کا کام عائلی زندگی کی ترتیب و تزئین و تدبیر ہے جب کہ مرد کے ذمے گھر سے باہر کی دنیا میں جدوجہد کرنا ہے اسلام نہ تو عورت کی تذلیل کے رویے کو درست قرار دیتا ہے اور نہ بے خدا اور عیاش معاشروں کی عطا کردہ بے قید آزادی اس کے لیے قابل قبول ہے، عورت کی سب سے بڑی خدمت گھر کی تنظیم، آئندہ نسلوں کی تربیت و پرورش وغیرہ ہے، اقبال بھی اسلام کے اس اصول کے حامی ہیں۔ اقبال نے عورتوں کے لیے امومت اور تربیتِ اولاد کو لازمی قرار دیا ہے، اور مسلمان عورتوں کے لیے حضرت فاطمۃ الزہرا رضؓ کے نمونے کی پیروی ضروری قرار دی ہے اسی طرح دیگر مسائل میں بھی وہ اسلام کے حامی ہیں۔ ملاحظہ کیجیے :۔

۱۔ اسرار و رموز از اقبال صفحات : ۱۷۳-۱۸۰
۲۔ جاوید نامہ اقبال " : ۱۲۶-۱۲۹
۳۔ گفتار اقبال مرتبہ محمد رفیق افضل " : ۷۵-۸۴
۴۔ Letters and Writings of Iqbal

By B.A. Dar, Pages 63-67

۵۔ پردہ از سید ابوالاعلیٰ مودودی

تصوف

اسلام میں تصوف سے مراد اخلاص فی العمل یا تزکیۂ نفس ہے۔ بقول شیخ

مجدد الف ثانیؒ "تصوّف فقط تزکیہ اخلاق میں مدد دیتا ہے اور ایمان لیب ہی حق ہے، اتباعِ سنت ہی ارتقائے روحانی کی منزل آخر ہے" لیکن بعض غیر مسلم اقوام کے زیر اثر اسلامی تصوّف میں غیر اسلامی اثرات داخل ہو گئے اور تصوّف و فقر رہبانیت اور ترکِ دنیا کا ہم معنی ہو گیا۔ اقبال نے ۱۹۱۵ء میں اسرارِ خودی شائع کی تو اس میں تصوف میں شامل غیر اسلامی عناصر کی نشاندہی کی، جس پر آپ کو بعض حلقوں کی طرف سے شدید طنز و تعریض کا سامنا کرنا پڑا۔ علامہ اقبالؒ نے اس ضمن میں خالص اسلامی تصوّف کی وضاحت کے سلسلے میں جو مقالات لکھے وہ اکثر و بیشتر مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد میں ملتے ہیں۔ علاوہ ازیں ملاحظہ کیجئے:۔

۱۔ اقبال اور تصوّف از پروفیسر محمد فرمان ایم۔اے

۲۔ قرآنی تصوّف اور اقبال از پروفیسر شاہ محمد عبدالغنی ایم۔اے

۳۔ علامہ اقبال اور تصوّف از سید محمد عبدالرشید فاضل

۴۔ اسلامی تصوّف اور اقبال از ڈاکٹر ابوسعید نورالدین

۵۔ اقبال کے محبوب صوفیاء از اعجاز الحق قدوسی

فلسفہ تاریخ

قوموں کے لیے تاریخ کو وہی اہمیت حاصل ہے جو افراد کے لیے قوت حافظہ کو۔ علامہ فرماتے ہیں:۔

"افراد کی صورت میں احساس نفس کا تسلسل قوت حافظہ سے ہے، اقوام کی صورت میں اس کا تسلسل و استحکام قومی تاریخ کی حفاظت سے ہے۔ گویا قومی تاریخ حیات ملیہ کے لیے بمنزلہ قوتِ حافظہ کے ہے جو اس کے مختلف مراحل کے حسیات و اعمال کو مربوط کر کے قومی انا کا زمانی تسلسل محفوظ و قائم رکھتی ہے"۔

(دیباچہ رموزِ بے خودی مندرجہ مقالاتِ اقبال)

اس نظریہ کی مزید توضیح علامہ نے جن مقامات پر فرمائی ہے ان کے حوالے درج ذیل ہیں۔

اسرار رموز از اقبال صفحات: ۱۷۱-۱۷۳
تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ مترجمہ سید نذیر نیازی صفحات: ۲۱۲-۲۱۷
نیز دیکھیئے:-
اسلام کا فلسفہ تاریخ از عبدالحمید صدیقی-

Quranic Concept of History
By Mazharuddin Siddiqi

امام ابن تیمیہ

تقی الدین ابو العباس احمد بن عبد الحلیم بن عبد السلام بن عبد اللہ بن محمد بن تیمیہ (۱۲۶۳ء-۱۳۲۸ء) مشہور مسلم عالم دین، مصلح اور مجاہد ہیں، انہوں نے اپنے دور میں خالص اسلام کے احیاء کے لیے اور رسوم پرستی، قبر پرستی اور پیر پرستی ایسی بدعات کے خلاف زبان و قلم سے زبردست جہاد کیا۔ آپ کی تصانیف کی تعداد تین سو کے قریب بتائی جاتی ہے، بعد کے ادوار میں مسلمانوں میں جو اصلاحی تحریکیں اُبھریں ان میں سے اکثر و بیشتر ان سے متاثر تھیں۔ اسی لیے علامہ اقبال نے ان کا ذکر بڑی عقیدت اور محبت سے کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:-
تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ مترجمہ سید نذیر نیازی صفحات: ۲۳۳-۲۳۴
ابن تیمیہ کے مفصل حالات کے لیے دیکھیئے:-
۱- اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد اوّل، صفحات: ۴۴۸-۴۵۹
۲- ڈاکٹر غلام جیلانی برق کا پی ایچ ڈی کا مقالہ
کارناموں کے لیے ملاحظہ کیجئے:-
تجدید و احیائے دین از سید ابو الاعلیٰ مودودی صفحات: ۷۳-۷۹

سر سید احمد خاں

سر سید احمد خان (۱۸۱۷ء-۱۸۹۸ء) مشہور ہندوستانی مسلم ادیب، مصلح قوم، بانیٔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ وغیرہ۔ سر سید کی امتیازی خصوصیت یہ

ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو مغربی تعلیم کی اہمیت کی طرف متوجہ کیا، اصلاح معاشرت اور اردو ادبیات میں سادہ، عام فہم، مقصدی اور منطقی نثر کی بنیاد رکھی، نیز اسلامی تعلیمات کو مغربی اصولوں کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی، ان کی تحریک میں رطب و یابس دونوں پہلو شامل تھے۔ علامہ اقبال علی گڑھ تحریک کی مغرب نوازی کے ناقد تھے لیکن بعض معاملات میں سرسید کی سیاسی بصیرت کے معترف بھی تھے۔ مثلاً

حرف اوّل اقبال مرتبہ لطیف احمد شروانی صفحات : ۱۴۸-۱۴۹

بانگِ درا از اقبال " : ۴۲-۴۳

"احمدیت اور اسلام" کے موضوع پر تحقیق کے سلسلہ میں اقبال کو سرسید کے بارے میں بعض نئے حقائق کا علم ہوا تو انہوں نے ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی اور پروفیسر ڈاکٹر ظفر الحسن صدر شعبہ فلسفہ کو خطوط لکھے کہ سرسید کی سیاسی فکر پر تحقیق کا انتظام کیا جائے۔ ملاحظہ ہو۔

مجلہ "صحیفہ" لاہور اقبال نمبر صفحات : ۲۳۲-۲۳۴

سرسید احمد خان کے تفصیلی حالات اور کارناموں کے لیے دیکھیے :-

حیاتِ جاوید از مولانا الطاف حسین حالی

اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد دوم صفحات : ۱۱۶-۱۲۲

محمد بن عبدالوہاب، وہابی، وہابیت

لفظ وہابی یا وہابیت سے بعض مستشرقین نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ اس مسلک کے بانی شیخ محمد نہیں بلکہ ان کے والد شیخ عبدالوہاب تھے۔ اور شیخ محمد اُن کے جانشین تھے۔ شیخ محمد کے پیرو کاروں کو وہابی اور ان کے مسلک کو وہابیت کہنا کسی صورت درست نہیں۔ ان کے مسلک کو طریقہ محمدیہ کہا جا سکتا ہے۔

اٹھارہویں صدی مسلمانوں کے زوال کی آئینہ دار تھی، اسلام کی اصل

تعلیمات نگاہوں سے اوجھل ہوچکی تھیں، جاہل عوام طرح طرح کے شرکیہ افعال میں مبتلا ہوچکے تھے۔ اس پر آشوب دور میں محمد بن عبدالوہاب نجد کے مقام عینیہ (بار الشیخ) کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے (۱۷۰۳ء)۔ شیخ محمد بچپن ہی میں ذہانت و فطانت میں ممتاز تھے عنفوان شباب ہی میں فقہ، حدیث اور تفسیر وغیرہ علوم میں دستگاہ حاصل کر لی۔ تحصیل علم کے ساتھ وہ اپنے ماحول میں جہالت اور بے دینی کے اثرات دیکھ کر رنجیدہ ہوتے۔ حجاز میں جاکر آپ نے بزرگ علماء وقت سے کسب فیض کیا۔ اور حریملا سے اصلاح و تبلیغ کا کٹھن کام شروع کر دیا۔ طرح طرح کی مصیبتیں پیش آئیں لیکن آپ بالکل نہ گھبرائے، اُسی دوران آپ نے کتاب التوحید تصنیف کی اور دعوت کو مؤثر کرنے کے لیے سیاسی وحدت کی طرف توجہ دی۔ آخر کار درعیہ کے امیر محمد بن سعود کے تعاون سے توحید و سنت کی دعوت کو پھیلانے کا موقعہ ملا۔ کچھ مدت تک اردگرد کے امراء اور شیوخ نے مخالفانہ رویہ اختیار کیا لیکن محمد بن سعود اور ان کے قبیلے کی مدد سے یہ مخالفت ان کی دعوت کو روک نہ سکی۔ متعدد نشیب و فراز کے بعد آل سعود نے عرب کے اکثر حصے کو فتح کر کے سعودی حکومت میں شامل کیا۔ (۱۹۲۵ء) شیخ نے پچاس سال تک مسلسل دعوت و تبلیغ کے بعد جون یا جولائی ۱۷۹۲ء میں وفات پائی۔ شیخ محمد نے تقریباً ڈیڑھ درجن کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں کتاب التوحید کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ہوچکا ہے اس میں شیخ نے توحید اور شرک کے موضوع پر عملی نقطہ نظر سے قرآن و سنت کی روشنی میں بحث کی ہے۔ شیخ کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے مہدویت یا مسیحیت کے دعوے کے بغیر اصلاح کا کام کیا۔ انہوں نے اقامت دین کے لیے سعود اور آل سعود کی رہنمائی کی لیکن خود اقتدار کی حرص نہ کی۔

ل نجد کے خلاف ترکی اور مصری حکومتوں، اشراف مکہ اور انگریزی

سیاحوں اور سیاست دانوں نیز جاہل لوگوں نے خوب مخالفانہ پروپیگنڈہ کیا۔ ان کی دعوت کو ایک نئی دعوت قرار دیا۔ حالانکہ ان کے اپنے اقوال کے مطابق ان کا اصل معیار قرآن و سنت کی تعلیمات تھیں۔ وہ مذہب امام احمد حنبل کے پیرو تھے لیکن ان کی تقلید مطلق میں گرفتار نہ تھے، وہ توحید میں تشبیہہ و تجسیم کی نفی کے ساتھ تاویل سے بچتے ہیں جو جملہ ائمہ کا مسلک ہے ان کے نزدیک مصیبتوں میں غیر اللہ کو مدد کے لیے پکارنا یا اللہ کے ساتھ غیر کو بھی پکارنا، استغاثہ، توسل، یعنی اللہ کو انبیاء اور صالحین امت کی ذات کا واسطہ دینا، کسی مخلوق کی پناہ مانگنا، غیر اللہ کی قسم کھانا، زیارۃ القبور میں بدعات روا رکھنا وغیرہ غیر پسندیدہ اعمال ہیں۔ شیخ اور ان کے پیرو کار جوش اصلاح میں افراط کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے خلاف پھیلائی ہوئی اکثر باتیں خلاف واقعہ ہیں۔ شیخ کے معاصرین نے آپ کو بدنام کرنے کے لیے مشہور کیا کہ اصل میں یہ نبوت کا دعویٰ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اخفا سے کام لیا۔ نیز یہ کہ وہ حدیثوں کو نہیں مانتے یا یہ کہ وہ اہل قبلہ کی تکفیر کرتے ہیں اور مسلمانوں سے قتال جائز سمجھتے ہیں وغیرہ، حالانکہ ان میں سے کوئی بات بھی درست نہیں۔ مجموعی طور پر شیخ کی تحریک اصلاحی تھی اور اس نے اہل عرب میں نئی بیداری پیدا کی۔

علامہ اقبال نے خطبات میں ان کی اصلاحی خدمات کو سراہا ہے۔ اسی طرح اسلام اور قادیانیت کے سلسلہ میں پنڈت نہرو کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے محمد بن عبدالوہاب کو جدید اسلام میں زندگی کی پہلی تڑپ قرار دیا ہے:۔ دیکھیے:۔

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ مترجمہ سید نذیر نیازی صفحات: ۲۳۵

حرف اقبال مرتبہ لطیف احمد شروانی صفحات: ۱۴۸

کتاب التوحید از محمد بن عبدالوہاب
محمد بن عبدالوہاب - ایک مظلوم اور بدنام مصلح از مسعود عالم ندوی -

سید علی محمد باب[1]، بابی، بابیت

سید علی محمد جو بعد میں باب کے لقب سے مشہور ہوئے - ۲۰ر اکتوبر ۱۸۱۹ء کو جنوبی ایران کے شہر شیراز میں پیدا ہوئے - شیخ محمد نامی ایک شخص سے عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی - باب کے والد تاجر تھے - پچیس سال کی عمر میں ۲۳ر مئی ۱۸۴۴ء کو انہوں نے اعلان کیا کہ خدا نے انہیں باب کے مقام پہ فائز کیا ہے یعنی علی محمد شیرازی ایک عظیم الشان شخص کے فضل کا ذریعہ ہیں جو ابھی پردہ جلال میں مخفی تھا - باب کے پہلے اٹھارہ شاگرد اور خود باب مل کر "حروف حی" کہلاتے ہیں - انہوں نے تمام شاگردوں کو اپنی آمد کی خبر دینے کے لیے ایران و ترکستان میں پھیلا دیا - اور خود دسمبر ۱۸۴۴ء میں مکہ معظمہ میں حج کے موقعہ پہ اپنی آمد کا اعلان کیا - شیعہ علماء نے ان کی شدید مخالفت کی، حالانکہ وہ امام غائب یا امام مہدی کے ظہور کے منتظر تھے، حکومت نے بھی باب کی سرگرمیوں کا شدت سے نوٹس لیا اور بابیوں پر سختی کی - ۹ر جولائی ۱۸۵۰ء کو باب اور اس کے چند ساتھیوں کو تبریز کے فوجی چوک میں گولی سے اڑا دیا گیا - باب کی لاش سالہا سال تک ایران میں چھپائے رکھنے کے بعد فلسطین میں کوہ کرمل پر دفن کر دی گئی - باب کا کلام کئی ضخیم کتابوں پر مشتمل ہے، بابی عقیدے کے مطابق باب نے جس آنے والے کی بشارت دی تھی - وہ بہاء اللہ تھے - جن کا اصل نام میرزا حسین علی تھا اور جو حکومت ایران کے ایک وزیر میرزا عباس نوری کے سب سے بڑے بیٹے تھے - اور ۱۲ر نومبر ۱۸۱۷ء کو تہران میں پیدا ہوئے میرزا عباس علی باب

۱؎ اقبال نے اپنے اردو مجموعہ کلام "ضرب کلیم" (جولائی ۱۹۳۶ء) میں محمد علی باب لکھا ہے جبکہ اصل نام علی محمد باب ہے - (صفحہ ۴۲)

کے ابتدائی شاگردوں میں سے تھے، ۱۸۵۲ء میں ایک بابی نوجوان صادق نامی نے بادشاہ پر حملہ کر دیا جو ناکام رہا اور بابیوں پر شاہی عتاب نازل ہوا۔ میرزا حسین بھی گرفتار ہوئے، چار مہینے کے بعد بغداد کی طرف جلا وطن کر دیئے گئے۔ میرزا یحییٰ المعروف بہ صبح ازل کی آمد سے بابیوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ اسی دوران ۲۱ر اپریل ۱۸۶۳ء کو مرزا حسین علی نے بغداد کے نزدیک ایک مقام نجیب بات کے باغ میں باب کی پیش گوئی اور بشارت کا مصداق "من یظہرہ اللہ" قرار دیا۔ اس باغ کا نام بعد میں باغِ رضوان اور یہاں قیام کے بارہ دنوں (۲۱ر اپریل تا ۲ر مئی ۱۸۶۳ء) کو عید رضوان کہا گیا۔ میرزا حسین علی قسطنطنیہ اور ایڈریانوپل میں قید رہے۔ ۳۱ر اگست ۱۸۶۸ء کو انہیں عکہ اور مرزا یحییٰ کو جزیرہ قبرص بھیج دیا گیا۔ بعد میں رہائی ملی۔ مرزا حسین علی ۲۸ر مئی ۱۸۹۲ء کو بخار میں مبتلا ہو کر فوت ہوئے۔ آپ کی تصانیف الواح کہلاتی ہیں اور بہاء اللہ آپ کا خطاب ہے۔ بہاء اللہ کے سب سے بڑے فرزند عباس آفندی ۲۳ر مئی ۱۸۴۴ء کو پیدا ہوئے اور بعد میں عبدالبہا کہلائے۔ لوگوں کی شکایات پر حکومت عثمانیہ نے عبدالبہاء اور ان کے ساتھیوں کی نظر بندی سخت کر دی۔ تحقیقات کے نتیجے میں الزامات سچے ثابت ہوئے لیکن اسی عالم میں ترکی میں انقلاب آگیا اور ستمبر ۱۹۰۸ء میں انہیں قید سے نجات مل گئی۔ اگست ۱۹۱۱ء میں یورپ کا سفر اختیار کیا۔ جنگِ عظیم اوّل کے بعد ۲۷ر اپریل ۱۹۲۰ء کو انگریزی سرکار نے سر کا خطاب دیا۔ اسی سال ۲۸ر نومبر کو فوت ہوئے۔

بابی مذہب کا تمام تر دارو مدار مہدی منتظر کے عقیدے پر ہے۔ جسے شیعہ معاشرے میں فروغ حاصل ہوا۔ باب نے اسلام کی تعلیمات کو مسخ کر کے ایک نئے مذہب کے روپ میں پیش کیا۔ جسے وہ ترقی یافتہ اور گذشتہ مذاہب کو مکمل کرنے والا قرار دیتا ہے۔ بابی عقیدے کے مطابق باب، بہاء اللہ

وغیرہ نعوذ باللہ حضورؐ سے بڑی شخصیتیں ہیں۔ نیز اسلام جدید دور کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ ان کے نزدیک قیامت آفتاب حقیقت کے ظہور، بہشت روحانی زندگی اور خوشی، دوزخ روحانی موت کا نام ہے، مُردوں کو زندہ کرنا قبور غفلت و جہالت میں خوابیدہ انسانوں کو روحانی زندگی عطا کرنا ہے۔ ان کے نزدیک شر کا کوئی وجود نہیں بلکہ یہ عدم محض ہے۔ بابی مذہب کی تقویم، مہینے، سال، عیدین، تہوار بھی مختلف ہیں۔

اہل باب کا انتظام محفل روحانی کے سپرد ہے، شادی کے لیے فریقین کے والدین کی رضامندی ضروری ہے اور بوقت ضرورت محفل روحانی کو اطلاع دے کر علیحدگی ہو سکتی ہے۔ اس مذہب کے پیروکار (بابی) اپنے آپ کو اہلِ بیان کہتے ہیں، اہل تشیع کی مخالفت پر اس فرقے نے انتہا پسند سیاسی فرقے کی حیثیت اختیار کر لی، اس مذہب کے دو فرقے ازلی اور بہائی بن گئے۔ ازلی، صبح ازل اور بہائی بہاء اللہ سے متعلق تھے بہائی زیادہ تعداد میں ہیں، باب ہی کی ایک مریدہ قرۃ العین طاہرہ تھی جو اپنے حسن و جمال اور شاعری کے لیے مشہور تھی۔ اقبال کے نزدیک اس مذہب کی روح مجوسی ہے! اس لیے وہ اس کو انسانی عظمت کے تصور کے منافی اور مسلمانوں کے حق میں تباہ کن سمجھتے ہیں۔ اقبال نے "ضرب کلیم" کے صفحہ ۴۲ پر محمد علی باب کے زیرِ عنوان اس کے طرزِ استدلال کا خاکہ اڑایا ہے۔

علی محمد باب اور اس کی مذہبی تحریک پر مبسوط مقالہ دیکھیے:۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۳ صفحات : ۷۸۴-۷۹۰۔

بہاء اللہ و عصر جدید مصنفہ جے ای ایسلمنٹ مترجم عباس علی بٹ، ۱۹۴۵ء دہلی۔

احمدیت (قادیانیت)

ایک مذہبی جماعت جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی اجرائے

نبوت کی قائل ہے۔ اس کے بانی مرزا غلام احمد ۱۸۳۷ء میں قادیان (ضلع گورداسپور، پنجاب) میں پیدا ہوئے، عربی و فارسی وغیرہ کی مروجہ تعلیم حاصل کر کے کچھ عرصہ سرکاری ملازمت کی۔ بعد میں ملازمت ترک کر کے غیر مسلموں کے ساتھ مباحثے شروع کیے، والد کی وفات پر مباحثوں میں زیادہ حصہ لینے لگے۔ اسی سلسلے میں "براہین احمدیہ" شائع کی جس کو عام مسلمانوں نے بہت پسند کیا۔ اس کے بعد ۱۸۹۱ء کے قریب مرزا صاحب نے مجدد، محدث، مہدی، مسیح موعود، ظلّی، بروزی، عکسی، مجازی، نامکمل اور لغوی نبی ہونے کا دعویٰ کیا اور مرزا بشیر الدین احمد کے بقول ۱۹۰۱ء میں کامل نبی ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس کے ساتھ انہوں نے بے شمار عجیب و غریب پیش گوئیاں کیں اور اپنے آپ کو ملہم من اللہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اس سے ہندوستانی مسلمانوں میں شدید انتشار پھیلا۔ مرزا صاحب نے انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جہاد و قتال فی سبیل اللہ کو حرام قرار دیا، انگریزی حکومت کو سایہ رحمت قرار دیا۔ اپنے عقائد کے لیے انہوں نے تحریف قرآن سے بھی گریز نہیں کیا۔ مرزا صاحب نے ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو بمرض ہیضہ بمقام لاہور وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد حکیم نور الدین کو جانشین قرار دیا گیا۔ ۱۹۱۴ء میں ان کی وفات پر بشیر الدین محمود احمد جانشین بن گئے۔ جس پر قادیانی دو گروہوں میں بٹ گئے۔

۱۔ **قادیانی**:۔ جو بانی احمدیت کو نبی مانتے اور اپنے علاوہ دیگر تمام مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں۔

۲۔ **لاھوری**:۔ جو مرزا غلام احمد کو مجدد تسلیم کرتے اور دوسرے مسلمانوں کو کافر نہیں قرار دیتے۔

(اقبال شروع شروع میں قادیانی حضرات کے مذہبی اور تبلیغی جوش و خروش کے بڑے قائل تھے۔ لیکن بعد کے ادوار میں بعض ایسے واقعات (کشمیر کمیٹی وغیرہ)

پیش آئے جن سے علامہ پر واضح ہوا کہ احمدی یا قادیانی جماعت کا وجود اسلام کے لیے زبردست چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ نے متعدد بیانات شائع فرمائے۔ آپ نے مدلل طریقے سے ثابت کیا کہ اللہ کا دین مکمل ہو چکا ہے اور انسانیت ارتقار کے ایک ایسے مرحلے میں داخل ہو گئی ہے جہاں اللہ نے وحی کی حدود میں رہ کر عقل کی کارفرمائی کو موقع عطا فرمایا۔ اب جو کوئی نبوت کا دعویٰ کرتا ہے وہ اللہ کے اس عظیم احسان کو ٹھکرانے اور ملت میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس سلسلے میں آپ کے بیانات ملاحظہ کیجئے:۔

حرفِ اقبال مرتبہ لطیف احمد شروانی صفحات: ۱۱۳-۱۶۱

قادیانی مذہب کی حقیقت اور ملت اسلامیہ پر اس کے اثرات بد کے مطالعہ کے لیے مندرجہ ذیل مآخذ سے رجوع کیجئے:۔

۱:۔ قادیانی مذہب از پروفیسر الیاس برنی۔

۲:۔ قادیانی مسئلہ از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

۳:۔ قادیانیت از ابوالحسن علی ندوی۔

۴:۔ ختم نبوت از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

شیخ نور محمد۔ پدرِ مرشدِ اقبال

شیخ نور محمد جنہیں علامہ اقبال کے پدرِ بزرگوار بننے کا شرف حاصل ہے، ایک ایسے کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو کوئی اڑھائی سو سال پیشتر حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکا تھا۔ یہ خاندان برہمن تھا اور اس کی گوت سپرو تھی۔ اس خاندان کا وطن کشمیر میں موضع چکو پرگنہ آدرن (تحصیل کولگام) تھا۔ بعض وجوہ کی بناء پر اس خاندان کو وطنِ مالوف سے ہجرت کرنا پڑی تو اس کے ایک رکن شیخ محمد رفیق اپنے بعض دیگر بھائیوں کے ساتھ سیالکوٹ میں آباد ہو گئے۔ شیخ نور محمد انہی شیخ محمد رفیق کے فرزندِ ارجمند تھے۔ بعض لوگوں کے خیال میں اقبال کے والد بزرگوار کا نام شیخ نور محمد نہیں بلکہ حاجی نور محمد تھا۔ جیسا کہ لیفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید نے اپنے مقالے **New Light on the Early Life of Iqbal** میں علامہ اقبال کی پہلی شادی کے نکاح نامے کے حوالے سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

"Two things are worth discussing at this stage regarding the father of Iqbal, Firstly, he has signed as Haji. Secondly, his signatures do not reflect high education or even a high state of literacy. In fact, some one else has written his name and parentage for him in clear letters, below which he has put his signature, unlike the others who have signed in their own hand, which fact has been stated very clearly by each signatory. It is certain he was not literate in the sense we understand it today. But there is also no doubt that he was a thinker, and could later enjoy the thought in Iqbal's poetry. It is also possible he may have acquired a knowledge of reading later on.

We have said above that he had also performed the Haj and hence had signed himself as a Haji. This must have been when Iqbal, was a student in the school. It is just likely, that he and Iqbal's father-in-law may have performed the Haj during the same

year; for the Khan Bahadur was also in Arabia in those days. And as Haj was then not a hasty affair, the two of them may have had ample opportunity to stay with each other for quite sometime, and become well-acquainted to acquire a lasting friendship. It may have been the result of this friendship which later brought about this marriage.

Iqbal's father, it is further established had sufficient money to proceed on a pilgrimage. This used to be a prolonged affair, as I have already said above. It was very unlike today when the aeroplanes and automobiles had reduced the period of performance considerably. Although the time were cheap, the duration of the total ceremony was much longer,, and hence the expenses must also have been great. However, this may not be true. But one thing is again certain, and that he must have left sufficient money for the maintenance of his family. This shows his sound financial position. He was also a well-to-do-man.

On a careful look at the signatures of Iqbal's father on the document we see that he has put down his parentage as Hatim Mir. It is customary amongst the Kashmiri people to put down their sub—caste after their names, *e.g.;* Rajab Dar, Aslam Butt, Kamal Wain, etc. His signing as the son of Hatim Mir makes us ponder whether he was a Sapru, as Iqbal used to call himself, or he was actually a Mir. It is rather difficult to reconcile Iqbal associating himself with an ancestry of Brahmins, against this assertion of his father that he was the son of a Mir. The Mirs in Kashmir are sprung from the stock of Mughals.

It is further interesting to note that in the first line of the body of the document, (Picture No. 1) Iqbal's parentage is mentioned as Iqbal, s/o Nur Muhammad Alias Sheikh Nathu, caste Sheikh whereas down below above his own signature is says, "Haji Nur Muhammad, s/o Hatim Mir, caste but an honorific title; nor two places the caste and the sub-caste have been confused by the scribe. Sheikh is not a caste but an honorific title; nor is Kashmiri a caste. It is a nationality. the real sub-caste as we judge from the name of Iqbal's grand-father was Mir. But it remains to be further ascertained whether Iqbal was a Mir or a Sapru. According to his father's statement he was Mir and not a Sapru."

خواجہ عبدالرشید نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں جو دلائل پیش کیے ہیں وہ سب مفروضے ہیں اور ان کی بنیاد یہ غلط فہمی ہے کہ علامہ کے نکاح نامہ پر گواہوں کے دستخطوں میں ایک صاحب نے دستخط کرتے ہوئے اپنا نام حاجی نور محمد ولد حاتم میر ظاہر کیا ہے۔ لہٰذا یہی صاحب علامہ کے والد ہیں حالانکہ خواجہ صاحب نے خود ہی تسلیم کیا ہے کہ متن میں اقبال کی ولدیت شیخ نور محمد عرف شیخ نتھو ہی ظاہر کی گئی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دیگر سرکاری دستاویزات میں بھی یہی نام لکھا ہوا ہے۔ جہاں تک حاجی نور محمد کا تعلق ہے یہ ایک دوسرے صاحب ہیں جو اقبال کے ایک قرابت دار بزرگ تھے۔ بہر حال یہ امر ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ علامہ اقبال کے والد ماجد کا نام شیخ نور محمد عرف شیخ نتھو ولد شیخ محمد رفیق تھا نیز ان کی گوت سپرو تھی۔[۲]

ولادت اور بچپن

علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد، شیخ محمد رفیق کے بڑے صاحبزادے تھے جو ۱۸۳۵ء کے لگ بھگ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ چونکہ آپ کی پیدائش سے قبل والدین کے یہاں دس لڑکے یکے بعد دیگرے پیدا ہو کر فوت ہو گئے تھے اس لیے جب نور محمد پیدا ہوئے تو اس زمانے کے مطابق بے اولاد والدین نو مولود کی خوشی میں جو رسمیں ادا کرتے تھے وہ ادا کی گئیں، منتیں مانی گئیں اور دعائیں کروائی گئیں۔ آپ کی ناک چھید دی گئی اور اس میں ایک چھوٹی سی نتھ پہنا دی گئی اور اس طرح اپنے زعم میں قدرت کے سامنے لڑکے کو لڑکی بنا کر پیش کیا گیا اور لڑکپن میں کئی سال تک شیخ نور محمد اس نتھ کو پہنے پھرتے رہے یہی وجہ ہے کہ ان کا عرف نتھو

ؔ۱ Memories of Iqbal P.P. [illegible]

ؔ۲ روزگار فقیر، جلد دوم، صفحہ ۱۱۶ - ۱۲۰۔

پڑ گیا[1] لیکن بعد ازاں آپ کے احترام کے پیش نظر خاندان اور باہر کے لوگ آپ کو "میاں جی" کہنے لگے۔

تعلیم

مولانا عبدالمجید سالک نے شیخ نور محمد کے بارے میں لکھا ہے کہ آپ پڑھے لکھے نہ تھے[2] یہ درست ہے کہ آپ نے کسی مکتب یا اسکول میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن یہ بات بھی درست نہیں کہ آپ سرے سے پڑھنا لکھنا ہی نہیں جانتے تھے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ شیخ نور محمد اپنے صاحبزادے کی اردو فارسی کتابیں جو ان کی زندگی ہی میں شائع ہو گئی تھیں قریب قریب روزانہ پڑھتے نظر آتے تھے اگرچہ انہیں پڑھنے میں دقت محسوس ہوتی تھی لیکن بعض مقامات جب ان کی سمجھ میں آجاتے تھے تو ان کی آواز میں کپکپی اور رقت پیدا ہو جاتی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہو جاتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ معمولی لکھ پڑھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہ اپنے دستخط بھی کر لیتے تھے، گو یہ دستخط بہت سادہ انداز میں ہوتے تھے تاہم یہ امر بھی بہر حال اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ انہیں لکھنے پڑھنے سے مس ضرور تھا۔ "اسرار خودی" جو علامہ اقبال کی اولین شعری تصنیف ہے اور فارسی زبان میں ہے پڑھ کر بہت متاثر ہوتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فارسی زبان کی شد بد بھی رکھتے تھے[3]

موزونی طبع

میاں جی شاعر نہ تھے البتہ طبیعت موزوں پائی تھی۔ علامہ اقبال کی والدہ امام بی بی جب فوت ہوئیں تو میاں جی کو اپنی رفیقۂ حیات کے یوں بچھڑ جانے کا

---

[1] روزگار فقیر، جلد اول، صفحہ ۱۹۶۔

[2] ذکر اقبال، صفحہ ۸۔

[3] روزگار فقیر، جلد اول، صفحہ ۱۹۵۔

شدید صدمہ ہوا۔ ایک مرتبہ اپنے ایک پوتے کو بلایا اور فرمایا "جو کچھ میں بولتا جاؤں اسے لکھتے جاؤ اور پھر میرے لکھوائے ہوئے کاغذ کو اپنے چچا کے پاس بھیج دو۔ میاں جی نے سوچ سوچ کر دو نشستوں میں دس بارہ شعر قلمبند کرائے جن کے تمام مصرعے وزن میں تھے۔ ایک شعر یہ تھا:۔

یہ تنہا زندگی پیری میں نصف الموت ہوتی ہے
نہ کوئی ہم سخن اپنا نہ کوئی راز داں اپنا[1]

یہ اشعار بعد ازاں علامہ کو بھجوا دیئے گئے۔ انہوں نے کچھ عرصہ بعد اپنی نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" کاتب سے خوشخط لکھوا کر میاں جی کے لیے ارسال کر دی۔ میاں جی اس نظم کو اکثر پڑھا کرتے اور پڑھنے میں گریہ طاری ہو جاتا اور زار و قطار روتے جاتے۔[2]

کسب معاش

سر شیخ عبدالقادر فرماتے ہیں "اقبال کے والد ایک صوفی منش بزرگ تھے مگر ان کا رنگِ تصوف ایسا نہ تھا کہ ان کو زندگی کے روزمرہ فرائض سے بے پروا کر دے۔ ساری عمر اپنی دس انگلیوں سے روزی کے لیے "دل بہ یار و دست بہ کار"، پر ان کا عمل تھا۔ دل خدا کی طرف ہاتھ کام کی طرف لگے رہتے تھے"۔[3] شروع شروع میں آپ کی مالی حالت اچھی نہ تھی لیکن آہستہ آہستہ آپ کی محنت اور نیک نیتی کے بہتر نتائج برآمد ہونے لگے۔ اس سلسلے میں سیّد نذیر نیازی راوی ہیں کہ ایک دن علامہ اقبالؒ اپنے خاندان کی خوشحالی کے پس منظر پر روشنی ڈال رہے تھے تو ارشاد فرمایا:۔

"میرے والد بزرگوار ایک روز گھر آ رہے تھے، ہاتھ میں رومال

---

[1] روزگار فقیر، جلد دوم، صفحہ ۱۲۶۔

[2] ایضاً، جلد دوم، صفحہ ۱۲۶-۱۲۷۔

[3] سیرت اقبال، صفحہ ۲۴ نیز ملفوظات، صفحہ ۱۲۔

تھا۔ روماں ہیں تھوڑی سی مٹھائی اٹھائے راہ میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کتا بھوک کے مارے دم توڑ رہا ہے اس کی یہ حالت دیکھ کر ان سے نہ رہا گیا، مٹھائی سمیت رومال اس کے آگے ڈال دیا۔ کتے نے مٹھائی کھانا شروع کر دی۔ مٹھائی کھا چکا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے پانی کی طلب ہے والد ماجد نے اسے کسی نہ کسی طرح پانی بھی پلا دیا۔ رات کو سوئے تو خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مکان ہے جس میں مٹھائی کے طبق ہی طبق رکھے ہیں۔ صبح آنکھ کھلی تو اس احساس کے ساتھ کہ یہ اس نیک عمل کا ثمرہ تھا جو کل ان سے سرزد ہُوا۔ چنانچہ اس روز سے انہیں یقین ہو گیا کہ ہمارے دن پھرنے والے ہیں" [1]

"ایک مرتبہ اسی خاندان (اقبال کے پردادا کے پیر کا سید خاندان) کا ایک فرد والد ماجد کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ آپ دھسوں (کشمیری اونی کمبلوں) کی تجارت کیوں نہیں کرتے؟ اس زمانے میں معمولی دھسوں کی قیمت دو روپیہ فی دھسہ سے زیادہ نہ تھی۔ والد ماجد نے کوئی دو چار سو دھسے تیار کیے تو قدرت خدا کی ایسی ہوئی کہ سب کے سب اچھے داموں پر بِک گئے حالانکہ فی دُھسہ آٹھ آنے سے زیادہ لاگت نہیں آتی تھی۔ وہ چار سو دُھسے فروخت ہو گئے تو کافی روپیہ جمع ہو گیا۔ بس یہ ابتدا تھی ہمارے دن پھرنے کی۔ پھر بھائی صاحب بھی ملازم ہو گئے" [2]

سرکاری ملازمت

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ نے سرکاری ملازمت بھی کی۔ لیکن یہ ملازمت

---

[1] اقبال کے حضور، جلد اول، صفحہ ۱۶۹۔
[2] اقبال کے حضور، جلد اول، صفحہ ۱۷۰۔

آپ نے اس وقت ترک کر دی جب آپ نے علامہ اقبال کی ولادت سے متعلق ایک رات مشہور خواب دیکھا۔ اور اس کے بعد اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ عبداللہ انور بیگ لکھتے ہیں:-

"The father maintained that it (dream) was a happy omen and considered that his son would rise to be a great man and would devote himself to the service of Islam so he gave up his post in a government office and opened a milliner's shop so that he could not attain this object, where he was, as he exposed to the temptation of bribes.

اس بیان میں کسی سرکاری ملازمت کی تصریح کسی غلط فہمی کا شاخسانہ ہے۔

اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ایسے سرکاری افسر کے ملازم تھے جس کی کمائی میں رشوت کا شبہ ممکن تھا حالانکہ خود ان کی تنخواہ ہر قسم کے اشتباہ سے پاک تھی۔ لیکن تقویٰ شعاری کا تقاضا تھا کہ یہ ملازمت بھی ترک کر دی جائے۔

مولانا عبدالمجید سالک اس ملازمت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

"سیالکوٹ میں ایک صاحب ڈپٹی وزیر علی بلگرامی مدتوں مقیم رہے۔ ان کے نام سے ایک محلہ بھی موسوم ہوا۔ انہوں نے ایک باغ لگوایا جو ڈپٹی کے باغ کے نام سے مشہور ہوا۔ رفاہ عام کے لیے ایک حوض بھی بنوایا۔ بسنت کے موقع پر ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ میلہ بھی ڈپٹی وزیر علی ہی نے جاری کیا تھا۔ شیخ نور محمد کو سب سے پہلے انہی ڈپٹی صاحب نے اپنے ہاں پارچہ دوزی پر ملازم رکھا تھا اور سنگر، سینے کی مشین منگوا کر دی تھی جو اس زمانے میں نادر چیز تھی۔ معتبر حضرات کا بیان ہے کہ شیخ نور محمد کی اہلیہ (والدۂ علامہ اقبال) ان کی تنخواہ میں سے ایک حبہ نہیں لیتی تھیں کیونکہ ان کے نزدیک ڈپٹی وزیر علی کی آمدنی

ے The poet of the East p-7

کا غالب حصہ شرعاً جائز نہ تھا۔ چنانچہ تھوڑی ہی مدت کے بعد شیخ نور محمد نے ملازمت ترک کر دی اور برقعوں کی ٹوپیاں سینے لگے۔ یہ ٹوپیاں اس قدر خوشنما اور مضبوط ہوتی تھیں کہ قلیل مدت کے اندر بے حد مقبول عام ہو گئیں۔ یہاں تک کہ شیخ صاحب کو متعدد خیاط ملازم رکھنے پڑے۔ شیخ صاحب کے ضعیف ہو جانے پر یہ دکان ان کے داماد غلام محمد نے سنبھالی لیکن کچھ مدت بعد وہ بھی الگ ہو گئے اور دکان بند ہو گئی"۔[۱]

جس زمانے میں اقبال پیدا ہوئے شیخ نور محمد کا ٹوپیوں کا کام عروج پر تھا بقول خالد نظیر صوفی آپ کی دکان کی بنی ہوئی مردانہ ٹوپیاں اور کلاہ پشاوزنک مقبول خاص و عام تھے اور اسی کاروبار کی وجہ سے آپ کے خاندان کو سیالکوٹ میں "ٹوپیانوالے" کہہ کر پکارتے اور پہچانتے تھے۔ آج تک یہ نام زبان زدِ عام ہے۔ اس کے علاوہ سیالکوٹ میں سب سے پہلے کپڑے سینے کی مشین آپ ہی نے خریدی جسے سارا شہر دیکھنے کے لیے آتا تھا اور اس طرح آپ کا نام "کلّہ والے" بھی پڑ گیا۔[۲]

ان اقتباسات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شیخ نور محمد نے اپنے آبائی پیشے دھسوں اور شالوں وغیرہ کی تجارت چھوڑ کر کپڑے سینے سلانے اور ٹوپیاں بنانے کا کام اپنا لیا تھا۔ اس سلسلہ میں ڈپٹی وزیر علی نے شروع شروع میں آپ کی سرپرستی کی جن کی وساطت سے سیالکوٹ میں غالباً پہلی مرتبہ سنگر سلائی کی مشین آئی۔ ہو سکتا ہے کہ جب آپ ڈپٹی صاحب سے الگ ہوئے ہوں تو آپ نے اپنی مشین بھی منگا لی ہو۔ تاہم خالد نظیر صوفی کا یہ خیال کہ کپڑے سینے کی مشین سب سے پہلے آپ ہی نے خریدی محلِ نظر ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا عبدالمجید سالک نے سیالکوٹ کے بعض معتبر حضرات سے معلومات حاصل کر کے جو کچھ بیان کیا ہے درست یا

---

[۱] ذکرِ اقبال، صفحہ ۸-۹ [۲] اقبال درونِ خانہ، صفحہ ۱۵۸ (حاشیہ)

قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

تصوّف و سلوک

علامہ اقبال کے والد کو تصوف و سلوک سے گہرا تعلق تھا۔ خلیفہ عبدالحکیم بیان کرتے ہیں :۔

"اقبال کے والد گو صاحبِ ثروت نہ تھے لیکن اپنے شہر میں دل و دماغ کی پاکیزگی کی وجہ سے بہت قابلِ احترام سمجھے جاتے تھے۔ کوئی بیس برس کا عرصہ ہوتا ہے جب کہ انار کلی والے مکان میں مجھے ان سے شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ اس وقت اقبال کی شہرت تمام ملک میں پھیل چکی تھی اور ان کے والد اقبال کے کمال پر بجا طور پر فخر کرتے تھے ان پر تصوف کا رنگ بہت غالب تھا یہی رنگ اقبال میں علم و شعر کے جوہروں کے ساتھ مل کر اور بھی زیادہ گہرا ہو گیا اور اس کی بدولت اقبال کو عطار، سنائی اور رومی کی صف میں جگہ ملی۔" [1]

اگرچہ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے لیکن چونکہ تصوّف کے ساتھ فطری لگاؤ رکھتے تھے اس لیے اصحابِ علم و فضل کی محفلوں میں ضرور شرکت کرتے اور ان کے افکار سے فیض یاب ہوتے تھے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ وہ نمود و نمائش کے کچھ زیادہ قائل نہ تھے ان کی اسی خصوصیت کی بناء پر بعض ہم عصر بزرگ انہیں "اَن پڑھ فلسفی" کہا کرتے تھے حتیٰ کہ مولانا سید میر حسن کے صاحبزادے سید ذکی شاہ کا بیان ہے کہ بعض لوگ تصوف کی کتابوں کے مشکل حصوں کی تشریح کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے [2]

ابن عربی سے عقیدت

شیخ نور محمد کو بلند پایہ صوفی اہلِ قلم کی باطنی واردات اور صوفیانہ تحقیقات

---

[1] آثارِ اقبال، صفحہ ۱۸۔ [2] ذکرِ اقبال، صفحہ ۸۔

سے آگاہ ہونے کا بے حد شوق تھا۔ اس مقصد کے لیے جہاں وہ شہر کے دیگر اہلِ علم و فضل لوگوں کی خدمت میں حاضر ہوتے وہاں انہوں نے اہلِ علم کو جمع کرنے کا خود بھی اہتمام کر رکھا تھا۔ آپ ایسی محفلیں آراستہ کرتے جن میں بزرگ صوفیاء کی تصانیف پڑھی جاتیں اور اہلِ ذوق بقدرِ ظرف استفادہ کرتے تھے۔ علامہ اقبال نے شاہ سلیمان پھلواروی (رحمۃ اللہ علیہ) کے نام اپنے ۲۴ فروری ۱۹۱۶ء کے مکتوب میں ایسی ہی مجالس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"میرے والد کو "فتوحات" اور "فصوص" سے کمال توغل رہا ہے اور چار برس کی عمر سے میرے کانوں میں ان (شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رح) کا نام اور ان (کی) تعلیم پڑنی شروع ہوئی۔ برسوں تک دونوں کتابوں کا درس ہمارے گھر میں رہا۔ گو بچپن کے دنوں میں مجھے ان مسائل کی سمجھ نہ تھی تاہم محفلِ درس میں ہر روز شریک ہوتا۔" [۲]

اسی طرح ڈاکٹر سعید اللہ نے علامہ اقبال کا ایک ملفوظ یوں نقل کیا ہے:۔

"میرے والد صاحب کی دکان پر ابن عربی رح کی فصوص الحکم باقاعدہ پڑھی جاتی تھی۔" [۳]

گویا ایسی علمی مجالس کبھی ان کے گھر اور کبھی دکان پر منعقد ہوتیں اور وہ ذاتی طور پر ان محفلوں سے حتی الامکان استفادہ کرتے تھے۔

بیعت

شیخ نور محمد کے صوفیانہ رجحانات کا جب ذکر ہوتا ہے تو عموماً یہ سوال سامنے آتا ہے کہ انہوں نے منازلِ سلوک کس بزرگ کی رہنمائی میں طے کیں؟ اس بارے میں کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ البتہ مولانا سالک نے علامہ اقبال کی

---

[۲] انوارِ اقبال، صفحہ ۱۷۸۔ [۳] ملفوظات، صفحہ ۱۱۱۔

صوفیانہ نسبت کے ضمن میں لکھا ہے :

"پیر جماعت علی شاہ صاحب علی پوری نے مئی ۱۹۳۵ء میں بیان کیا کہ اقبال نے رازداری کے طور پر مجھے کہا تھا کہ میں اپنے والد مرحوم سے بیعت ہوں۔ اقبال کے والد کے پاس ایک مجذوب صفت درویش آیا کرتے تھے وہ انہی سے بیعت تھے۔ ان کا سلسلہ قادریہ تھا۔"[1]

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ سلسلہ قادریہ میں بیعت تھے لیکن خود آپ نے کسی کو مرید بنانے سے ہمیشہ گریز کیا بلکہ اس طرح زندگی بسر کی کہ کسی کو ان کی روحانی صلاحیتوں سے آگاہی حاصل نہ ہو سکے۔ البتہ علامہ اقبال کو انہوں نے روحانی فیض ضرور پہنچایا اور اس کا اعتراف خود علامہ اقبال نے بھی فرمایا۔ شیخ نور محمد کی بعض کرامات کی تفصیل مختلف ذرائع سے ہم تک پہنچی ہے۔ صرف ایک دو کے ذکر پہ اکتفا کی جاتی ہے :

کرامات

علامہ اقبال کی عمر گیارہ برس تھی۔ ایک رات انہوں نے کچھ شور سنا۔ ان کی نیند اڑ گئی انہوں نے اٹھ کر دیکھا کہ ان کی والدہ سیڑھیوں سے اترتی ہوئی آ رہی ہیں اقبال بھی ان کے پیچھے ہو لیے۔ والدہ کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑی ہو گئیں جس میں سے نور سا پھوٹتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اقبال بھی ان تک پہنچے اور باہر دیکھنے لگے۔ انہیں اپنے والد کھلی جگہ بیٹھے نظر آئے اور روشنی کا ایک ہالہ ان کے گرد و پیش چمک رہا تھا۔ جب اقبال اپنے والد کی طرف جانے لگے تو انہیں والدہ نے روک دیا اور واپس لا کر بستر پہ سلا دیا۔ دوسرے دن وہ اپنے والد سے رات کا واقعہ معلوم کرنے کے لیے گئے تو ان سے پہلے والد صاحب والدہ سے ہی باتیں کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس عالم وجد میں انہوں نے دیکھا کہ کابل سے ایک

---

[1] ذکر اقبال، صفحہ ۳۴۸۔

قافلہ جو شہر کو آ رہا تھا وہ سخت مصیبت زدہ ہے۔ بنا بریں وہ ہمارے شہر سے پچیس میل دُور رُکنے پر مجبور ہو گیا اس مجبوری کی وجہ قافلہ کا ایک بیمار شخص ہے اب مَیں اس کی مدد کے لیے جانا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ان کے والد کوئی چیز لے کر قافلے کی طرف روانہ ہو گئے اقبال بھی ان کے ہم رکاب تھے۔ قافلہ والے جلد مل گئے تاہم وہ سخت پریشان تھے ان کی حالت ان کی امارت کی غماز تھی۔ اقبال کے والد فوراً بیمار شخص کے پاس پہنچے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مریض کا جسم کسی خطرناک مرض سے اندر ہی اندر گھل رہا ہے۔ والد صاحب نے اس کے اہل خاندان کو تسلی دی اور مٹی کی طرح کی کوئی چیز اس کے متاثرہ جسم پر مل دی۔ اقبال کو کسی حیرت ناک نتیجہ کی توقع نہ تھی لیکن ۲۴ گھنٹوں کے اندر مریض صحتیاب ہو گیا۔ اہل قافلہ نے والد صاحب کی خدمت میں معقول ہدیہ پیش کیا لیکن انہوں نے لینے سے قطعی انکار کر دیا۔[1]

شیخ نور محمد اکثر ململ کا کرتہ پہنتے تھے۔ خاندان اور خاندان سے باہر کے کئی آدمی ان کے اترے ہوئے کرتے لے جاتے اور نومولود بچّے کو پہنا دیتے ان کے خیال میں اس طرح بچہ میاں جی کی طرح نیک اور خوش نصیب ہو گا اور طویل عمر پائے گا۔ جب کرتے کی مانگ آتی تو گھر کی کوئی خاتون موصوف سے تذکرہ کرتیں تو میاں جی اس پر ہنس کر فرماتے " اچھا ایک شریک اور آگیا۔ " اللّٰھم زد فزد "۔ یہ کہہ کر اپنا کرتہ دے دیتے۔[2]

اسم اعظم

شیخ اعجاز احمد (برادرزادۂ اقبال) نے ایک مرتبہ آپ سے " اسم اعظم " کے بارے میں پوچھا تو فرمایا " مجھے جادو منتر، ٹونے ٹوٹکے جیسا کوئی اسم اعظم معلوم

---

[1] ذکر اقبال، صفحہ ۷۴-۷۶۔ [2] روزگار فقیر، جلد دوم، صفحہ ۱۳۱-۱۳۲۔

نہیں ہے کہ اس کے پڑھنے ہی کچھ سے کچھ ہو جائے ہاں اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے سے مشکلیں حل ہو جاتی ہیں۔ اس لیے دعا ہی اسم اعظم ہے پھر فرمایا قرآن حکیم میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بہت سی اچھی صفات ہیں جن کے ذریعے سے اس سے دعائیں کرنی چاہئیں۔ مثلاً صحت کے لیے" ہوالشافی" رزق کی کشائش کے لیے" یارازق" اسی طرح اللہ تعالیٰ کے دوسرے صفاتی اسمائے حسنہ پکارنے سے مشکلیں حل ہوتی ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ الفاظ صرف زبان سے ہی نہیں دل سے بھی نکلیں اور دل اللہ تعالیٰ کی اس صفت پر یقین بھی رکھتا ہو۔" اس کے بعد کہا" قبولیت دعا کا ایک نسخہ یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ ہر دعا سے قبل اور بعد حضورؐ سرور کائنات پر درود بھیجیں کیونکہ درود سے بڑھ کر اور کوئی اسم اعظم نہیں اور تمہارے چچا (اقبال) کو میں نے اسی" اسم اعظم" کی تلقین کی ہے ایک دوسرے موقع پر فرمایا کہ اسمائے الٰہی میں یا حی و یا قیوم کا ورد بکثرت کرنا چاہیے اقبال کو بھی میں نے اس کی تاکید کی ہے۔" [1]

---

[1] روزگار فقیر، جلد دوم، صفحہ ۱۲۷-۱۲۸۔

یہاں ایک واقعہ کا تذکرہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔ یونانیوں نے سمرنا کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ لیکن اگست ۱۹۲۲ء میں انقرہ سے خبر آئی کہ مصطفیٰ کمال پاشا نے یونانیوں کو شکست دے کر سمرنا، تھریس اور قسطنطنیہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان ترکوں سے گہری ہمدردی رکھتے تھے لہٰذا انہیں ترکوں کی فتح سے بے حد خوشی ہوئی جگہ جگہ جلسے ہوئے اور جشن منائے گئے۔ اقبال نے مسلمانان ہندوستان کے ان جذبات کے اظہار کے لیے فتح کا مادۂ تاریخ لکھ کر ۴ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو مولانا گرامی کو بھیجا:

شاخ ابراہیم رانم مصطفیٰ! | سال فتحش" اسم اعظم مصطفیٰ"

(۱۳۴۱ھ (مکاتیب بنام گرامی، صفحہ ۲۲۲) باقی بر صفحہ ۹۶

مطالعہ قرآن کا ذوق

شیخ نور محمد کو مطالعۂ قرآن کا خاص ذوق تھا اور وہ دوسروں کو بھی قرآن کے گہرے مطالعہ کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ سید نذیر نیازی نے علامہ اقبال کی زبانی ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں :

"مَیں نے کہا تھا قرآن مجید دل کے راستے بھی شعور میں داخل ہوتا ہے۔ یہ حقیقت یوں سمجھ میں آئے گی کہ یہ کالج میں میری تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا۔ میرا معمول تھا کہ ہر روز نمازِ فجر کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتا۔ اس دوران والد ماجد بھی مسجد سے تشریف لے آتے اور مجھے تلاوت کرتا دیکھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ مَیں کبھی ایک منزل ختم کر چکا ہوتا کبھی کم۔ ایک روز کا ذکر ہے والد ماجد حسب معمول مسجد سے واپس آئے مَیں تلاوت میں مصروف تھا مگر وہ جیسے کسی خیال سے میرے پاس بیٹھ گئے۔ مَیں تلاوت کرتے کرتے رُک گیا اور منتظر تھا کہ مجھ سے کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ کہنے لگے "تم کیا پڑھا کرتے ہو؟" مجھے ان کے اس سوال پر نہایت تعجب ہُوا بلکہ ملال بھی۔ انہیں معلوم تھا مَیں قرآن پاک کی تلاوت کر رہا ہوں۔ بہر حال مَیں نے مؤدبانہ عرض کیا۔ "قرآن پاک"۔ کہنے لگے "تم جو کچھ پڑھتے ہو سمجھتے بھی ہو؟" مَیں نے کہا "کیوں نہیں؟ تھوڑی بہت عربی جانتا ہوں کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں۔" انہوں نے میرا جواب خاموشی سے سنا اور اٹھ کر کمرے میں چلے گئے

(بقیہ حاشیہ ص۹۵) اقبال کے گیارہ اکتوبر ۱۹۲۳ء کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ گرامی نے اس تاریخ پر دو مصرعوں کا اضافہ کر کے اس کو چار چاند لگا دیئے :

شاخِ ابراہیم را نم مصطفیٰ ! مہدیٔ آخر زماں ہم مصطفیٰ
گوش کن اے بے خبر تاریخ فتح گفت اقبال "اسمِ اعظم مصطفیٰ"

۱۳۴۱ھ (مکاتیب بنام گرامی، ص۲۳۰)

میں حیران تھا آخر اس سوال سے ان کا مطلب کیا ہے ؟ کچھ دن گزر گئے اور یہ بات جیسے آئی گئی ہو گئی لیکن اس واقعہ کو چھٹا روز تھا کہ صبح سویرے میں حسب معمول قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا۔ والد ماجد مسجد سے واپس آئے اور میں نے تلاوت ختم کی تو انہوں نے مجھے بلایا اور اپنے پاس بٹھا کر بڑی نرمی سے کہنے لگے "بیٹا قرآن مجید وہی سمجھ سکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو" مجھے تعجب ہوا کہ حضور رسالتمآب صلعم کے بعد قرآن پاک کیسے کسی پر نازل ہو سکتا ہے؟ معلوم ہوتا ہے وہ میرے دل کی بات سمجھ گئے کہنے لگے "تمہیں کیسے یہ خیال گزرا کہ اب قرآن مجید کسی پر نازل نہیں ہو گا۔ کیوں نہ تم اس کی تلاوت اس طرح کرو جیسے یہ تم پر نازل ہو رہا ہے۔ ایسا کرو گے تو یہ تمہاری رگ وپے میں سرایت کر جائے گا" میں ہمہ تن گوش والد ماجد کی بات سنتا رہا بلکہ اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا کہ قرآن مجید کی تلاوت ایسے ہی کروں جیسے ان کا ارشاد ہے کہ انہوں نے کہا "سنو! اللہ تعالیٰ کا ارادہ عالم انسانیت کو جس معراج کمال تک پہنچانے کا تھا اس کا آخری اور کامل و مکمل نمونہ ہمارے نبی اکرم محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات ستودہ صفات میں ہمارے سامنے پیش کر دیا لہٰذا ہم کہیں گے کہ آدم علیہ السلام سے حضور رسالتمآب صلعم تک کہ خاتم الانبیاء ہیں جتنے بھی نبی مبعوث ہوئے ان میں سے ہر ایک کا گزر مدارج محمدیہ ہی میں سے ہو رہا تھا وہ گویا ایک سلسلہ تھا جس کا خاتمہ ذات محمدیہ کی تشکیل پر ہوا"۔ [1]

حضرت علامہ کہنے لگے "والد ماجد نے پھر خود ہی اپنے اس ارشاد

---

[1] دیکھیے اسرار خودی:

(باقی برصفحہ ۹۸)

کی تشریح کی انہوں نے کہا "شعورِ انسانی کی تکمیل کے ساتھ ساتھ بالآخر جب وہ مرحلہ بھی آ گیا کہ زندگی اپنے مقصود کو پالے[1] تو ذاتِ محمدیہ حضورِ رسالت مآب صلعم تشریف لائے، باب نبوت بند ہوا انسانیت اپنے معراجِ کمال کو پہنچی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اسوۂ حسنہ دکاملہ ہی ہر اعتبار سے ہمارے لیے حجت، مثال اور نمونہ ٹھہرا۔ اب جتنا بھی کوئی اس رنگ میں رنگتا چلا جائے گا اتنا ہی قرآن مجید اس پر نازل ہوتا رہے گا۔ یہ مطلب تھا میرے اس کہنے کا کہ قرآن مجید اسی کی سمجھ میں آسکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو"[2]

قرآن کی اتباع

قرآن کی اس اہمیت وحیثیت کے شعور ہی کا نتیجہ تھا کہ شیخ نور محمد اپنی روزمرّہ زندگی میں بھی اس کو رہنما بنانے کے قائل تھے۔ یہ قرآنی تعلیمات ہی کا اثر تھا کہ آپ حرام کی کمائی سے طبعاً نفور اور رزقِ حلال کے حصول پر کمربستہ رہتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ رزقِ حلال کی وجہ سے انسان تقویٰ کی لذت اٹھا سکتا ہے۔ اور

(بقیہ حاشیہ ص۹۴) شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت

تا چراغِ یک محمدؐ بر فروخت

حضرت علامہ نے یہ بات انگریزی میں کہی تھی الفاظ تھے

"Muhammad in the making,

[1] الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی۔ (مائدہ: ۳)

[2] اقبال کے حضور، صفحہ ۴۰ - ۴۱۔

بال جبریل میں ہے:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب

گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

یہ قرآن ہی کا اثر تھا کہ وہ کسی کے ساتھ ناانصافی پسند نہ کرتے تھے اور معاملات کے فیصلے کے لیے بھی ان کی نظر قرآن کی طرف اٹھتی تھی۔ نقیر سید وحیدالدین نے ایک واقعہ بیان کیا ہے:

"علامہ کی چھوٹی ہمشیرہ کی شادی وزیرآباد کے ایک گھرانے میں ہوئی تھی غالباً اس لیے کہ ان کے یہاں شادی کے بعد ایک دو سال میں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ان کی خوش دامن نے سسرال میں انہیں رہنے نہ دیا۔ تلخی اتنی بڑھی اور بات یہاں تک پہنچی کہ وہ مجبوراً میکے چلی آئیں اور کئی سال وہیں رہیں۔ ان کی ساس نے بیٹے کی دوسری شادی کردی۔ پھر نہ معلوم کیا واقعات پیش آئے کہ وہ اپنی دوسری بہو پر بھی سوکن لے آئیں۔ علامہ کے بہنوئی ایک سعادت مند بیٹے کی طرح اپنی والدہ کی زندگی بھر ان کی خدمت اور اطاعت کرتے رہے۔ ماں نے جو کہا، اس کی تعمیل کی لیکن ان کی وفات کے بعد انہوں نے اپنی پہلی بیوی کو گھر لے جانا چاہا اور کئی مہینے تک کوشش جاری رکھی۔ وہ بار بار علامہ کے والد کے پاس طرفین کے رشتے داروں کو مصالحت کے لیے بھیجتے رہے۔ پہلے تو ادھر سے انکار ہوتا رہا پھر بہت کچھ سوچ بچار کے بعد علامہ کے والد اور والدہ صاحبہ دونوں رضامند ہوگئے۔ ساس اور سسر کی رضامندی کا سہارا پاکر علامہ کے بہنوئی کچھ عزیزوں کو ساتھ لے کر اپنی سسرال آگئے۔ اتفاق کی بات کہ ان دنوں علامہ بھی سیالکوٹ گئے ہوئے تھے انہیں جب اس کا علم ہوا کہ ان کے بہنوئی مصالحت کی غرض سے آئے ہوئے ہیں تو ان کی برہمی کی کوئی حد و نہایت ہی نہ رہی۔ والد صاحب نے بہت کچھ سمجھایا مگر علامہ یہی کہتے رہے کہ مصالحت نہیں ہوسکتی۔ ہرگز نہیں ہوسکتی۔ آنے

والوں کو واپس کر دیا جائے۔ ان کے والد نے جب دیکھا کہ علامہ کسی طرح رضامند نہیں ہوتے تو انہوں نے خاص انداز میں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں " والصلح خیر " فرمایا ہے اتنا سننا تھا کہ علامہ خاموش ہو گئے۔ ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا، جیسے کسی نے سلگتی ہوئی آگ پر برف کی سل رکھ دی ہو۔ ان کے والد نے قدرے توقف کے بعد پھر علامہ سے پوچھا کہ پھر کیا فیصلہ کیا جائے؟ علامہ نے جواب دیا " وہی جو قرآن کہتا ہے " چنانچہ مصالحت ہو گئی اور چند دن کے بعد ان کے بہنوئی اپنی بیوی یعنی علامہ کی چھوٹی بہن کو رخصت کرا کے اپنے گھر لے گئے " [۱]

بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ شیخ نور محمد کے قرآن پر مستحکم ایمان ہی کا نتیجہ تھا کہ یہ صلح سر تا سر خیر ہی تھی۔

عشق رسالت مآبؐ

قرآن پر غیر متزلزل ایمان کے علاوہ شیخ نور محمد کا دوسرا امتیازی وصف آپ کا بے پایاں جذبہ حبِ رسولؐ تھا۔ حضورؐ کی ذاتِ گرامی سے آپ کو جو عشق تھا اس کی مثال علامہ اقبالؒ نے اپنی شہرہ آفاق فارسی نظم " رموز بے خودی " میں " در معنی این کہ حسن سیرت ملیہ از تادب بآداب محمدیہ است " کے زیر عنوان یوں پیش کی ہے۔

سائلے مثل قضائے مبرمے　　بر در ما زد صدائے پیہمے
از غضب چوبے شکستم بر سرش　　حاصل در یوزہ افتاد از برش
عقل در آغاز ایام شباب　　می نیندیشد صواب و نا صواب
از مزاج من پدر آزردہ گشت　　لالہ زار چہرہ اش افسردہ گشت
بر لبش آہے جگر تابے رسید　　در میانِ سینۂ او دل تپید

---

[۱] روزگار فقیر، جلد دوم، صفحہ ۱۵۴-۱۵۵۔

کوکبے در چشم او گردید و ریخت — بر سر مژگاں دمے تابید و ریخت
ہم چو آں مرغے کہ در فصل خزاں — لرزد از باد سحر در آشیاں
در تنم لرزید جانِ غافلم — رفت لیلائے شکیب از محملم
گفت فردا امت خیر الرسلؐ — جمع گردد پیش آں مولائے کل
غازیانِ ملتِ بیضائے او — حافظانِ حکمتِ رعنائے او
ہم شہیدانے کہ دیں را حجت اند — مثلِ انجم در فضائے ملت اند
زاہدان و عاشقانِ دلفگار — عالمان و عاصیانِ شرمسار
درمیانِ انجمن گردد بلند — نالہ ہائے ایں گدائے دردمند
اے صراطت مشکل از بے مرکبی — من چہ گویم چوں مرا پرسد نبیؐ
حق جوانے مسلمے با تو سپرد — کو نصیبے از دبستانم نبرد
از تو ایں یک کار آساں ہم نشد — یعنی آں انبارِ گل آدم نشد
در ملامت نرم گفتار آں کریم — من رہینِ خجلت و امید و بیم
اندکے اندیش و یاد آر اے پسر — اجتماعِ امتِ خیر البشرؐ
باز ایں ریشِ سفیدِ من نگر — لرزۂ بیم و امیدِ من نگر
بر پدر ایں جور نازیبا مکن — پیش مولا بندہ را رسوا مکن[1]

ایک ضدی فقیر دروازے پر بار بار صدائیں لگا رہا تھا۔ مجھے غصہ آیا اور میں نے فقیر کے سر پر ایک ڈنڈا رسید کر دیا۔ اس نے جو بھیک اب تک جمع کی تھی سب گر گئی۔ دراصل جوانی کا آغاز تھا اور اس دور میں عقل صحیح و غلط کی تمیز سے محروم ہوتی ہے۔ میری اس بدمزاجی پر والد صاحب سخت آزردہ ہوئے۔ ان کا چہرہ افسردہ ہو گیا، ان کے لبوں سے ایک آہ جگر سوز نکلی اور دل سینے میں تڑپ اٹھا وہ آبدیدہ ہو گئے۔ میری غافل روح میرے جسم میں اس

۱؎ اسرار و رموز، صفحہ ۱۵۰-۱۵۲۔

پرندے کی طرح تڑپ اٹھی جو فصل خزاں میں باد سحر کے جھونکوں سے لرز اٹھتا ہے میرا صبر و قرار لٹ گیا۔ والد گرامی نے فرمایا "اے بیٹے کل آنحضور ؐ کی امت میدان حشر میں جمع ہو گی اس میں ملت بیضا کے غازی، عالم، شہید، زاہد، فاسق اور گنہگار سبھی شامل ہوں گے۔ تو اس مظلوم فقیر کے نالے بلند ہوں گے۔ بیٹے! جب تیرے لیے مرکب کے بغیر راستہ چلنا مشکل ہو گا اس وقت حضورؐ مجھے کہیں گے کہ اللہ نے ایک مسلمان نوجوان تیرے سپرد کیا تھا تاکہ تو اسے صحیح تعلیم و تربیت دے لیکن اس نوجوان نے میرے دین سے کوئی استفادہ نہ کیا اور تو ایک بھی کام نہ کر سکا یعنی تو مٹی سے بنے ہوئے پتلے کو آدمیت کا سبق نہ دے سکا۔ تو میں اس کا کیا جواب دوں گا؟" والد لطف و کرم کا پیکر تھے وہ اگرچہ مجھے ملامت کر رہے تھے لیکن گفتگو میں بڑی نرمی تھی اس کے باوجود میں شرم کے مارے پانی پانی ہو رہا تھا اور امید و بیم میں مبتلا تھا۔ والد نے فرمایا "اے بیٹے! ذرا خیال کر کہ امت خیر البشرؐ کے اجتماع کے سامنے میری کیا حالت ہو گی۔ خدا کے لیے میری سفید ریش کالی نہ کر، میری امید و بیم کی کیفیت کا خیال کر۔ اپنے باپ پر اس قدر ستم نہ ڈھا اور آقائے کُل کے سامنے اس بندۂ عاجز کو رسوا نہ کر۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نور محمد کا دل عشق رسالت مآب سے سرشار تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ معمولی سا واقعہ شیخ صاحب کی شخصیت کو ہمارے سامنے لے آتا ہے، ایک ایسی شخصیت جس کی نمایاں ترین خصوصیات مردم آزاری سے گریز، ہمدردانہ شفقت کے باوجود ذمہ داری کا شدید احساس اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ عشق تھیں۔

رشد و ہدایت

علامہ اقبال نے حیات و کائنات کے حقائق پر غور و فکر شروع کیا تو انہیں فطرت کے اسرار و رموز سے آگاہی حاصل ہوئی۔ اس سے ان کی ذہنی کیفیت میں ایک عجیب انقلاب سا برپا ہوا۔ اس قسم کی واردات و کیفیات سے کم ظرف

انسان کے لیے گمراہ ہونا بہت آسان ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں اقبال نے فوراً اپنے والد سے رجوع کیا اور رہنمائی کی درخواست کی۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم رقم طراز ہیں:

"اقبال کو جس زمانے میں اپنے اندر گہرے وجدانی رجحان کا احساس شروع ہوا تو ایک روز انھوں نے اپنے والد سے اس کا ذکر کیا "میں اپنے اندر کچھ ایسی چیزیں محسوس کرتا ہوں کہ اگر مجھ میں بعض جسمانی کمزوریاں نہ ہوتیں تو میں بھی کسی نہ کسی قسم کا نبی ہو جاتا" اس پر ان کے والد نے ہنس کر کہا "خدا کا شکر ہے کہ تم کو اپنی کمزوریوں کا علم ہے جو تم کو مغالطے میں پڑنے سے بچاتی رہیں گی"۔[۱]

مردم آزاری سے نفرت

میاں جی کو مردم آزاری سے شدید نفرت تھی وہ اس بات کے قائل تھے کہ کسی کا دل دکھانا بہت بڑا جرم ہے ان کے مزاج کی اس کیفیت کا اظہار اس واقعے سے ہوتا ہے کہ ۱۹۱۴ء میں جب مثنوی اسرار خودی زیر تکمیل تھی تو علامہ اقبال سیالکوٹ جاتے اور اپنے والد کو مثنوی کے اشعار سناتے اور عجمی تصوف کی تردید کے عزم کا اظہار کرتے۔ ۱۹۱۵ء میں اسرار خودی شائع ہوئی تو اس کا ایک نسخہ والد گرامی کی خدمت میں بھی بھیجا گیا جسے وہ عام طور پر صبح کے وقت بڑے ذوق و شوق کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ اسی دوران مثنوی پر حلقۂ صوفیاء کی طرف سے زبردست تنقید ہوئی۔ ایک ملاقات میں یہ معاملہ زیر بحث آیا تو اقبال نے کہا کہ میں نے کسی کو ہدف تنقید نہیں بنایا بلکہ ایک اصول کی تشریح کی ہے۔ والد نے فرمایا "اگر حافظ کے عقیدت مندوں کے جذبات کو ٹھیس لگائے بغیر اصول کی تشریح کر دی جاتی تو اچھا تھا"۔ اقبال نے جواب دیا کہ یہ حافظ پرستی بھی تو بت پرستی سے کم نہیں۔ اس پر والد نے فرمایا کہ اللہ اور اس

---

[۱] آثار اقبال، صفحہ ۲۰۔

کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تو بتوں کو بھی برا کہنے سے منع فرمایا ہے اس لیے آئندہ ایڈیشن میں حافظ سے متعلق اشعار حذف کر دیئے جائیں تو مناسب ہوگا۔

علامہ اقبال نے والد کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور آئندہ ایڈیشن میں پینتیس اشعار خارج کر دیئے[1]

سوز و گداز

شیخ صاحب کا دل سوز و گداز کی کیفیت سے آشنا تھا۔ لسان العصر اکبر الہ آبادی کے نام ۱۳/ اگست ۱۹۱۸ء کے خط میں اقبال اپنے والد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پرسوں شام کھانا کھا رہے تھے اور کسی عزیز کا ذکر کر رہے تھے جن کا حال ہی میں انتقال ہو گیا تھا دوران گفتگو میں کہنے لگے "معلوم نہیں بندہ اپنے رب سے کب کا بچھڑا ہوا ہے"۔ اس خیال سے اس قدر متاثر ہوئے کہ قریباً بے ہوش ہو گئے اور رات دس گیارہ بجے تک یہی کیفیت رہی"[2]

شخصیت

سید ذکی شاہ اور مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی کے بیان کے مطابق شیخ نور محمد نہایت وجیہہ و شکیل بزرگ تھے۔ رنگ سرخ، داڑھی سفید، لباس سادہ تھا۔ بہت کم مگر ضروری گفتگو پسند کرتے تھے۔ چھڑی ہاتھ میں لے کر نکلتے تھے۔ نظر ہر وقت سامنے رکھتے اِدھر اُدھر نہ دیکھتے نہایت متین، ذی عقل سنجیدہ مزاج

---

[1] روزگار فقیر، جلد دوم، صفحہ ۱۶۲-۱۶۴۔

[2] اقبال نامہ جلد دوم۔

بزرگ تھے۔ شہر بھر میں خاص عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔[1]
شیخ نور محمد بے حد سادہ زندگی بسر کرتے تھے ان کی رہائش قدیم وضع کے ایک ذاتی مکان میں تھی۔ زرعی ملکیت ان کے پاس بالکل نہ تھی[2] شیخ صاحب مرنجاں مرنج طبیعت اور صلح کل مزاج کے مالک تھے۔ ساتھ ہی عالی ظرف اور بردبار بھی تھے۔ ان کی زندگی میں کتنے ہی ایسے واقعات ملتے ہیں کہ اپنے مخالفوں اور ناحق ایذا پہنچانے والوں کو انہوں نے معاف کر دیا اور انتقام نہیں لیا وہ بڑے اصول پسند اور طبیعت کے نیک اور سادہ تھے[3] ضرب کلیم میں "مرد بزرگ" کے عنوان سے علامہ اقبال نے جو شعر لکھے ہیں ان کے مطالعے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ شعر کہتے وقت موصوف کے سامنے اپنے والد گرامی کی شخصیت جلوہ گر تھی۔ اقبال کہتے ہیں:

اس کی نفرت بھی عمیق، اس کی محبت بھی عمیق
قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق
پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں
ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق
انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو
شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق
مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں!
بات میں سادہ و آزادہ، معانی میں دقیق
اس کا انداز نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیران طریق[4]

---

[1] ذکر اقبال، صفحہ ۸۔
[2] روزگار فقیر، جلد اول، صفحہ ۱۹۶۔
[3] ایضاً، جلد دوم، صفحہ ۱۲۵۔ ۱۲۶۔
[4] ضرب کلیم، صفحہ ۱۲۹۔

اقبال کی حوصلہ افزائی

شیخ نور محمد کی شروع ہی سے خواہش تھی کہ ان کا فرزند ارجمند اقبال ان کی زندگی میں ہی شہرت و عظمت کا مالک ہو اور اس کی کوششیں ملت اسلامیہ کے حق میں تعمیری ثابت ہوں لہٰذا انہیں جب موقع ملا انہوں نے اقبال کی حوصلہ افزائی ایک مقدس فریضہ جان کر کی۔ ۱۹۰۰ء میں انجمن حمایت اسلام کے سٹیج پر پہلی مرتبہ اقبال نے نظم پڑھی۔ نظم کا عنوان تھا "نالۂ یتیم" اقبال نے اپنے مخصوص رنگ اور دردناک لَے میں جب یہ نظم پڑھی تو سامعین اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے دل مضطرب اور آنکھیں اشک ریز ہوگئیں اس دوران میں جب مطبوعہ نظم کی کاپیاں فوراً ایک گئیں لیکن مانگ بدستور تھی —— بعض حضرات نے وہ کاپیاں خرید کر اس شرط پر دوبارہ انجمن کو بطور عطیہ دے دیں کہ کوئی جلد پچاس روپے سے کم فروخت نہ ہو چند لمحوں میں وہ بھی بک گئیں۔ شیخ نور محمد نے جو اس وقت گیلری میں تشریف فرما تھے سولہ روپے میں ایک جلد خریدی اور اس طرح اپنے بیٹے کے بلند پایہ کلام کی داد دی۔ [۱]

ایسے ہی ایک واقعے کا تذکرہ سر عبدالقادر نے اس طرح کیا ہے:

> "انجمن کا ایک اجلاس جس میں اقبال نے اپنی مشہور نظم "شکوہ" اپنے خاص انداز میں پڑھی بہت لوگوں کو یاد ہوگا جب "کیفِ غم" کا سماں جلسے پر چھا گیا تھا۔ ان کے بہت سے مداح پھولوں سے جھولیاں بھر کر بیٹھے تھے اور جب وہ پڑھ رہے تھے تو ان پر پھول برسا رہے تھے۔ اس وقت کی ایک اور بات خاص طور پر قابل دید تھی کہ اقبال کا معمر باپ اس نظم کے سننے والوں میں موجود تھا باپ کی آنکھوں میں بیٹے کی کامیابی دیکھ کر خوشی کے

---

[۱] مختصر تاریخ انجمن حمایت اسلام لاہور۔ صفحہ ۱۱-۱۲۔

آنسو تھے مگر لبوں پہ تاثیر کلام سے وہی علامات غم تھیں جو بیٹے کے
چہرے پر تھیں۔ درحقیقت یہ خصوصیت بیٹے نے باپ سے
ورثے میں پائی تھی ۔[۱]

خالد نظیر صوفی بیان کرتے ہیں :

" میاں جی (والد اقبال) اپنے بلند اقبال فرزند کے کلام کے
بہت بڑے مداح تھے اور ہر وقت اس کا ورد ان کا معمول تھا۔

"بانگ درا" کی یہ غزل :

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں !
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

انہیں بے حد پسند تھی اور خاص بات یہ تھی کہ جس وقت اسے پڑھتے تو ساتھ
زار و قطار روتے۔ شدت گریہ اور ضعیفی کی وجہ سے کپکپاتی ہوئی آواز میں جب
اس شعر پر پہنچتے :

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں[۲]

تو بار بار دہراتے " جو اماں ملی تو کہاں ملی۔ جو اماں ملی تو کہاں ملی۔ جو اماں ملی"[۳]

یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ علامہ اقبال نے مثنوی "اسرار خودی" اپنے
والد ماجد کی فرمائش پر لکھی تھی۔ عطیہ بیگم کے نام، جولائی ۱۹۱۱ء کے خط میں علامہ
اقبال لکھتے ہیں :

---

[۱] ملفوظات، صفحہ ۱۲۔

[۲] یہ مصرع اس وقت یوں تھا:

مرے جرم ہائے سیاہ کو ترے عفو بندہ نواز میں !

[۳] اقبال درون خانہ، صفحہ ۶۲۔

"والد نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ میں بو علی قلندر کی مثنوی کے نمونے پر فارسی میں کوئی نظم لکھوں اور اس اہم کام کی مشکلات کے باوجود میں نے ایسا کرنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں:

نالہ را انداز نو ایجاد کن
بزم را از ہائے و ہو آباد کن

آتش ہستی بزم عالم بر فروز
دیگران را ہم ازیں آتش بسوز

سینہ را سر منزل صد نالہ ساز
اشک خونیں را جگر پر کالہ ساز

پشت پا بر شورش دنیا بزن
موجہ بیرون ایں دریا بزن

باقی اشعار بھول گیا ہوں لیکن امید ہے کہ جب میں کچہری سے لوٹوں گا اس وقت انہیں یاد کر سکوں گا۔"[1]

اولاد

مولانا سالک شیخ نور محمد کی اولاد کے متعلق لکھتے ہیں:

"شیخ صاحب کے ہاں دو لڑکے ہوئے، بڑے صاحبزادے شیخ عطا محمد اور چھوٹے شیخ محمد اقبال (یعنی حضرت علامہ) ان کے علاوہ تین لڑکیاں بھی تھیں۔"[2]

---

[1] اقبال، صفحہ ۱۱-۱۲
ان میں سے شعر ۱، ۲ "اسرار خودی" کے صفحہ ۹ پر ملتے ہیں لیکن اشعار کی ترتیب اور دوسرے شعر میں معمولی تغیر کیا ہے۔ دوسرا شعر یوں لکھا ہے:

آتش استی بزم عالم بر فروز	دیگراں را ہم ز سوز خود بسوز

[2] ذکر اقبال، صفحہ ۹۔

اس صفحہ کے حاشیہ پر فرماتے ہیں:

"سید ذکی شاہ خلف الرشید مولانا میر حسن کے بیان کے مطابق علامہ کی بہنوں کی تعداد ۳ اور منظور احمد صاحب ہمشیر زادۂ علامہ کے قول کے مطابق ۴ ہے۔"[۱]

چاہیے تو یہ تھا کہ مولانا میر حسن کے صاحبزادے کے بیان پر ہمشیر زادۂ اقبال کے بیان کو ترجیح دی جاتی لیکن مولانا نے اس پہلو پر توجہ دینے کی زحمت گوارا کیے بغیر دونوں روایتیں نقل کر دیں۔ بلکہ متن میں انہوں نے بہنوں کی تعداد تین ہی لکھی ہے جس سے عام قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اگر مولانا کچھ اور کوشش کرتے تو اس مشکل کا حل ممکن تھا۔ علامہ کے ایک سوانح نگار عبداللہ انور بیگ رقمطراز ہیں:

"Sheikh Nur Muhammad had six children, two sons, Ata Mohammad and Muhammad Iqbal, and four daughters"[۲]

خالد نظیر صوفی کہتے ہیں کہ علامہ اقبال کی پیدائش سے پہلے شیخ نور محمد کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا لیکن وہ فوت ہو گیا تھا۔ اس طرح شیخ صاحب کے ہاں تین لڑکے چار لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ شیخ عطا محمد سب سے بڑے لڑکے تھے جو ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ دوسرے لڑکے جن کا نام معلوم نہیں ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے اور کم سنی ہی میں فوت ہو گئے[۳] علامہ اقبال سب سے چھوٹے لڑکے تھے۔ علامہ کی بہنوں میں سے دو فاطمہ بی بی اور طالعہ بی بی علامہ سے بڑی اور کریم بی بی اور زینب بی بی ان سے چھوٹی تھیں[۴]

---

[۱] ذکر اقبال، صفحہ ۹ (حاشیہ)۔

[۲] The poet of the East, 6

[۳] اقبال درون خانہ، صفحہ ۱۵۰ نیز روزگار فقیر، جلد اول، صفحہ ۲۳۱۔

[۴] اقبال درون خانہ، صفحہ ۳۲ (حاشیہ)۔

آخری ایام

خالد نظیر صوفی نے میاں جی کے آخری ایام زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"آخر عمر میں میاں جی کو بڑے نانا جان (شیخ عطا محمد صاحب) اور بھابھی جی (بیگم شیخ عطا محمد صاحب) کے بغیر ایک پل چین نہ آتا تھا۔ ایک دفعہ چھوٹے نانا جان (علامہ مرحوم) کو درد گردہ کا شدید دورہ ہوا تو بڑے نانا جان مع بھابھی جی تقریباً ایک ماہ لاہور میں ان کے پاس مقیم رہے۔ سیالکوٹ میں میاں جی کے پاس ان کی بڑی صاحبزادی محترمہ فاطمہ بی بی صاحبہ، گھر کی دوسری خواتین اور بڑے پوتے شیخ اعجاز احمد صاحب تھے۔ میاں جی نے چند روز تو صبر کیا مگر پھر شور مچانے لگے کہ "عطا محمد کو بلاؤ۔ مہتاب (بیگم شیخ عطا محمد) کو بلاؤ" سب ان کو سمجھاتے کہ وہاں پر ان کی موجودگی ضروری ہے کیونکہ علامہ صاحب بہت بیمار ہیں وہ کچھ دیر تو خاموش رہتے لیکن پھر وہی مطالبہ شروع کر دیتے کبھی ماموں اعجاز فرماتے کہ "اگر میں فوت ہو گیا تو تم کیا کرو گے، لاؤ میرا کفن میں خود تیار کر کے رکھ دوں۔ عطا محمد یہاں پر نہیں ہے تم کہاں کفن تیار کرواتے پھرو گے" اعجاز ماموں ان کو سمجھاتے کہ "ابا جان لاہور ہی تو گئے ہیں، کون سے ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں آپ ایسی باتیں کیوں سوچتے ہیں؟" لیکن وہ تو بہانے سے نانا جان اور نانی جان کو بلانا چاہتے تھے اگر اس طرح کامیابی نہ ہوتی تو پھر کہنے لگتے "تم لوگوں نے تو مجھے بھوکا مار دیا ہے، دودھ میں پانی ملا دیتے ہو۔ جلدی عطا محمد اور مہتاب کو بلاؤ۔ میں تمہارے ہاتھ کی کوئی چیز نہ کھاؤں گا" آخر نانا جان قبلہ اور نانی جان جنت مکانی واپس تشریف لائے اور میاں جی کا اضطراب ختم ہوا۔

وفات سے کچھ عرصہ قبل ان کی بینائی بالکل ختم ہو گئی تھی اور ضعیفی اس قدر تھی کہ سارا وقت اپنے بستر پر بیٹھے ذکر الٰہی میں مشغول رہتے۔ اسی زمانے

میں انہیں یہ وہم ہو گیا کہ انہیں وقت درست نہیں بتایا جاتا ہے۔[1]

وفات

شیخ نور محمد کی وفات کے متعلق مولانا سالک نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ "علامہ اقبال کے والد محترم تقریباً نوے سال کی عمر پا کر ۱۹۲۹ء میں واصل بحق ہوئے"۔[2] اس کے برعکس فقیر سید وحیدالدین نے تصریح کی ہے کہ شیخ نور محمد ۹۳ سال کی عمر میں ۱۷ اگست ۱۹۳۰ء بمطابق ۱۳۴۹ھ کو فوت ہوئے[3] ان کی لوح مزار پر جو قطعہ کندہ کرایا گیا وہ علامہ کی تصنیف ہے اس سے بھی ۱۹۳۰ء میں وفات پانے کی تصدیق ہوتی ہے۔ قطعہ حسب ذیل ہے:

پدر و مرشد اقبال ازیں عالم رفت
یا ہمہ راہروانِ منزل ملک ابد
ہاتف از حضرت حق خواست دو تاریخ رحیل
آمد آواز "اثر رحمت" و "آغوش لحد"[4]
۱۳۴۹ھ ۱۳۴۹ھ

خالد نظیر صوفی نے خاندانی روایات سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ شیخ صاحب ۹۵ برس کی عمر میں فوت ہوئے[5] اور میرے خیال میں یہی زیادہ قرین قیاس ہے۔ مذکورہ بیانات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبال کے والد ماجد ۱۷ اگست ۱۹۳۰ء بمطابق ۱۳۴۹ھ کو جب فوت ہوئے تو آپ کی عمر پچانوے برس کے قریب تھی۔ آپ کا مزار سیالکوٹ میں امام (علی الحق) کے مقبرے کے قریب ہے۔[6]

---

[1] اقبال درون خانہ، صفحہ ۱۹-۲۰۔
[2] ذکر اقبال، صفحہ ۱۰۔

علامہ اقبال اور اکبر الہ آبادی

علامہ اقبال اور اکبر الہ آبادی برصغیر ہند و پاک کی ان عظیم شخصیتوں میں سے تھے جنہوں نے مسلمانانِ برصغیر کی رہنمائی کا مقدس فریضہ سرانجام دیا۔ ان کا زمانہ بھی تقریباً ایک تھا اور ان کا مسلک بھی بڑی حد تک ایک تھا۔ جس دور میں اقبال کی قومی و ملی شاعری کا شہرہ ہونے لگا اسی دور میں اکبر اپنی زندگی کی آخری منزلیں طے کر رہے تھے۔ دونوں عظیم شخصیتوں کی ذہنی یگانگت اور قلبی ہم آہنگی کی بنیاد سرسید تحریک کی خامیوں کی اصلاح تھی۔

سرسید تحریک کے نتیجے میں جس تعلیمی ادارے (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اور بعد میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کا قیام عمل میں آیا اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان نوجوان مغربی تعلیم کے حصول کے ساتھ ساتھ دینی تربیت سے بھی بہرہ ور ہو سکیں، لیکن متعدد وجوہ کی بناء پر اس تعلیمی ادارے کی فضا میں مطلوبہ مذہبی رنگ غالب نہ رہ سکا۔ آہستہ آہستہ کالج اور مشرقیت، مغربی تعلیم اور مذہب دو ستی متغائر و متضاد عناصر سمجھے جانے لگے۔ ملت کے بہی خواہوں میں اس صورت حال کا شدید ردِ عمل ہوا۔ شاعروں، ادیبوں، مذہبی رہنماؤں اور سیاسی رہبروں کا ایک مضبوط اور مؤثر گروہ اس ناپسندیدہ حالت کی اصلاح پر کمربستہ ہو گیا۔ مولانا شبلی نے اسلامی تاریخ اور مسلم اکابر کی سوانح عمریوں کے ذریعے مسلمانوں کو مغربی طرزِ تمدن اور طریقِ فکر کی مرعوبیت سے نجات دلائی۔ محمد علی جوہر اور ابوالکلام آزاد نے انگریزی استعمار کی غلامی کے بندھنوں سے آزادی و رستگاری کی جوت دلوں میں جگائی۔ اکبر الہ آبادی نے طنز و ظرافت کے ذریعے مسلمانانِ برصغیر کو مغرب کی اندھی تقلید سے بچانے کی کوشش کی اور پھر اقبال نے اپنے فلسفۂ خودی کی تشریح و توضیح کے ذریعے امتِ مسلمہ کی اجتماعی

خودی، امتیازی خصوصیت اور جداگانہ وجود کے تصور کو راسخ کیا۔

اس میں شک نہیں کہ بعض امور ایسے ہیں جن میں دونوں بزرگوں میں قدرے اختلاف نظر آتا ہے۔ اقبال کی نظر مشرقی و مغربی علوم پر بہت گہری تھی اور انہوں نے یورپی معاشرے کو بہت قریب سے دیکھا، جانچا اور پرکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا سماجی شعور عمیق، مقصد واضح، نقطۂ نظر مرتب اور منظم صورت میں سامنے آتا ہے۔ اس کے خلاف اکبر کا مطالعہ و مشاہدۂ تہذیب مغرب نسبتاً سرسری اور سطحی تھا۔ اسی بنا پر ان کی اصلاحی سرگرمیوں کا واحد مقصد اکثر و بیشتر مغربی تقلید کی خامیوں پر ظریفانہ تنقید تھا اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اقبال کا کام زیادہ مثبت اور مستقل نوعیت کا تھا، جب کہ اکبر نے ہنگامی حالات سے ابھرنے کی کوشش نہیں کی اور ان کے کام کی نوعیت بھی تقریباً منفی ہے۔ علاوہ ازیں اکبر کی تنقید زیادہ تر قدیم رسم و رواج اور روایات کی روشنی میں ہوتی تھی، جب کہ اقبال تجدید دین و مذہب اور احیائے ملّتِ اسلامیہ کے علمبردار تھے۔ اکبر تمدّن و معاشرت میں مشرقی وضع قطع برقرار رکھنے کے حامی تھے اور اقبال اس سے آگے بڑھ کر اس معاشرے کو اسلامی یا حجازی رنگ میں رنگنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے کلام اور فکر کو اکبر کے کلام اور فکر کی نسبت زیادہ پائداری حاصل ہوئی۔ شیخ محمد اکرام مرحوم نے دونوں ہستیوں کے بعض بنیادی اختلافی پہلوؤں کو اس طرح پیش کیا ہے:

"طنزیہ اور ظریفانہ شاعری میں اکبر بے بدل تھے، لیکن بطور ایک تعمیری مفکر کے ان کا پایہ حالی یا اقبال سے بہت پست ہے۔ اکبر جزئیات اور وقتی مسائل کے مختلف پہلوؤں کو بڑی خوبی سے دیکھ لیتے تھے اور ان کے متعلق انہیں ایسی باتیں سوجھتیں جن کا خیال اقبال یا حالی کو نہ ہوتا، لیکن اصولی باتوں اور انسانی زندگی یا قومی ضروریات کے اہم بنیادی مسائل پر ان کی نظر اتنی گہری نہ تھی جتنی حالی یا اقبال کی۔" [۱]

---

[۱] شیخ محمد اکرام، "موجِ کوثر" (لاہور، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۵ء)، صفحہ ۲۱۸۔

پروفیسر آل احمد سرور "اکبر اور سرسید" کے زیرِ عنوان ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"دراصل وہ (اکبر) مصوّر تھے مفکر نہ تھے۔ اپنے زمانے کی تصویر کھینچ لیتے تھے۔ اپنے زمانے سے آگے انہیں دیکھنا نہ آتا تھا۔ احساس کی دولت سے مالا مال تھے۔ فکر کی روشنی کم تھی۔ حال کو ماضی کے معیار پر پرکھتے تھے اور مستقبل کے خیالات سے ڈرتے تھے۔ خلوص تھا، نظر نہ تھی۔ جذبہ تھا، ذہن نہ تھا۔"[1]

گویا اکبر کا کام ماضی کی روشنی میں حال کی تنقید تھا جب کہ اقبال کا کام حال کی تنقید کے ساتھ مستقبل کی نقشہ کشی اور تعمیر بھی تھا۔ پھر یہ کہ اکبر مروجہ طریقِ تصوّف کے معترف تھے۔ اس کے برعکس اقبال اس پر تنقیدی نظر ڈال کر اس کے خلافِ شریعت امور کی اصلاح کے خواہشمند تھے۔

ان اختلافات کے باوجود متعدد پہلوؤں میں اقبال اور اکبر میں مشابہت اور مشارکت پائی جاتی ہے۔ دونوں مذہبی گھرانوں کے چشم و چراغ تھے، دونوں نے مکتبی تعلیم پائی، دونوں مشرقی و مغربی علوم سے واقف تھے، دونوں نے ایک عرصہ تک وکالت کا پیشہ اختیار کیا، دونوں مغربی اقدار پر مشرقی اقدار کو ترجیح دیتے تھے، لیکن مغرب کی علمی اور سائنسی فتوحات سے استفادے کے قائل تھے۔ دونوں نے اصلاحِ قوم کے لیے شعر و شاعری کو ذریعۂ اظہار بنایا اور دونوں اخلاقی و مذہبی اصلاح کو ترقی کا سبب قرار دیتے تھے۔ دونوں مسلمانوں کے الگ قومی تشخص کے قائل اور انگریزوں اور ہندوؤں کے سیاسی و معاشی غلبے کے خلاف تھے۔ دونوں ایک ہی منزل کے راہی تھے۔ جو باتیں اکبر نے ظرافت کے پردے میں غیر منظم انداز میں کہیں، انہی باتوں کو اقبال نے اپنے مشہور فلسفۂ خودی کی روشنی میں سنجیدگی سے بیان کیا۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ تاریخی لحاظ سے تنقیدِ مغرب میں اکبر کو اولیت حاصل تھی لیکن مثبت اور تعمیری

---

[1] آل احمد سرور، "نئے اور پرانے چراغ"، صفحہ ۲۴۲۔

رد یّے کے اعتبار سے اقبالؔ بہر حال اکبرؔ پر فوقیت رکھتے تھے۔ [1]

اقبال کی اکبر سے عقیدت

اشتراکِ مقصد کی وجہ سے اقبال اپنے اس پیشرو سے محبت بھی کرتے تھے اور ان کے دل میں اکبر کے لیے ادب و احترام کے جذبات بھی تھے۔ ۱۹۱۰ء میں علامہ اقبالؒ نے علی گڑھ یونیورسٹی میں ایک خطبہ ارشاد فرمایا جو بعد میں "ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس میں مسلمانوں کی قومی ہستی کی بقا کے لیے مخصوص اسلوبِ سیرت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اکبر الہ آبادی کا ذکر ان شاندار الفاظ میں کرتے ہیں:

"۔۔۔۔ اس اسلوبِ سیرت کی ضرورت کا اعلان ایک شاعر کی زبردست قوتِ تخیل نے بلند آہنگی کے ساتھ کیا ہے۔ جناب مولانائے اکبر الہ آبادی جنہیں موزوں طور پر لسان العصر کا خطاب دیا گیا ہے اپنے بذلہ سنجانہ پیرائے میں ان قوتوں کی ماہیت کے احساس کو چھپائے ہوئے ہیں جو آج کل مسلمانوں پر اپنا عمل کر رہی ہیں۔ ان کے کلام کے ظریفانہ لب و لہجے پر نہ جائیے، ان کے شباب آور قہقہے ان کے آنسوؤں کے پردہ دار ہیں۔ وہ اپنے نہاں خانۂ صنعت میں اس وقت تک آپ کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے جب تک کہ آپ ان کا مال خریدنے کے لیے ذوقِ سلیم کے دام اپنی جیب میں ڈال کر نہ آئیں۔" [2]

اقبال نے اپنے خطوط میں بھی اپنی عقیدت و ارادت کو بار بار ظاہر کیا ہے۔ ۶ر اکتوبر ۱۹۱۱ء کے خط میں اقبال کہتے ہیں:

---

[1] اکبر اور اقبال میں موازنے کے سلسلے میں ملاحظہ ہو مولانا جعفر شاہ پھلواروی کا مقالہ "اقبال اور اکبر" مندرجہ "مقالاتِ یوم اقبال" (۱۹۶۷ء)، مرتبہ یعقوب توفیق (اقبال کونسل) کراچی، اپریل ۱۹۶۸ء، صفحہ ۹۲-۱۰۱۔

[2] "ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" (آئینۂ ادب، لاہور)، صفحہ ۸۰۔

"میں آپ کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے اور وہی محبت و عقیدت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ خدا کرے وہ وقت جلد آئے کہ مجھے آپ سے شرفِ نیاز حاصل ہو اور اپنا دل چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔ لاہور ایک بڑا شہر ہے لیکن میں اس ہجوم میں تنہا ہوں! ایک فردِ واحد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے۔

"طعنہ زن ہے ضبط اور لذت بڑی افشا میں ہے
ہے کوئی مشکل سی مشکل راز داں کے واسطے"[۱]

۹ نومبر ۱۹۱۱ء کے خط میں اکبر سے ملاقات کی شدید خواہش کا اظہار کیا ہے:

"ترکوں کی فتح کا مژدۂ جانفزا پہنچا۔ مسرت ہوئی۔ مگر اس کا کیا علاج کہ دل کو پھر بھی اطمینان نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں روح کیا چاہتی ہے اور آنکھوں کو کس نظارے کی ہوس ہے.... آپ کی ملاقات کے لیے دل تڑپ رہا ہے۔ خدا جلد کوئی صورت پیدا کرے.....

"زمیندار میں یہ پڑھ کر نہایت افسوس ہوا کہ 'اردو شاہنامہ' تلف ہو گیا۔ جو شعر اس میں سے شائع ہوئے ہیں وہ بڑے زور کے ہیں ؎
رگِ موج سے خون جاری کریں۔ اس مصرع پر تو فردوسی اور نظامی بھی رشک کرتے ہیں۔"[۲]

اعترافِ عظمت

باوجودیکہ اس زمانے میں اہلِ زبان اور غیر اہلِ زبان کا جھگڑا چل رہا تھا، اکبر

---

[۱] شیخ عطاء اللہ، مرتب "اقبال نامہ" (مکاتیبِ اقبال) ۲/۳۴-۳۵-

[۲] ایضاً، ۲/۳۷-۳۸-

غالباً اکبر مرحوم فردوسی کی طرز پر اردو شاہنامہ لکھنے کے خواہشمند تھے۔ اس بارے میں ضروری معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ ۱۹۱۱ء کے روزنامہ "زمیندار"، لاہور کے فائل سے اس پہلو پر شاید کچھ روشنی پڑ سکے۔

پنجاب کے اس ابھرتے ہوئے قومی شاعر کے بلند مقام کے معترف تھے۔ ۳ مارچ ۱۹۱۲ء کے خط میں انہوں نے اقبال کو اپنا معنوی جانشین قرار دیا ہے:

"مَیں نہ کمیٹی کا مشتاق ہوں نہ بڑے لوگوں کا۔ اب شکستہ حالی کیا، ہمیشہ دل کے لیے شکستہ حالی اچھی رہتی ہے۔ آبِ رواں، املی کا درخت، قمری کی آواز، جنگل کا سماں، مسجد کا صحن بہت زیادہ دلکش ہے نصیب نہیں ہوتا۔ ہاں آپ سے ملنے کا بہت آرزومند ہوں:

امانت عشق کی بعد اپنے کیا جانیں ملے کس کو
نہیں معلوم جائے کس کے سر یہ دردِ سر اپنا

مدت کا پرانا شعر ہے۔ دیکھا کہ وہ بارِ غم جو میرے دل پر مستولی تھا آپ نے اٹھا لیا۔ وہی سمجھ اور بصیرت تھی جس نے آپ کے قلم سے قوم فروشی کی طعن ترشوا دی۔ یوں تو ہر شخص کے خیالات علیحدہ ہوتے ہیں اور آپ ماشاء اللہ ابھی کم عمر ہیں آپ کو ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ سوسائٹی اچھی ہو یا بُری خواہ مخواہ اس کا ممبر ہو کر حتی الوسع زندگی کو شیریں کرنا ہے۔ مَیں سیر ہو چکا ہوں۔ صورت و معنی میں ہر طرف تبدیلی پاتا ہوں۔ کہیں صورت باقی ہے تو معنی ندارد، کہیں کچھ ناصاف معنی ہیں تو صورت مکردہ۔ نہایت کم ہے کہ صورت و معنی کا وہی نبوی سانچہ ہو۔ یقیناً زمانہ بدلتا رہتا ہے۔ با زمانہ بساز صحیح ہے، لیکن بے ضرورت با زمانہ بساز کیوں؟ کم از کم یہ کہ مجھ میں یہ قابلیت نہ رہی کہ سوسائٹی میں خوش رہ سکوں۔ میرے اشارات بڑی تفصیل چاہتے ہیں۔ آپ کبھی ملیں تو یقیناً بڑی روحانی مسرت ہو گی لیکن آپ کو بہت سی باتوں پر توجہ ہو جائے گی ..... خیر جو کچھ ہو، اب آپ کے سپرد چارج ہے۔ ہم تو آپ کی ملاقات کی مسرت مول لینے پر مستعد ہیں۔ آپ کا مصرعہ ۶

درگرہ ہنگامہ داری چوں سپند ——— ہم کو ہمیشہ یاد رہتا ہے۔" [۱]

---

[۱] محمد عبداللہ قریشی، "معاصرینِ اقبال کی نظر میں" مطبوعہ ماہنامہ "ادبی دنیا" لاہور، اکتوبر ۱۹۶۷ء۔

اکبری اقبال

علامہ اقبال کی شاعری بلحاظ فکر و فن بہت بلند ہے، مگر یہ واقعہ ہے کہ اکبر کی شاعری نے اقبال کو بھی کسی حد تک متاثر کیا ہے۔ ۱۹۱۴ء میں اقبال نے انجمن حمایتِ اسلام کے انیسویں سالانہ اجلاس میں اکبر الٰہ آبادی کے انداز میں چند ظریفانہ قطعات پڑھے جو بعد میں "اکبری اقبال" کے نام سے خواجہ حسن نظامی کے پیش لفظ کے ساتھ شائع ہوئے۔ ان میں سے چند "بانگِ درا" کے آخر میں شامل ہیں۔ بعض اہلِ زبان نے ان قطعات پر اعتراضات وارد کیے۔ اقبال نے ۱۹ جولائی ۱۹۱۴ء کے خط میں اکبر کو لکھا کہ آپ کی پیروی میں کہے گئے اشعار پر جن لوگوں نے اعتراضات کیے ہیں وہ یقیناً فن شاعری سے نابلد ہیں:

"حضرت! میں آپ کو اپنا پیر و مرشد تصور کرتا ہوں۔ اگر کوئی شخص میری مذمت کرے جس کا مقصد آپ کی مدح سرائی ہو مجھے اس کا مطلق رنج نہیں بلکہ خوشی ہے۔ جب آپ سے ملاقات اور خط و کتابت نہ تھی اس وقت بھی میری ارادت اور عقیدت ایسی ہی تھی جیسی اب ہے اور انشاء اللہ جب تک میں زندہ ہوں ایسی ہی رہے گی۔ اگر ساری دنیا متفق اللسان ہو کر یہ کہے کہ اقبال پوچ گو ہے تو مجھے اس کا مطلق اثر نہ ہوگا، کیونکہ شاعری سے میرا مقصد بقول آپ کے حصولِ دولت و جاہ نہیں بلکہ محض اظہارِ صداقت ہے۔

"عام لوگ شاعرانہ انداز سے بے خبر ہوتے ہیں ان کو کیا معلوم کہ کسی شاعر کو داد دینے کا بہترین طریق یہ ہے کہ اگر داد دینے والا شاعر ہو تو جس کو داد دینا مقصود ہو، اس کے رنگ میں شعر لکھے۔ یا بالفاظ دیگر اس کا تتبع کر کے اس کی فوقیت کا اعتراف کرے۔ میں نے بھی اسی خیال سے چند اشعار آپ کے رنگ میں لکھے ہیں مگر عوام کی جہالت و بد مذاقی نے اس کا مفہوم کچھ اور سمجھ لیا اور میرے اس فعل سے عجیب و غریب نتائج پیدا کر لیے، سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سمجھ عطا کرے۔"[1]

---

[1] شیخ عطاء اللہ، مرتب، کتاب مذکور، ۲/ ۴۰ – ۴۱۔

اس خط میں اقبال نے اکبر کے ان اشعار، خصوصاً آخری مصرعہ کی بہت داد دی ہے:

یار کا حسن سب پہ فائق ہے — واقعی دیکھنے کے لائق ہے
ان مصائب سے کام لے اکبر — غم بڑا مدرکِ حقائق ہے

اقبال کہتے ہیں:

"سبحان اللہ "غم بڑا مدرکِ حقائق ہے"، زندگی کا سارا فلسفہ اس ذرا سے مصرع میں مخفی ہے۔"[1]

والدۂ اقبال کی رحلت پر

۹ نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ اقبال کی والدہ فوت ہوئیں۔ علامہ اس حادثہ پر شدید رنجیدہ تھے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے "والدۂ محترمہ کی یاد میں" کے عنوان سے ایک شاہکار اور طویل نظم لکھی جو "بانگِ درا" کے صفحات ۲۵۲ تا ۲۶۶ پر دیکھی جا سکتی ہے۔ اس پر اکبر نے بھی تعزیت کی غرض سے ایک قطعہ تاریخِ وفات لکھ بھیجا جو آج بھی ان کے لوحِ مزار پر کندہ ہے:

---

[1] ایضاً، صفحہ ۱۴۱۔

"غم بڑا مدرکِ حقائق ہے" کسی مغربی فلسفی کے افکار کی صدائے بازگشت نہیں جسے اکبر نے شاعری کا جامہ پہنایا ہو، بلکہ مشرقی اہلِ تصوف شعراء کے ہاں یہ تصور بہت پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ اردو شاعری میں میر درد کے اس شعر کی بنیاد یہی تصور ہے:

دل مرا پھر دکھا دیا کس نے — سو گیا تھا جگا دیا کس نے

اور اس سے ملتا جلتا مفہوم اقبال نے اپنی مشہور نظم "فلسفۂ غم"، (میاں فضل حسین، بیرسٹر ایٹ لا، لاہور کے نام) کے متعدد شعروں میں بیان کیا ہے مثلاً ("بانگِ درا"، صفحہ ۱۶۸)۔

حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال — غازہ ہے آئینۂ دل کے لیے گردِ ملال
غمِ جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے — ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

یہی بات اکبر نے ایک اور مقام پر (شیخ اللہ بخش گنائی لاہوری، مرتب "رباعیات اکبر"، صفحہ ۸۰) کہی ہے:

لحد کی تیرگی سے حق بجانب دل کی دہشت ہے — یہی وہ شب ہے جس کی صبح بھی صبحِ قیامت ہے
مصیبت بہرِ مومن پر تو عرفاں ہے اے اکبر — ظہورِ داغِ دل دیباچۂ صبحِ سعادت ہے

مادرِ مخدومۂ اقبال رفت　　سوئے جنت زیں جہانِ بے ثبات
گفت اکبر با دلِ پُر درد و غم　　رحلتِ مخدومہ تاریخِ وفات

"رحلتِ مخدومہ" سے ہجری سن ۱۳۳۳ھ نکلتا ہے۔

اسی طرح انہوں نے اردو میں بھی چند اشعار کہے جن سے اظہارِ غم بھی ہوتا ہے، والدین کی تربیت کے اثرات اور سالِ وفات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے:

حضرتِ اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں
قوم کی نظریں جو ان کے طرز کی شیدا ہوئیں
یہ خود آگاہی یہ خوش گوئی یہ ذوقِ معرفت
یہ طریقِ دوستی، خودداریٔ باتمکنت
اس کے شاہد ہیں کہ ان کے والدین ابرار تھے
باخدا تھے، اہلِ دل تھے، صاحبِ اسرار تھے
جلوہ گر ان میں انہی کا ہے یہ فیضِ تربیت
ہے ثمر اس باغ کا یہ طبعِ عالی منزلت
مادرِ مرحومۂ اقبال جنت کو گئیں
چشم تر ہے آنسوؤں سے، قلب ہے اندوہگیں
اکبر اس غم میں شریکِ حضرتِ اقبال ہے
سالِ رحلت کا یہاں منظور اسے فی الحال ہے
واقعی مخدومۂ ملت تھیں وہ نیکو صفات
رحلتِ مخدومہ سے پیدا ہے تاریخ وفات[1]

---

[1] بھیا احسان الحق، مرتب، "قطعات و رباعیات"، (بزم اکبر، کراچی)، صفحہ ۳۸۹۔
"کلیات اکبر" (بزم اکبر، کراچی)، جلد دوم و سوم، صفحہ ۴۲۱) میں اس نظم کے دوسرے شعر کے مصرعہ ثانی کے آخر میں "خودداری باتمکنت" کے بجائے "خودداریٔ بے تمکنت" لکھا ہے اور پانچویں شعر کے بعد یہ شعر درج ہے:

روکنا مشکل ہے آہ و زاری و فریاد کو　　نعمتِ عظمیٰ ہے ماں کی زندگی اولاد کو

ملفوظاتِ اکبر

سید عشرت حسین، فرزند اکبر الہ آبادی، کی روایت کے مطابق علامہ اقبالؒ نے ایک خط میں اکبر کو لکھا:

"آپ کی زبان سے جو الفاظ نکلتے ہیں وہ نہایت پُر معنی اور مفید ہوتے ہیں۔ ان کو جمع کر لینا چاہیے تاکہ آئندہ نسلیں ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ بڑی ضرورت ہے کہ ایک منشی کاغذ اور قلم دوات لے کر آپ کے پاس ہر وقت بیٹھے اور جو بات آپ فرمائیں اسے نوٹ کر لے۔ اگر مَیں الہ آباد میں قیام کر سکتا تو آپ کے لیے وہ کام کرتا جیسا باسویل Boswell نے ڈاکٹر جانسن Dr. Johnson کے لیے کیا تھا۔"[1]

ہلالِ عید پر تبصرہ

علامہ اقبال کی ایک نظم "غرہ شوال یا ہلالِ عید"، اکتوبر ۱۹۱۱ میں "زمیندار" کے عید نمبر میں شائع ہوئی۔ یہ نظم کیا ہے ایک طرح کا امت مسلمہ کے زوال کا مرثیہ ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل دو شعر بہت عمدہ ہیں:

دیکھ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ　　بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ
کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر　　اور اپنے مسلموں کی مسلم آزاری بھی دیکھ[2]

حضرت اکبر نے ایک خط میں اس نظم اور خصوصاً ان شعروں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"آپ کی نظم مَیں نے پڑھی۔ ماشاءاللہ چشم بد دور۔ بعض بزرگوار بھی تھے۔ سب نے نہایت تعریف کی۔ منشی صاحب نے تو نقل مانگی ہے لیکن مجھ پر بہت اثر ہوا۔ وہ اثر باعثِ سکونِ خاطر ہے، مَیں افسوس کرتا تھا اور صرف ایک آپ

---

[1] عشرت حسین، مرتب، "حیات اکبر"، صفحہ ۱۲۹۔
[2] "بانگِ درا"، صفحہ ۲۰۰۔

کے ہونے سے وہ افسوس کم نہیں ہوا کہ قوم کیوں بے بصیرت ہو گئی ہے ..... اگر جان کو قوت نہیں پہنچا سکتی تو تدبیر ہلاکت کی کیوں مؤید ہے ..... اللہ تعالیٰ نے آپ کو چشم بصیرت عطا فرمائی ہے کہ اس عمر میں بلا تجربہ دنیا آپ کے دل کی نظر کم سے کم اخلاقی حقائق کی طرف ہے۔

کافروں کی مسلم آئینی کا نظارہ بھی کر

کس قدر بلیغ و صحیح و لبریزِ معنی ہے۔ اگرچہ یہ لطیف و خوبصورت و بلیغ ترکیب الفاظ آپ کی علمی قابلیت اور خاص شاعرانہ سلیقہ کا نتیجہ ہے لیکن یہ خیال مرتب و باوقعت ہو کر کس کے دماغ کو نصیب ہوتا ہے۔ گرم گفتاری اور خودداری کے قوافی بھی حقائق کے مضامین سے مزین ہیں شکستِ رشتۂ تسبیح اور بخیۂ زناری آپ کا حصہ ہے۔ الغرض جملہ اشعار لاجواب ہیں۔ میری مدح سے بجز اس کے کہ آپ خوش ہوں اور کچھ ہوتا نہیں ہے، اگرچہ یہ بھی بہت ہے، لیکن آپ سے کبھی ملاقات ہو اور زبانی گفتگو ان اشعار کے معانی پر ہو تو گوناگوں فوائد حاصل ہو سکتے ہیں جو آئندہ طریقِ عمل کے لیے کار آمد ہوں ....." [1]

شعرِ اکبر پر تبصرہ

اکبر کے ایک شعر کی داد دیتے ہوئے اقبال، ۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"کل خط لکھ چکا ہوں، مگر آپ کے اس شعر کی داد دینا بھول گیا:

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے، عقل، عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

"سبحان اللہ! کس قدر باریک اور گہرا شعر ہے۔ ہیگل جس کو جرمنی والے افلاطون سے بڑا فلسفی تصور کرتے ہیں اور تخیل کے اعتبار سے حقیقت میں ہے بھی افلاطون سے بڑا، اس کا تمام فلسفہ اسی اصول پر مبنی ہے۔ آپ نے ہیگل کے سمندر کو ایک قطرہ میں

---

[1] اختر انصاری اکبر آبادی، مرتب، "اکبر اس دور میں"، صفحہ ۱۳۔

بند کر دیا یا یوں کہیے کہ ہیگل کا سمندر اس قطرے کی تفسیر ہے۔

"ہیگل لکھتا ہے کہ اصول تناقض ہستیٔ محدود کی زندگی کا راز ہے اور ہستیٔ مطلق کی زندگی میں تمام قسم کے تناقض جو ہستیٔ محدود کا خاصہ ہیں گداختہ ہو کر اس میں گھل مل جاتے ہیں۔

"کیمبرج کی تاریخ ہندوستان کے لیے جو مضمون اور لٹریچر مجھے لکھنا ہے اس میں اس شعر کا ضرور ذکر کروں گا۔ اسی رنگ کے فلسفیانہ اشعار اور بھی لکھیے کہ خود بھی لذت اٹھاؤں اور اوروں کو بھی اس لذت میں شریک کر دوں"[۱]

اکبر بھی اقبال کے اس خلوصِ محبت کے معترف تھے۔ وہ خود ایک خط میں کہتے ہیں:

"ہست مجلس برآں قرار کہ بود ہست مطرب برآں ترانہ ہنوز

حافظ کا شعر یاد آیا۔ قریباً آبدیدہ ہو گیا۔ اقبال صاحب کو لکھ بھیجا کہ میں مخدومیت کا مستحق نہیں لیکن چاہتا ہوں کہ آپ کی عظمت اور محبوبیت قائم رہے"۔[۲]

ایک اور مقام پر اقبال کو یوں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:

---

[۱] شیخ عطاء اللہ، مرتب، کتاب مذکور، ۲/ ۴۲-۴۳۔
اکبر نے مولانا عبدالماجد دریا بادی کے نام ایک خط میں اسی شعر پر یوں اظہارِ خیال کیا ہے:

"اسی طرح جب میں نے یہ شعر کہا:

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں عقیدے عقل عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

اور جس کی داد ڈاکٹر اقبال صاحب نے دی اس وقت تک مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہیگل نے اس خیال کو وسعت دی ہے۔ آپ نے صفائیٔ بیان کی مجھ کو داد دی ہے۔ میں اس سے خوش ہوا۔ لیکن یہ صفائی بیان غالباً اس سبب سے آئی کہ میرا اوریجنل خیال ہے۔ اگر تقلید و ترجمہ کا سانچہ اس کو پیدا کرتا تو بے تکلفی نہ ہوتی"۔ (مولانا عبدالماجد دریا بادی، مرتب، "خطوطِ مشاہیر"، صفحہ ۸۰)۔

[۲] اختر انصاری اکبر آبادی، مرتب، کتاب مذکور، صفحہ ۱۷۴۔

"دعوئ علم و خرد میں جوش تھا اکبر کو رات
ہو گیا ساکت مگر جب ذکرِ اقبال آ گیا"

اقبال کی فرمائش پر

۱۹۱۳ء میں مچھلی بازار کانپور کی مسجد کے وضو خانے کو مقامی حکام نے سڑک کو سیدھا کرنے کے لیے گرا دیا۔ اس پر مسلمان مشتعل ہو گئے۔ مظاہرہ ہوا، گولی چلی، گرفتاریاں ہوئیں، مقدمہ چلا۔ اس سلسلے میں مسٹر مظہر الحق، بیرسٹر، پٹنہ، نے قابلِ ذکر خدمات انجام دیں۔ علامہ اقبال نے اکبر الہ آبادی سے درخواست کی کہ مسٹر مظہر الحق کی قومی خدمات کو سراہنا چاہیے۔ اکبرؔ نے ایک قطعہ کہا جو ہفت روزہ "توحید" میں اس طرح درج ہے:[۱]

"اکبری سارٹیفیکٹ
مسٹر مظہر الحق کو
حسب فرمائش حضرت اقبال

خدماتِ ملّت سے مخدوم و مکرم ہو گئے ٭ ان کا درجہ خلق میں باشان و رونق ہو گیا
عرش پر پہنچے ہیں مسجد کی طرفداری سے وہ ٭ حق پرستی سے عروجِ مظہر الحق ہو گیا

معرکۂ اسرارِ خودی

۱۹۱۵ء میں اقبال کی اولین شعری تصنیف مثنوی "اسرارِ خودی" (فارسی) شائع ہوئی۔ اس میں انہوں نے اپنی شاعری کے مرکزی موضوع "فلسفۂ خودی" کی تشریح کے ضمن میں افلاطون، عجمی تصوّف اور خواجہ حافظ شیرازی کے فراری رجحانات پر شدید تنقید کی، مثلاً حافظ کے متعلق لکھا:

آں فقیہِ ملّتِ مے خوارگاں ٭ آں امامِ امتِ بے چارگاں
بگذر از جامش کہ در مینائے خویش ٭ چوں مریدانِ حسن دارد حشیش!
بے نیاز از محفلِ حافظ گذر ٭ الحذر از گوسفنداں الحذر[۲]

---

۱ ہفت روزہ "توحید"، میرٹھ، ۱۶ ستمبر ۱۹۱۳ء۔
۲ "اسرارِ خودی"، پہلا ایڈیشن، صفحہ ۶۶-۲۔

اسی طرح مثنوی کے دیباچے میں اقبال نے نفیٔ خودی کے نظریے کی ابتدا، مسلمانوں میں اس کی اشاعت کے اسباب اور نتائج بیان کرنے کے بعد اسلامی تحریک کا مقصدِ وجود واضح کیا اور بتایا کہ مسلمان عجمی تصورات اور خواب آور شاعری کی بدولت مقصد کی لگن اور اس کو حاصل کرنے کی عملی جدوجہد سے محروم ہو گئے اور یہی چیز ان کے سیاسی و سماجی زوال کا باعث بن گئی۔ بہر حال عجمی تصوف اور حافظ شیرازی پر یہ تنقید علما اور صوفیا کے ایک گروہ کو مطلق اچھی نہ لگی۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ اقبال نے نفسِ تصوف کی مخالفت کی ہے۔ ان حضرات میں خواجہ حسن نظامی اور خان بہادر پیرزادہ مظفر احمد فضلی سب سے آگے تھے[۱] بعد میں خواجہ صاحب کے اثرات اور ذاتی رجحانات کی بدولت اکبر الہ آبادی بھی ان کے ہمنوا بن گئے۔ اقبال کو قدرتی طور پر اکبر ایسے روشن خیال شخص سے مخالفت کی توقع نہیں تھی۔ لہٰذا انہوں نے بڑے خلوص سے سببِ مخالفت رفع کرنے کی کوشش کی۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء کے خط میں وہ اکبر کو لکھتے ہیں:

---

۱ خواجہ حسن نظامی، جو درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے سجادہ نشین تھے، اس تنقید پر بہت جز بز ہوئے اور انہوں نے اپنی تحریروں میں اقبال کی مخالفت شروع کر دی جس کے نتیجے میں اقبال کو بھی نثر میں اپنا نقطۂ نظر واضح کرنا پڑا۔ ان کا ایک مضمون "اسرارِ خودی اور تصوف" کے عنوان سے "وکیل" امرتسر (۱۵ جنوری ۱۹۱۶ء)، دوسرا "سرِ اسرارِ خودی" اور تصوف" کے عنوان سے "وکیل" امرتسر (۹ فروری ۱۹۱۶ء) اور تیسرا "تصوفِ وجودیہ" کے عنوان سے "وکیل" امرتسر (۱۲ دسمبر ۱۹۱۶) میں شائع ہوا جس میں اقبال نے لفظ "سمن" پر بحث کی تھی۔ (دیکھیے مضمون "معرکۂ اسرارِ خودی" از محمد عبداللہ قریشی، مجلہ "اقبال" لاہور۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء اور اپریل ۱۹۵۴ء)۔

اسی سلسلے کا ایک مضمون "علم ظاہر و باطن" کے عنوان سے "وکیل" امرتسر (۲۸ جون ۱۹۱۶ء) میں شائع ہوا۔ یہ نامکمل تھا اور اسی حالت میں روزنامہ "جنگ" مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۶۷ء میں شاملِ اشاعت کیا گیا۔

خواجہ صاحب کے علاوہ پیرزادہ فضلی صاحب نے "اسرارِ خودی" کے رد میں "رازِ بیخودی" کے نام سے ایک مثنوی تحریر کی۔ اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

بندۂ دنیا بہ دنیا دیں فروش — سربسر ملت فروش آئین فروش

"کئی صدیوں سے علماء اور صوفیاء میں طاقت کے لیے جنگ رہی جس میں آخر کار صوفیاء غالب آئے۔ یہاں تک کہ اب برائے نام علماء جو باقی ہیں وہ بھی جب تک کسی نہ کسی خانوادے میں بیعت نہ لیتے ہوں ہر دلعزیز نہیں ہو سکتے۔ یہ روش گویا علماء کی طرف سے اپنی شکست کا اعتراف ہے۔ مجدد الف ثانی رح، عالمگیر اور مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہم نے اسلامی سیرت کے احیاء کی کوشش کی، مگر صوفیاء کی کثرت اور صدیوں کی جمع شدہ قوت نے اس گروہِ احرار کو کامیاب نہ ہونے دیا۔" [۱]

۱۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کو اکبر مولانا ماجد کے نام خط میں مثنوی "اسرارِ خودی" پر یوں تبصرہ فرماتے ہیں:

"دو نئی تصنیفیں نظر سے گزریں۔ ایک "معارج الدین" مصنفہ مولوی نواب علی، ایم۔اے، بڑودہ کالج جس میں سائنس و فلسفہ پر ریویو کر کے مصنف نے مذہب کی حمایت کی ہے۔ دوسری مثنوی "اسرارِ خودی" مصنفہ ڈاکٹر اقبال صاحب جس میں مصنف نے کہا ہے کہ اپنی خودی کو مٹانے والا فلسفہ جس کا مشرق پر بہت اثر ہوا صحیح نہیں ہے۔ خودی کو بڑھانا چاہیے۔ دونوں کتابیں آپ کے ملاحظہ کے قابل ہیں۔ مثنوی کی نسبت تو کچھ زیادہ نہ کہنا چاہیئے کیونکہ وہ مذہبی اور قومی جوش پر مبنی ہے:

ہست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص — می کند دیوانہ با دیوانہ رقص!!

یہ خود ہی مستی اور تصوف ہے۔ دیباچے میں پولیٹکل دانشمندی بھی ہے۔ البتہ "معارج الدین" بہت غور کے لائق ہے۔" [۲]

۲۷ جنوری ۱۹۱۶ء کے خط میں اقبال نے خواجہ حسن نظامی کے مخالفانہ رویے پر ناراضگی کا اظہار کیا لیکن ساتھ ہی اکبر سے یہ بھی کہا: "انشاء اللہ اختلافِ رائے کا اثر پرائیویٹ تعلقات پر نہ ہوگا۔" پھر خواجہ صاحب کا شکوہ کرتے ہیں کہ انھوں نے

---

[۱] شیخ عطاء اللہ، مرتب، کتاب مذکورہ، صفحہ ۲/ ۴۸-۴۹۔

[۲] عبدالماجد دریابادی، مرتب، کتاب مذکورہ، صفحہ ۸۲۔

علمی بحث کے بجائے انہیں بدنام کرنا شروع کر دیا۔" بہر حال وہ معذور ہیں اور صوفی ضرور ہیں مگر تصوف کی تاریخ اور ادبیات و علوم القرآن سے مطلق واقفیت نہیں رکھتے۔ اس واسطے مجھے ان کے مضامین کا مطلق اندیشہ نہیں ہے۔"[1] اسی خط میں اور اس کے بعد فروری ۱۹۱۶ء کے خط میں انہوں نے اکبر کو لکھا کہ وہ تصوف کی تاریخ لکھنے اور شائع کرنے نیز اس کے دیباچے منصور حلاج کے رسالے "کتاب الطواسین" کو شامل کرنا چاہتے ہیں۔[2]

علاوہ ازیں علامہ اقبال نے خواجہ صاحب کو بھی متعدد خط لکھے جن میں انہوں نے اپنے موقف کی وضاحت کی۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۱۵ء کو اقبال نے جو خط لکھا ہے وہ بہت معرکے کا ہے۔ اس میں اقبال نے اقرار کیا ہے کہ ان کا آبائی میلان تصوف کی طرف ہے اور یورپ کے فلسفے نے بھی اس میلان کو بڑھایا ہے۔ لیکن تدبر فی القرآن نے انہیں اصلاحِ حال کی طرف متوجہ کیا اور مسلمانوں کو اس ایرانی تصوف سے نجات دلانے پر آمادہ کیا جس کی رو سے شریعتِ اسلامی کو حقیر سمجھا جاتا ہے۔ اقبال نے اپنے نظریۂ تصوف کے بارے میں لکھا ہے:

"... اسلام کی تعلیم نہایت صاف و روشن ہے یعنی یہ کہ عبادت کے لائق صرف ایک ذات ہے۔ باقی جو کچھ کثرتِ نظامِ عالم میں نظر آتی ہے وہ سب کی سب مخلوق ہے گو علمی اور فلسفیانہ اعتبار سے اس کی کنہ اور حقیقت ایک ہی ہو۔"[3]

---

[1] شیخ عطاء اللہ، مرتب، کتاب مذکور، صفحہ ۴۹-۵۱۔ [2] ایضاً، صفحہ ۵۱-۵۳۔

[3] پروفیسر یوسف سلیم چشتی، "شرح اسرارِ خودی"، صفحہ ۳۹-۴۵۔

بقول پروفیسر چشتی یہ خط جو مضمون کی مانند ہے ۵ اجنوری کے "خطیب" دہلی میں شائع ہوا تھا۔ وہاں سے ۲۲ جولائی ۱۹۴۲ء کے "نوائے وقت" میں نقل کیا گیا۔ یہ خط غالباً اقبال کے خطوط کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ "تلاش پر معلوم ہوا کہ اول تو ۱۵جنوری کو "خطیب" شائع ہی نہیں ہوا۔ ۱۴جنوری کے شمارے میں یہ خط درج نہیں۔ حقیقت میں اقتباس اسی مضمون کا ہے جو "سرِ اسرارِ خودی" کے عنوان سے ۹ فروری ۱۹۱۶ء کے اخبار "وکیل" امرتسر میں شائع ہوا تھا (دیکھیے مجلہ "اقبال" لاہور، اپریل ۱۹۵۴ء، صفحہ ۴۶)۔ ["سرِ اسرارِ خودی" کے عنوان سے جو مضمون سید عبدالواحد معینی نے "مقالات اقبال" میں شامل کیا ہے، اس میں یہ عبارت نہیں ملی ــــ مدیر "اقبال"۔]

گویا وہ اتحاد، وصل اور فنا فی اللہ وغیرہ اصطلاحوں کے ساتھ معانی کو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ نہ سمجھتے تھے کیونکہ اس طرح رہبانیت کے غیر اسلامی تصور کو تقویت ملتی تھی۔ اقبال کی وضاحتوں کے باوجود نہ تو خواجہ صاحب مطمئن ہوئے اور نہ حضرت اکبر ہی کی تسلی ہوئی اور وہ دونوں حضرات ان کی "اسرار خودی" کے حوالے سے ان کے نظریات پر ناپسندیدگی اور ناخوشی کا اظہار کرتے رہے۔ اکبر ۱۱ جنوری ۱۹۱۶ء کو خواجہ حسن نظامی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

"حضرت اقبال نے میرے نزدیک تمہید میں احتیاط نہیں کی اور ایک بڑا مجموعہ دلوں کا مایوس و مغموم ہوگا لیکن اب وہ سنبھل کر مسئلۂ وحدت الوجود اور مسئلۂ رہبانیت پر گفتگو کریں گے۔ حضرت اقبال ہی خودی کو بڑھا کر "ہمہ منم" کہہ دیں تو مطلب حاصل ہے۔"

۲ فروری ۱۹۱۶ء کے خط میں خواجہ صاحب سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

"اقبال کی پروفیسری فارسی شاعری کے ساتھ مل کر مغرب و مشرق دونوں کے لیے خطرناک ہوگئی ہے۔ اللہ ان کے بیان کو زیادہ صاف کرے اور ہم پر اپنا فضل کرے اور صبر عطا فرمائے۔

۶ از کلیدِ دین درِ دنیا کشاد!

"اگر رسول اللہؐ کے رنگ میں لیا جائے تو لیسنس کی ضرورت ہے اور اگر دین صرف حصولِ دنیا کا ذریعہ سمجھا جائے جیسا کہ خود مصنف نے کیا ہے اور سب کر رہے ہیں تو ٹھیک ہے، لیکن کالج کو "کلید دین" کیوں کہا؟ بہرحال اقبال سے زیادہ نہ لڑیئے۔ دعائے ترقی دوستیٔ اقبال کیجیے۔"

خواجہ صاحب کے علاوہ انہوں نے دیگر دوستوں کے نام خطوط میں بھی اسی قسم کے جذبات و تاثرات کا اظہار کیا ہے مثلاً مولانا عبدالماجد دریا بادی کو ۶ اگست ۱۹۱۷ء کو لکھتے ہیں:

"حضرت اقبال معلوم نہیں کیوں تصوّف کے پیچھے پڑے ہیں۔ "نیو ایرا"، میں ان کا ایک مضمون چھپا ہے۔ میں نارمل صوفی کبھی نہیں ہوا نہ قوت نہ ضرورت، لیکن اوریجنل

فلاسفی تو عالمگیر مذاق ہے، اسلامی تصوّف خود کہتا ہے کہ خلافِ شریعت کچھ نہ ہو۔"[1]

۲۵ اگست ۱۹۱۷ء کو لکھتے ہیں:

"نیو ایرا" میں ایک آرٹیکل خواجہ صاحب کے خلاف چھپا اور اقبال صاحب کا ایک مضمون تصوف کے خلاف۔ اقبال صاحب کی طبیعت نے عجیب تنگ اور بے سود راہ اختیار کی ہے۔ دیدنی ہے جہانِ رنگا رنگ۔"[2]

یکم ستمبر ۱۹۱۷ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"اقبال صاحب کو آج کل تصوف پر حملے کا بڑا شوق ہے۔ کہتے ہیں کہ عجمی فلاسوفی نے عالم کو خدا قرار دے رکھا ہے۔ یہ غلط ہے، خلافِ اسلام ہے۔ میں نہیں جانتا یہ کیا ترنگ ہے۔ اسلام نے تو لیس کمثلہ شیء کہہ دیا ہے۔ آخر کتاب مسٹک فلاسوفی کی نکول نے جو آکسفورڈ میں پروفیسر ہے حال میں شائع کی ہے۔ مبسوط کتاب ہے۔ آپ کے دوست برگسن تک کا اس میں نوٹس لیا ہے۔ کثرت میں وحدت، وحدت میں کثرت ثابت ہے۔ ہندو فلاسوفی کو اسلام پر اعتراض ہے کہ اس نے خدا کو الگ سمجھا ہے حالانکہ اسلام نے نہ یہ کیا ہے نہ وہ کیا ہے۔ ہم کو یہ بحث ہی نہ چاہیے اور اس کا نتیجہ کیا۔"[3]

۱۱ جون ۱۹۱۸ء کے مکتوب میں رقم طراز ہیں:

"اقبال صاحب نے جب سے حافظ شیرازی کو علانیہ بُرا کہا ہے، میری نظر میں کھٹک رہے ہیں۔ ان کی مثنوی "اسرارِ خودی"، آپ نے دیکھی ہوگی۔ اب مثنوی "رموزِ بے خودی"، شائع ہوئی ہے۔ مَیں نے نہیں دیکھی، دل نہیں چاہا۔ خط و کتابت ہے لیکن مَیں ان کے انقلابِ طبیعت سے خوش نہیں ہوں۔ ہونا اچھا بننا بُرا۔ بہرکیف کوئی سیریس معاملہ نہیں ہے۔ دنیا میں بس یہی ہوتا آیا ہے۔"[4]

---

[1] عبدالماجد دریا بادی، مرتب، کتاب مذکور، صفحہ ۱۲۳۔
[2] ایضاً، صفحہ ۱۲۶۔
[3] ایضاً، صفحہ ۱۲۸-۱۲۹۔
[4] ایضاً، صفحہ ۱۳۵۔

اسی طرح اکبر سید سلیمان ندوی کو ۲۸ مئی ۱۹۱۷ء کو لکھتے ہیں:

"حسن نظامی کو آپ نے ٹوکا تھا۔ کچھ معلوم ہے، حضرت اقبال کدھر جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اپنا دل اپنا کام" [۱]

۲۵ جنوری ۱۹۱۶ء کو مرزا سلطان احمد کے نام خط میں اکبر فرماتے ہیں:

"خواجہ حسن نظامی صاحب کو مَیں نے بار بار یہی کہا کہ حضرت اقبال کی مثنوی کی مخالفت پر قلم نہ اٹھائیے۔ حضرت اقبال کو بھی مَیں نے نہ چاہا کہ بادۂ سخن کو چھوڑ کر محتسبِ فلسفہ کا دُرّہ اٹھائیں بعوض اس کے کہ ہم رندانِ بے سامان کے ساقی بنے رہیں، ہمارے سروں پر تیغ بکف آئیں۔ ہم کو ان سے محبت ہے:

آنچہ بخود پسندی [پسندی؟] بہ دیگراں مپسند

پر عمل کرتا ہوں، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ آپ کی غیور طبیعت میں پولیٹیکل اور قومی ہیجان زیادہ ہے۔ اگر عملی پہلو سے کچھ اثر نمایاں ہو تو کیا تعجب ہے، لیکن اس وقت تو روز افزوں تفرقہ باہمی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا ... زندگانی ایک سخت ڈیوٹی ہے، استمتاع نہیں ہے۔ مَیں نے شدید اقبال صاحب کو اپنا یہ شعر لکھا تھا:

واعظا این نہ جنوں است نہ کافر شدہ ام
اولت نا شدہ ختمست و من آخر شدہ ام" [۲]

علامہ اقبال کی حافظ شیرازی پر تنقید کے بارے میں ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر اقبال صاحب، صوفی صاحب، حافظ شیراز صاحب۔ سب کی حمایت:

نہ بسط دیکھتے ہیں اور نہ قبض دیکھتے ہیں
وہ ڈاکٹر ہیں زمانے کی نبض دیکھتے ہیں
وفا کا رنگ بدل جائے ہے یہاں سے بعید
فقط موافقِ موسم لکھی ہے اک تمہید

---

[۱] محمد نصیر ہمایوں، مرتب "رقعات اکبر"، صفحہ ۲۵۔
[۲] مکتوباتِ اکبر بنام مرزا سلطان احمد"، صفحہ ۱۴۱۔

عمل کا رخ نہیں قوت فزا مرض یہ ہے
کیا ہے نسخہ جو تحریر بس غرض یہ ہے
جہاں میں قوتِ بازو دکھائیے اس وقت
مراقبے سے ذرا سر اٹھائیے اس وقت
اٹھاؤ ان پہ نہ ہرگز تم اعتراض کا ہاتھ
یہی کہو کہ بہت خوب ہم ہیں آپ کے ساتھ
دکھائیے تو خدارا خودی کے جوہن کو
مراقبہ بھی اٹھا دے گا اپنی گہہ دن کو
شرابِ حضرت حافظ سے کچھ نہیں نقصان
زمارچ تا بہ مئی اس کا ہے فقط سامان
بس ایک ربع ہے کافی برائے مستی و حال
بقیہ سال ہے نذرِ طریقِ سعی و جدال
وہ خود ہی کہہ گئے ہیں یہ بہ پاسِ فکرِ معاش
سہ ماہ مے خور و نُہ ماہ پارسامی باش[۱]"

یہ امر یقیناً دلچسپ ہے کہ خود اکبر الہ آبادی اس سے پیشتر حافظ کے رنگ کی مذمت کر چکے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے مضمون "سرِ اسرارِ خودی" میں خواجہ حسن نظامی کے اعتراضات کے جوابات دیتے ہوئے اکبر الہ آبادی کا اس طرح ذکر کیا ہے:

"مضمون کا خاتمہ آپ نے مولانا اکبر (الہ آبادی) کے ایک مصرعہ پہ کیا ہے یعنی:

"خودی خدا سے جھکے بس یہی تصوف ہے"

یہ میرا عین مذہب ہے اور میرے نزدیک میری مثنوی اسی مصرعہ کی ایک تفسیر ہے۔ مگر آپ کو معلوم ہو کہ یہ مولانا اکبر جن کا یہ مصرع ہے کون ہیں۔ یہ وہی مولانا اکبر ہیں جن کا یہ شعر ہے:

---

[۱] "مکتوباتِ اکبر بنام مرزا سلطان احمد"، صفحہ ۴۲۔

ان میں باقی ہے کہاں خالدِ جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظِ شیراز کا رنگ

"یہ وہی مولانا اکبر ہیں جو اس مثنوی کے اشعار اور اس کے دینی مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے ایک پرائیویٹ خط میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"وہ آپ کے مطمحِ نظر جو امر ہے اگر میں اس کی قدر نہ کروں تو مسلمان نہیں ہمیرے اور آپ کے لیے اس خضرِ ظلمات کا ارشاد کافی ہے۔" [۱]

اکبر ۲۲ نومبر ۱۹۱۶ء کو مرزا سلطان احمد کو لکھتے ہیں:

"حسن نظامی صاحب کا محرم نامہ آپ نے دیکھا ہوگا۔ حضرت اقبال کے خیالات کے متعلق امامت و خلافت سے بھی اطلاع ہوئی ہوگی۔ زمانے نے بے چین کر دیا ہے۔ بلند طبیعتیں اصلاح کی فکر میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ جمعیتِ خاطر عطا فرمائے۔ اس کا فضل چاہیے۔ بحثوں میں تو انتشار ہی انتشار ہے۔ یورپ میں یہی رنگ دیکھتا ہوں۔ آج ایک کتاب لکھی جاتی ہے کل اس کی تردید چھپتی ہے۔" [۲]

۱۳ دسمبر کے خط میں ارشاد فرماتے ہیں:

"ڈاکٹر اقبال صاحب بلاشبہ نہایت عالی خیال بزرگ ہیں اور اسلامی جماعت کے ترقی خواہ۔ ان کی طبیعت نہایت غیور واقع ہوئی ہے۔ خدا مدد کرے۔" [۳]

۲۸ جولائی ۱۹۱۷ء کے ہفت روزہ "نیو ایرا"، لکھنؤ میں اقبال کا ایک مضمون شائع ہوا۔ اس کا ایک حصّہ اسلام اور تصوّف Islam and Mysticism کے موضوع سے

---

[۱] عبدالواحد، مرتب، "مقالاتِ اقبال"، صفحہ ۱۸۱۔

[۲] "مکتوباتِ اکبر بنام مرزا سلطان احمد"، صفحہ ۴۷۔
خواجہ حسن نظامی نے اسلامی تاریخ کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ پہلا حصّہ "میلاد نامہ" اور دوسرا "محرم نامہ" تھا۔ اس میں آنحضورؐ کی وفات کے بعد خلافت کے تنازعوں، جنگِ جمل و صفین، شہادتِ امام حسین کے اسباب، معرکۂ کربلا وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی تھی۔

[۳] ایضاً، صفحہ ۴۷۔

متعلق تھا[۱] جس میں انہوں نے عجمی تصوّف کی خرابیوں پر بحث کرتے ہوئے نوجوانوں کو اس سے بچنے کی تلقین کی :

"Muslim youngmen! Beware of the mystifier. His noose has now been too long round your neck. The regeneration of the Muslim world lies in the uncompromising, ethical Monotheism which was preached to the Arabs thirteen hundred years ago. Come, then, out of the fogs of Persianism and walk into the brilliant desert-sunshine of Arabia.

جناب محمد عبداللہ قریشی نے اس کا یوں ترجمہ کیا ہے :

"نوجوان مسلمانوں ! اس شعبدہ بازی سے خبردار رہو۔ شعبدہ بازوں کی کمند بڑی مدت سے تمہاری گردنوں میں پڑی ہوئی ہے۔ دنیائے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا انحصار اس پر ہے کہ بڑی سختی سے غیر مصالحانہ انداز کی اس توحید کو اپنا لیا جائے، جس کی تعلیم تیرہ سو سال پیشتر عربوں کو دی گئی تھی۔ عجمیت کے دھندلکے سے باہر نکلو اور عرب کے درخشاں صحرا کی روشنی میں آجاؤ۔"

ایک خط میں اقبال کے اس مضمون پر اکبر یوں تبصرہ فرماتے ہیں :

"نیو ایرا، جو لکھنؤ سے انگریزی میں نکلنا شروع ہوا ہے۔ ۲۸ جولائی کا پرچہ حضرت اقبال نے میرے پاس بھجوا دیا ہے۔ اس میں ان کا ایک آرٹیکل تصوّف کے خلاف چھپا ہے مگر میں نہیں جانتا وہ کونسا اسلامی تصوّر تصوّف ہے جو انسان کو دنیا میں سعی سے روکتا ہے۔"[۲]

ایک تو اکبر طویل عرصے سے ضعف و نقاہت کا شکار تھے اور پھر خواجہ صاحب کی تحریروں نے بڑی حد تک اقبال سے اختلاف کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس لیے نہ تو وہ کسی کتاب کو غور و خوض سے پڑھ سکتے تھے اور نہ ان کے لیے "اسرارِ خودی" پر غیر

---

[۱] ملاحظہ ہو، ایس۔ اے۔ واحد کی مرتبہ انگریزی کتاب **..oughts and Recollections of Iqbal** ۸۳

[۲] محمد رحیم دہلوی، "اکبر خطوط کے آئینے میں"، مندرجہ اختر انصاری اکبر آبادی، مرتب کتاب مذکور، ص ۱۷۳-۱۷۴
"نیو ایرا" (انگریزی) لکھنؤ سے نکلتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر راجہ غلام حسن، بی۔اے۔ تھے جو مولانا محمد علی جوہر کے خاص رفیقِ کار اور "کامریڈ" میں کام کرتے رہے تھے۔

جانبدارانہ تبصرہ کرنا آسان تھا۔ تاہم جب معاملہ کسی حد تک سدھرنے لگا تو انہوں نے ادھر توجہ کی۔ ۱۹ر اپریل ۱۹۱۸ء کے خط سے اکبر کے اس رجحان کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے:

"د اسرارِ خودی، کی تمہید لکھ چکا ہوں۔ میرے کلمات [کلیات؟] کے حصۂ اول میں صفحہ ۹۵ پر ایک شعر آپ ملاحظہ فرمائیں گے:

خودی وبے خودی دونوں میں عکسِ صورتِ جاناں
اسی کو جلوہ گر پاتے ہیں جس عالم میں جاتے ہیں

یہ شعر ابتدائی زمانے کا ہے، لیکن "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" دونوں پر حاوی ہے۔ مولانا روم اور مسٹر تلک کا مرکب بہت قوی مانا جاتا ہے۔ جو کچھ ہو میں نے تو اسے پڑھا ہی نہیں۔" [1]

اسی زمانے کے لگ بھگ خواجہ حسن نظامی نے ہندوؤں کے نامور اوتار سری کرشن جی مہاراج کی سوانح عمری "کرشن بیتی" شائع کی۔ چونکہ اقبال نے "اسرارِ خودی" کے دیباچے میں کرشن جی کے متعلق لکھا تھا:

"بنی نوع انسان کی ذہنی تاریخ میں سری کرشن کا نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیا جائے گا کہ اس عظیم الشان انسان نے ایک دلفریب پیرائے میں اپنے ملک و قوم کی فلسفیانہ روایات کی تنقید کی اور اس حقیقت کو آشکار کیا کہ ترکِ عمل سے مراد ترکِ کلی نہیں ہے کیونکہ عمل اقتضائے فطرت ہے اور اسی سے زندگی کا استحکام ہے۔" [2]

---

[1] "مکتوباتِ اکبر بنام مرزا سلطان احمد"، صفحہ ۵۴-۵۵۔ مولانا ماجد "اکبر کے مطالعے اور سوچنے کی عادت کے بارے میں لکھتے ہیں: "اکبر پڑھتے کم تھے، سوچتے زیادہ تھے۔ دوسروں کے خیالات جذب کم کرتے۔ خود انہی کے خیالات اُبلتے زیادہ تھے۔ فلسفہ خواں اور فلسفہ داں کم تھے، دانش اور حکمت آفریں زیادہ تھے اور اُن کی ذہانت بے پناہ تھی" (کتاب مذکور، ص ۳۹)۔

[2] سید عبدالواحد، مرتب، کتاب مذکور، صفحہ ۱۵۵۔

اس لیے اکبر نے کوشش کی کہ اس کے ذریعے اقبال اور خواجہ صاحب میں مصالحت ہو جائے یا کم از کم معاملہ زیادہ نہ بڑھنے پائے۔ نیز تصوف و سلوک کے دقیق مسائل اخبارات و جرائد میں زیر بحث نہ آئیں کیونکہ اس سے پیچیدگیاں بڑھنے کا احتمال تھا۔ لہٰذا انہوں نے ۱۵ جولائی ۱۹۱۶ء کو خواجہ صاحب کے نام خط میں یوں اظہارِ مدعا کیا:

"ڈاکٹر اقبال صاحب نے "اسرارِ خودی" کے دیباچے میں شری کرشن جی کو قابلِ تعریف ادب کے ساتھ یاد کیا ہے اور ان کی تعلیم کو برقرار رکھا ہے۔"

اکبر کو معلوم ہوا کہ اقبال خواجہ حسن نظامی سے ملاقات کرنے اور غلط فہمیوں کو رفع کرنے کے خواہشمند ہیں تو بہت خوش ہوئے۔ اس لیے انہوں نے ۹ اگست ۱۹۱۶ء کے خط میں خواجہ صاحب کو اس نیک کام پر آمادہ کرنے کی کوشش کی:

"میں بہت خوش ہوا کہ ڈاکٹر اقبال صاحب نے آپ سے ملنے کا شوق ظاہر کیا۔ میں نے ان کا خط دیکھ کر آپ کو مخاطب کر کے چند شعر کہے:

اے خواجہ حسن کرو نہ اقبال کو رد
قومی رکنوں کے ہیں نگہباں وہ بھی
تم محو ہو حسن کی تجلی میں اگر
ہیں دشمنِ فتنۂ رقیباں وہ بھی
پریوں کے لیے جنون ہے تم کو اگر
دیوؤں کے لیے بنے سلیمان وہ بھی"[۱]

بعد ازاں ۲۵ جولائی ۱۹۱۸ء کے خط میں اقبال نے اکبر کو لکھا کہ وہ خواجہ صاحب سے ملاقات کا بہت اشتیاق رکھتے ہیں لیکن موقعہ نہ مل سکا:

---

[۱] اختر انصاری اکبر آبادی، مرتب، کتاب مذکور، صفحہ ۱۷۷۔

"وہ کچھ عرصہ ہوا یہاں تشریف لائے تھے۔ میں نے اصرار کیا کہ ایک روز قیام فرمائیں لیکن وہ ٹھہر نہ سکتے تھے۔ زبانی باتیں ہوتیں تو بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتیں۔ لیکن جو کچھ بھی ہو، اس سے اس محبت میں کمی واقع نہیں ہو سکتی جو مجھ کو ان سے ہے۔" [1]

اسی سلسلے میں ایک موقع پر اکبر نے یہ شعر بھی خواجہ صاحب کو لکھ بھیجے (ہفت روزہ "خطیب" میں ان اشعار کا عنوان "ویرانہ میں دیوانوں کا رقص" قائم کیا گیا ہے)؛

حضرتِ اقبال اور خواجہ حسن — پہلوانی ان میں، ان میں بانکپن
حب نہیں ہے زور شاہی کیلئے — آؤ گنہ جائیں خدا ہی کے لیے
ورزشوں میں کچھ تکلف ہی سہی — ہاتھا پائی کو تصوف ہی سہی
ہست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص — می کند دیوانہ با دیوانہ رقص [2]

اسی قطعے کے متعلق اقبال نے ۴ فروری ۱۹۱۶ء کے خط میں اکبر کو لکھا:

"آپ کا قطعہ "حضرت اقبال اور خواجہ حسن" بہت خوب رہا۔ صرف ایک بات ہے کہ خواجہ صاحب کو تو کبھی رقص اور سکر نصیب ہوتا ہوگا، میں اس نعمت سے محروم ہوں۔" [3]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دلی احترام کے باوجود اقبال نے اکبر کی رائے پر دبی زبان میں احتجاج کیا۔ دراصل اکبر اپنے رنگِ طبیعت سے مجبور تھے۔ وہ صحیح یا غلط طور پر اقبال کو تصوف کا مخالف سمجھتے تھے، لیکن یہ کبھی نہیں چاہتے تھے کہ اس مخالفت کا اظہار عوام کے سامنے کیا جائے۔ اس لیے وہ اقبال کی علانیہ مخالفت کو ختم کرنے کے خواہشمند تھے جیسا کہ ۲۸ جنوری ۱۹۱۸ء کے خط سے معلوم ہوتا ہے جو انہوں نے خواجہ صاحب کو لکھا:

---

[1] شیخ عطاء اللہ، مرتب، کتاب مذکور، صفحہ ۲/۶۴۔
[2] ہفت روزہ "خطیب"، دہلی، جلد ۳، شمارہ ۴، ۳۰ جنوری ۱۹۱۶ء۔
[3] شیخ عطاء اللہ، مرتب، کتاب مذکور، صفحہ ۲/۵۳۔

"اقبال صاحب ہمارے اور آپ کے دوست ہیں۔ میں نے انہیں لکھا ہے کہ اپنی دینداری کو ہمارے لیے رحمتِ الٰہی ثابت کیجیئے۔ اللہ ہم سب پر رحم فرمائے۔"

اسی طرح مرزا سلطان احمد کے نام ایک خط میں اپنے مصالحانہ رویے کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں :

"میں نے اگرچہ اپنی دانست میں اس غیر ضروری چھیڑ چھاڑ کو پسند نہیں کیا۔ جملہ مباحث طے شدہ ہیں اور یوں تو دنیا ہے۔ میں نے مکرر خواجہ صاحب کو لکھا کہ بالکل خاموش رہیں لیکن ان سے نہ رہا گیا۔ ڈاکٹر سے بھی عرض کیا لیکن وہ غالباً ڈیوٹی سمجھ کر مصروف رہے۔" [۱]

گو اکبر علامہ اقبال سے تصوف کے معاملے میں کاملاً متفق نہیں تھے بلکہ اختلاف رکھتے تھے، لیکن اقبال کے شاعرانہ مقام اور مرتبے کے قائل ضرور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اختلاف کے باوجود اقبال کی قدردانی سے دست برداری اختیار نہیں کی بلکہ جہاں تک ہو سکا مصالحانہ رویہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن خواجہ موصوف بھلا آسانی سے کہاں چھوڑنے والے تھے۔ انہوں نے ایک مدت تک نہ تو خود اقبال سے اتفاق کیا اور نہ اکبر کو ایسا کرنے دیا۔ اگر یہ مخالفت علمی بنیادوں پر ہوتی تو کوئی بات بھی تھی، اس کی بنیاد تو اکثر و بیشتر تعصب پر استوار تھی۔

اس سلسلے میں خواجہ صاحب اس لیے معذور تھے کہ اقبال کے نظریۂ تصوف کو تسلیم کرنے سے ان کی گدی نشینی وغیرہ کا سلسلہ کیسے جاری رہ سکتا تھا اور اکبر مرحوم کی روش اس لیے قابلِ چشم پوشی تھی کہ وہ عادتاً یا سن رسیدہ ہونے کی وجہ سے معاملے کو سرسری طور پر دیکھتے تھے۔ علامہ نے اکبر کو اپنے نظریے کی حقیقت سے آگاہ کرنے کے لیے ۱۱ جون ۱۹۱۸ء کو خط لکھا جس میں

---

[۱] "مکتوبات اکبر بنام مرزا سلطان احمد"، صفحہ ۶۴۔

انہوں نے شکایت کی کہ اکبر نے اصل مثنوی دیکھے بغیر رائے قائم کر لی ہے :

"پہلے عرض کر چکا ہوں کہ کون تصوّف میرے نزدیک قابلِ اعتراض ہے۔ مَیں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ نئی بات نہیں۔ حضرت علاؤ الدولہ سنجانیؒ لکھ چکے ہیں، حضرت جنید بغدادی لکھ چکے ہیں۔ مَیں نے تو محی الدین اور منصور حلاج کے متعلق وہ الفاظ نہیں لکھے جو حضرت سنجانیؒ اور جنیدؒ نے ان دونوں بزرگوں کے متعلق ارشاد فرمائے ہیں۔ ہاں ان کے عقاید اور خیالات سے بیزاری ضرور ظاہر کی ہے۔ اگر اسی کا نام مادیت ہے تو بخدائے لایزال، مجھ سے بڑھ کر مادہ پرست دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔ معاف کیجئے گا، مجھے آپ کے خطوط سے یہ معلوم ہُوا ہے (ممکن ہے غلطی پر ہوں) کہ آپ نے مثنوی اسرارِ خودی کے صرف وہی اشعار دیکھے ہیں جو حافظ کے متعلق لکھے گئے تھے۔ باقی اشعار پر شاید نظر نہیں فرمائی۔ کاش آپ کو ان کے پڑھنے کی فرصت مل جاتی کہ آپ ایک مسلمان پر بدظنی کرنے سے محفوظ رہتے۔"

پھر کہتے ہیں :

"اسرارِ خودی میں حافظ پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو خارج کر کے اور اشعار لکھے ہیں جن کا عنوان یہ ہے "درحقیقتِ شعر و اصلاحِ ادبیاتِ اسلامیہ"۔ ان اشعار کو پڑھ کر مجھے یقین ہے کہ بہت سی غلط فہمیاں دُور ہو جائیں گی اور میرا اصل مطلب واضح ہو جائے گا۔" [1]

اس کے بعد ۲۰ جولائی ۱۹۱۸ء کے خط میں فلسفۂ خودی کی اس طرح تشریح فرماتے ہیں :

"مَیں اس خودی کا حامی ہوں جو سچی بے خودی سے پیدا ہوتی ہے یعنی جو

---

[1] شیخ عطاء اللہ، مرتب، کتاب مذکور، ۲/۵۵-۵۶۔

اقبال نے "رموزِ بے خودی" کے دیباچے میں بھی یہی تصریح کی ہے۔ ملاحظہ ہو سید عبدالواحد معینی، مرتب، کتاب مذکور، صفحہ ۱۹۱-۱۹۲۔

نتیجہ ہے ہجرت الی الحق کرنے کا، اور جو باطل کے مقابلے میں پہاڑ کی طرح مضبوط ہے . . مگر ایک اور بے خودی ہے جس کی دو قسمیں ہیں :

"(۱) ایک وہ جو Lyric Poetry کے پڑھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ اس قسم سے ہے جو افیون و شراب کا نتیجہ ہے۔

"(۲) دوسری وہ بے خودی ہے جو بعض صوفیۂ اسلامیہ اور تمام ہندو جوگیوں کے نزدیک ذاتِ انسانی کو ذاتِ باری میں فنا کر دینے سے پیدا ہوتی ہے اور یہ فنا ذاتِ باری میں ہے، نہ احکامِ باری تعالیٰ میں۔

"پہلی قسم کی بے خودی تو ایک حد تک مفید بھی ہو سکتی ہے مگر دوسری قسم تمام مذہب و اخلاق کے خلاف جڑ کاٹنے والی ہے۔ میں ان دو قسموں کی بے خودی پر معترض ہوں اور بس۔ حقیقی اسلامی بے خودی میرے نزدیک اپنے ذاتی اور شخصی میلانات، رجحانات و تخیلات کو چھوڑ کر اللہ کے احکام کا پابند ہو جانا ہے، اس طرح پر کہ اس پابندی کے نتائج سے انسان بالکل لاپروا ہو جائے اور محض رضا و تسلیم کو اپنا شعار بنائے۔ یہی اسلامی تصوّف کے نزدیک 'فنا' ہے، البتہ عجمی تصوّف فنا کے کچھ اور معنی جانتا ہے جس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔ خواجہ حافظ رح پر جو اشعار میں نے لکھے تھے ان کے مقاصد کچھ اور تھے۔ آیاتِ قرآنی جو آپ نے لکھی ہیں زیرِ نظر ہیں۔ میں ان کے وہی معنی سمجھتا ہوں جو آپ کے ذہن میں ہیں۔ حیاتِ دنیا بے شک لہو و عب ہے . . . .

"غرض یہ ہے کہ سلطنت ہو، امارت ہو، کچھ ہو، بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہے بلکہ یہ ذرائع ہیں اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول کے۔ جو شخص ان کو بجائے خود مقصد جانتا ہے وہ رضوا بالحیٰوۃ الدنیا میں داخل ہے۔ کوئی فعل مسلمان کا ایسا نہ ہونا چاہیے جس کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ کے سوا کچھ اور ہو . . . .[۱]

---

[۱] شیخ عطاء اللہ، مرتب، کتاب مذکور، ۲/ ۵۹ - ۶۲۔

حضرت اکبر کی مصالحانہ کوششوں سے اقبال اور خواجہ حسن نظامی کی ناراضگی ختم ہو گئی۔ تاہم اکبر نے بزرگانہ انداز میں اقبال کے نظریات پر تنقید و تبصرہ کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۲۷ مئی ۱۹۱۸ء کے خط میں سید سلیمان ندوی کو ان کے ایک مضمون "اہلِ سنہ" کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"آپ نے مُلّا و صوفی کی نظم کو خوب زندگی بخشی۔ اقبال صاحب اس سے خوش نہ ہوئے۔ خط آیا لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ کس حق سے مُلّا بنتے ہیں۔ میں تو صوفی بنتا نہیں۔ شاعری کا کچھ مذاق ہے اگرچہ بقول آپ کے شاعری اور تصوف اور فلسفہ سب ایک ہے۔ اقبال صاحب لکھتے ہیں کہ "میں پرسنل خدا کو مانتا ہوں"، جس کے معنی ہوئے شخصی۔ یہ لفظ مغربی مصنفوں نے اختیار کیا ہے بمقابلہ فلاسفۂ اسلام کے خدا کے جس کا وجود عالم ہی کے ساتھ اور اسی میں طاری و ساری ہے، الگ نہیں ہے۔ اقبال صاحب کا مطلب ہے کہ ہندو فلاسفی الگ خدا کو نہیں مانتی اور صوفی بھی ہمہ اوست کہتے ہیں لیکن میں پرسنل خدا کو مانتا ہوں۔ اس باب میں آپ نے صحیح لکھا ہے کہ یہ بحث ہی نہ کرنا چاہیے۔ اسی نے اختلاف ڈالا ہے۔ جو قرآن میں ہے وہی کہو۔ پرسنل گاڈ کہنا اتنا ہی بے جوڑ ہے جس قدر ہمہ اوست کہنا، بلکہ ہمہ اوست میں تو ایک بات ہے، عربی الفاظ اور قرآن کی اصطلاح چھوڑ کر پرسنل گاڈ کیا معنی؟ یہ میں آپ کو پرائیویٹ طور پر لکھتا ہوں، مجھ کو کچھ معلوم نہیں کہ وہ کیا پوزیشن یا درجہ اپنا قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن اقبال صاحب نیک نیتی سے احتیاط کا پہلو اختیار کرتے ہیں۔ پروفیسر بھی تو ہیں۔"[1]

اکبر کی نظر میں اقبال کے صوفیانہ افکار اتنے اہمیت اختیار کر گئے تھے

---

[1] محمد نصیر ہمایوں، مرتب، کتاب مذکور، ۲/ ۵۹ — ۶۲۔

یہاں "مُلّا و صوفی" کے عنوان سے جس نظم کی طرف اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے: (باقی بر ص ۱۴۱)

کہ وہ اپنی نجی گفتگوؤں میں بھی ان کو نشانۂ تنقید و تعریض بناتے رہتے تھے۔ مولوی قمرالدین راوی ہیں کہ

"[اکبر] نے فرمایا: ڈاکٹر اقبال نے تصوف اور حضرت حافظ شیرازی رح پر جو اعتراضات کیے ہیں ان سے مجھے رنج ہُوا اور یہ شعر نکل گئے:

مولوی ہو ہی چکے کٹنے نذرِ کالج اس سے قبل
خانقاہیں رہ گئی تھیں اب ہے ان کا انہدام
لکچر و مضمون لکھتے ہیں تصوف کے خلاف
الوداع اے ذوقِ باطن الوداع اے فیضِ عام

اقبال کی یہ تحقیق کہ حافظ کی شرابِ عرفان حقیقت میں انگور اور میوے کی شراب تھی بذاتِ خود کسی معجونِ فلک سیر کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے:

بنیاد ڈالتے ہیں وہ حکمت کے باغ کی
وہسکی سے ہو رہی ہے صفائی دماغ کی"[1]

اسی طرح ۱۳ ستمبر ۱۹۱۹ء کے "روزنامچے" میں رقمطراز ہیں:

"فرمایا، ڈاکٹر اقبال نے تصوف کے خلاف جو ہنگامہ برپا کر دیا ہے اس پر مَیں نے کہا:

تقلیدِ غرب و ترکِ عبادت پہ ہیں خموش
لے بیٹھے ہیں وہ صوفیٔ خانہ خراب کو

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۷

گو کہ دونوں ہی نظر آتے ہیں نیک
ایک ظاہر ایک ہیں باطن کی ٹیک
مَیں نے پوچھا ایک اور آگے ہوئے
دے جواب اس کا تمہاری طبعِ نیک
بے تکلف کہہ دیا مُلا نے دو
حضرتِ صوفی یہ بولے پھر بھی ایک

یعنی مُلا کی نظر ظاہر پر پڑی ہے اور صوفی کی باطن پر۔ اعداد کی ظاہری کثرت میں ایک کی وحدت مضمر ہوتی ہے۔ ایک اور ایک بظاہر دو ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں دو کا عدد ایک ہی کا دو چند ہوتا

[1] مولوی قمرالدین بدایونی، مرتب، "بزمِ اکبر"، صفحہ ۷۷۔

قرآن سمجھ لیں گے ذرا پاس تو ہولیں!
والناس کبھی دیکھیں گے ذرا ناس تو ہولیں[۱]

۲۷ اپریل ۱۹۲۰ء کا "روزنامچہ" ملاحظہ ہو:

"فرمایا اقبال صاحب نے حافظ اور تصوف کے خلاف ایک علیحدہ مورچہ قائم کیا ہے۔ میں نے انہی خیالات سے متاثر ہو کر کہا ہے:

لیڈر کو دیکھتا ہوں تصوف پہ معترض
کالج کے کیڑے پڑ گئے دلقِ فقیر میں
تمہاری شاعری یہ پھلجڑی ہے یا پٹاخا ہے
یہ حافظ ہی کی محفل ہے جہاں کا سَادِھا قَا ہے"[۲]

اسی طرح ۱۲ مئی ۱۹۲۱ء کے خط میں سر عبدالقادر کو علامہ اقبال کی یورپ میں مقبولیت کے سلسلے میں اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کرتے ہیں:

"مجھ کو معلوم ہو چکا تھا کہ ڈاکٹر اقبال کی مثنوی انگلستان میں پسند ہوئی۔ مجھ کو یہ شعر یاد آیا:

رقیب سرٹیفکیٹ دیں تو عشق ہو تسلیم
یہی ہے عشق تو اب ترکِ عاشقی اولیٰ

میں اقبال صاحب کی قدر اس سبب سے نہیں کرتا کہ دربارِ لندن میں وہ مقبول ہیں:

طالب ہوں میں تو اپنے ہی دل کی نگاہ کا
سودا نہیں ہے مجھ کو حریفوں کی آہ کا

لیکن وہ بھی کیا کریں مجبور ہیں۔ میں تو زندگی ختم کر چکا۔ اور ہمیشہ ادھر سے بے نیاز رہا۔ وہ تعلیم ہی نہیں۔ میں نے تو دو چار لفظوں میں اپنا مطلب ادا کر دیا ہے:

۱۔ ایضاً، صفحہ ۸۴۔
۲۔ ایضاً، صفحہ ۱۳۷۔

عشق کو کیوں بے خودی مقصود ہے
حسن بے حد ہے خودی محدود ہے"[1]

آخر کار جب اقبال نے دیکھا کہ حافظ پر لکھے گئے اشعار اور تصوف کے خلاف لکھے گئے دیباچے سے مقصد حاصل ہو چکا ہے اور اس بحث مباحثے سے مفید نتائج بر آمد نہیں ہو رہے، نیز ان کے والد کا بھی یہی مطالبہ ہے، تو انہوں نے "اسرارِ خودی" کے دوسرے ایڈیشن میں "دیباچہ" اور "خواجہ حافظ شیرازی" پر لکھے گئے ۳۵ اشعار خارج کر دیئے۔ "اسرارِ خودی" کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۱۸ء میں شائع ہُوا۔ اس کے صفحے کے مختصر سے دیباچے میں حضرت علامہ نے دیباچہ حذف کرنے اور خواجہ حافظ کے متعلق اشعار میں ترمیم کرنے کی وجہ بتائی ہے:

"اگرچہ ان سے محض ایک ادبی نصب العین کی تنقید مقصود تھی اور خواجہ حافظ کی شخصیت سے سروکار نہ تھا تاہم اس خیال سے کہ یہ طرزِ بیان اکثر احباب کو ناگوار ہے مَیں نے ان اشعار کو نکال کر ان کی جگہ نئے اشعار لکھ دیئے ہیں جن میں اس اصول پر بحث کی ہے جس کی رُو سے میرے نزدیک کسی قوم کے لٹریچر کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا چاہیے۔ پہلے ایڈیشن کے اردو دیباچے کی اشاعت بھی

---

[1] محمد نصیر ہمایوں، مرتب، کتاب مذکور، صفحہ ۱۳۸ - ۱۳۹۔
"اسرارِ خودی" کا انگریزی ترجمہ پروفیسر نکلسن نے کیا اور ۱۹۲۰ء میں شائع ہُوا جس پر یورپ کے بلند پایہ نقادوں نے علمی جریدوں میں زوردار تبصرے کیے۔ اکبر کو اقبال کی یہ شہرت و مقبولیت بہرحال پسندِ خاطر نہ ہوئی۔ اس سلسلے میں مولوی قمر الدین صاحب کے "روزنامچے" (کتاب مذکور، صفحہ ۸۱) میں سے ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے: (اکبر نے) فرمایا: اقبال کی مثنوی کا یورپ میں ترجمہ ہُوا اور اس کو بہت داد دی گئی۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ فارسی زبان، ایشیائی فلسفہ اور عرفان اور اس کے یورپین قدردان۔ اس پر اقبال صاحب شاداں و فرحاں اور اگر اہلِ ایران جو اہلِ زبان ہیں داد دیتے تو ایک امتیازی بات بھی تھی۔ مَیں اس یورپین ترجمے اور داد کو ہرگز قابلِ افتخار نہیں سمجھتا۔ مَیں نے اسی پر کہا ہے:

رقیب سرٹیفکیٹ دیں تو عشق ہو تسلیم یہی ہے عشق تو اب ترکِ عاشقی اولیٰ

ضروری نہیں سمجھی گئی ہے ۔ ؎

اور یوں یہ معاملہ کسی حد تک ختم ہو گیا اور اکبر کو اقبال کے کردار کی بلندی اور کشادہ دلی کا معترف ہونا پڑا۔ ایک خط میں فرماتے ہیں:

"حضرت اقبال کی مشغولی فی الطاعۃ سے نہایت خوشی ہوئی۔ اس سے دل لگ جائے تو سلطنت ہیچ ہے:

چوں مجنوں سر برآورد از تہِ خاک — ندا آمد بہ او از ایزدِ پاک

کہ اے مجنوں چہ آوردی بدرگاہ — برآمد از دلِ مجنوں یکے آہ

کہ چنداں شورِ لیلیٰ در سرم بود — کجا پروائے روزِ محشرم بود

"جب لیلیٰ کے تصور میں یہ محویت تھی تو لیلیٰ آفریں کی محبت میں کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں ان کو مبارک باد لکھوں گا۔ انجمن کے جلسے میں وہ مجھے اصرار و شوق کے ساتھ مدعو کرتے ہیں۔ میری اسیری و معذوری کے حالات سے وہ آگاہ ہیں۔ خدا مسبب الاسباب ہیں شاید نجات پا جاؤں"

خواجہ حسن نظامی نے "محرم نامہ" لکھا تو اکبر نے ایک خط میں اس کے حوالے سے "اسرارِ خودی" کی شاعرانہ عظمت کا یوں اعتراف کیا ہے: "محرم نامہ اسرارِ خودی تک نہیں پہنچا مگر ہے قابلِ داد" ؎

ایک خط میں خودی اور بے خودی کی توضیح یوں فرماتے ہیں:

"ڈاکٹر اقبال نے بھی سری کرشن مہاراج کا ذکرِ خیر "اسرارِ خودی" میں کیا ہے۔ جناب امیر کی بھی بہت مدح کی ہے۔ سر علی امام صاحب کے نام معنون فرمایا

؎ علامہ نے قریب قریب یہی باتیں ۷ / مئی ۱۹۱۹ء کے ایک خط میں مولانا محمد اسلم جیراجپوری کو لکھی تھیں (ملاحظہ ہو شیخ عطاء اللہ، مرتب، کتاب مذکور، ۱/۵۲)

؎ "مکتوباتِ اکبر بنام مرزا سلطان احمد"، صفحہ ۲۹۔

ہے ۔۔۔ "اسرارِ خودی" کی توضیح میں میں نے واحد صاحب کو ایک مطلع (قطعہ ؟)
لکھ بھیجا ہے ۔ دو چار لفظ ہیں لیکن توضیح ہو گئی :

عشق میں کیوں بے خودی مقصود ہے
حسن بے حد ہے خودی محدود ہے
منکشف ہو جائیں اسرارِ خودی
بے خودی کا بھی یہی دستور ہے"[۲]

اکبر و اقبال کی ملاقاتیں

اکبر و اقبال کے درمیان ہونے والی ابتدائی خط و کتابت سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال حضرت اکبر سے ملاقات کے بے حد خواہشمند تھے۔ ۱۹۱۳ء کے اوائل میں دونوں میں پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ اس کا علم اس خط سے ہوتا ہے جو انہوں نے ۲۷ جنوری کو مرزا سلطان احمد کے نام لکھا :

"ڈاکٹر اقبال صاحب نے بڑی زحمت اٹھائی۔ صرف چند گھنٹوں کے لیے مجھے ملنے کو الہ آباد تشریف لائے تھے۔

دوسری مرتبہ اسی سال ستمبر کے قریب ملاقات ہوئی جبکہ علامہ اسیرانِ کانپور کے سلسلے میں الہ آباد بھی گئے۔ اکبر مولانا ماجد کے نام ۱۰ ستمبر ۱۹۱۳ء کو لکھتے ہیں :

"علیل تھا۔ پھر مہمانوں کا سلسلہ رہا۔ کل ڈاکٹر اقبال صاحب جو مجھ سے ملنے کے لیے تشریف لائے تھے دہلی گئے۔ اس سبب سے جوابِ خط اب تک نہ لکھ سکا۔"[۱]

اسی طرح ۱۹۱۵ء میں بھی علامہ اقبال اکبر سے ملنے گئے۔ وجہ سفر محض اکبر کی ملاقات تھی۔ تین سال بعد ۱۹۱۸ء میں اقبال نے اپنی آمد کی اطلاع دی تو اکبر بیحد

---

[۱] مولانا عبد الماجد دریا بادی، مرتب، کتاب مذکورہ، صفحہ ۴۸۔

سرور ہوئے۔ اپنی اس مسرت کی طرف اپنے خط میں یوں اشارہ کرتے ہیں :

"کل ڈاکٹر صاحب کا خط آیا ہے کہ ۱۶ یا ۱۷ مارچ کو میں الہ آباد آؤں گا اور اور میرے ساتھ ایک اور صاحب ہوں گے جو صرف آپ ہی کے اشتیاق میں آئے ہیں۔ تین سال پیشتر اقبال صاحب جب میرے مہمان ہوئے تھے مجھی سے ملنے آئے تھے۔ دو دفعہ تشریف لائے تھے۔ اس وقت میں اس قدر دل گرفتہ اور ضعیف نہ تھا۔ تاہم دلچسپی کی امید ہے۔ ڈاکٹر صاحب سوشل طور پہ ایک نعمت ہوں گے۔" [1]

غالباً یہ ملاقات دسمبر ۱۹۱۹ء تک نہیں ہو سکی۔ ۲۵ نومبر ۱۹۱۹ء اور ۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کے خطوط میں ماجد صاحب کو لکھتے ہیں کہ اقبال اور مرزا سلطان احمد ملنے کے لیے آنے والے ہیں۔ [2]

۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کے خط میں لکھا: "ڈاکٹر اقبال ملنے آئے تھے۔ تین دن رہ کر گئے۔ کہتے ہیں آپ کے ساتھ رہتا تو ایک مجموعہ مرتب کرتا۔" [3]

مولانا ماجد کی سفارش

اکبر کو اقبال پر بہت اعتماد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی کی سفارش اقبال سے کی کہ وہ انہیں یونیورسٹی میں اردو لیکچرار کی ملازمت

---

[1] اختر انصاری اکبر آبادی، مرتب، کتاب مذکور، صفحہ ۱۷۴۔

[2] مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مرتب، کتاب مذکور، صفحہ ۱۷۶ - ۱۷۷۔

[3] اس کے برعکس سید عشرت حسین صاحب کے بیان کے مطابق (کتاب مذکور، ص ۲۲)، اقبال اکبر سے صرف دو مرتبہ ملنے آئے: "ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم نے دو دفعہ محض حضرت قبلہ کی ملاقات کیلئے الہ آباد کا سفر کیا۔ دونوں دفعہ عشرت منزل میں ٹھہرے۔"
بہت ممکن ہے کہ عشرت صاحب نے سنی سنائی بات نقل کر دی ہو، یا محض قیاس سے کام لیا ہو، کیونکہ وہ بسلسلۂ ملازمت اکثر گھر سے دُور رہتے تھے۔ متن میں مندرج خطوط اس بات کے شاہد ہیں کہ اقبال اور اکبر کے مابین کم از کم چار مرتبہ ملاقات ہوئی۔ کاش ان ملاقاتوں کی تفصیل مل جاتی تو اکبر کی شخصیت کے کئی [illegible]

دلوادیں۔ ۹ فروری ۱۹۱۵ کے خط میں اکبر نے دریا بادی صاحب کو لکھا ہے :

"میں آپ کے خط کو ڈاکٹر اقبال صاحب کے پاس بھیجتا ہوں۔ اگر کوئی دوسری تجویز پیشِ نظر نہ ہوئی تو ڈاکٹر صاحب غالباً لحاظ فرمائیں گے۔"[1]

۱۱ فروری کو دوبارہ لکھتے ہیں:

"میں نے اسی وقت ایک طویل تحریر کے ساتھ جس میں مختصراً آپ کے اوصاف مندرج تھے مع آپ کے خط کے ڈاکٹر اقبال صاحب کو بھیج دیا تا کہ وہ آپ کی پاکیزہ اور ستھری زبان اردو کو خود سیکھ لیں۔"[2]

ڈاکٹر اقبال نے خط کا جواب ارسال کیا جسے اکبر نے ماجد صاحب کو بھیج دیا۔ اکبر کے ۱۵ فروری کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں اقبال اور ماجد کی ملاقات ضروری تھی۔ "ڈاکٹر صاحب کا خط بجنسہٖ ارسال خدمت ہے۔ کاش آپ کی ان سے ملاقات مراسلت ہو جاتی۔"[3]

۲۱ مارچ ۱۹۱۵ء کو رقم طراز ہیں:

"حضرت اقبال صاحب کا خط آیا ہے۔ یہ فقرہ اسی میں ہے 'عبدالماجد صاحب کی نسبت رجسٹرار یونیورسٹی کو لکھا ہے۔ دیکھیے سنڈیکیٹ اردو لیکچرر شپ کا کیا فیصلہ کرتی ہے۔'"[4]

معلوم ہوتا ہے کہ کام بن نہیں سکا کیونکہ اس کے بعد کسی خط میں اس بات کا ذکر نہیں ملتا یا یہ کہ مولانا دریا بادی صاحب کا ارادہ ہی بدل گیا۔

آموں کے تحفے

اکبر مرحوم ڈاکٹر صاحب پر کس قدر شفقت فرماتے تھے؟۔ اس کا اندازہ کرنا

---

[1] عبدالماجد دریا بادی، مرتب، کتاب مذکور، صفحہ ۷۴۔
[2] ایضاً، صفحہ ۷۵۔
[3] ایضاً، [4] ایضاً، صفحہ ۷۷۔

مشکل ہے۔ چونکہ اقبال کو آموں سے خاص رغبت تھی اور اس کا علم اکبر کو بھی تھا، اس لیے وہ الہ آباد سے آموں کے ٹوکرے بطورِ تحفہ بھجوایا کرتے تھے، ایک دفعہ لنگڑا آم کا پارسل بھیجا تو اقبال نے شکریے میں یہ شعر لکھ بھیجا جس نے بڑی شہرت حاصل کی :

اثر یہ تیرے اعجازِ مسیحائی کا ہے اکبرؔ
الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا

نظمِ اقبال کی تعریف

۱۴ دسمبر ۱۹۱۸ء کے خط میں اقبال نے اکبر سے درخواست کی کہ وہ "شکوہ اور جوابِ شکوہ" کی نئی اشاعت کا دیباچہ تحریر کریں :

" ایک نہایت مخلص نوجوان یہاں لاہور میں ہے، تاجرِ کتب ہے اور مجھ سے کہتا ہے کہ "شکوہ اور جوابِ شکوہ" کو پھر شائع کرنا چاہیے، مگر مولانا اکبر دیباچہ لکھیں میں نے آپ کی طرف سے ہر چند عذر کیا مگر وہ مصر ہے۔ آخر میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ مولانا کی خدمت میں عرض کروں گا۔ ایسی فرمائش کرتے ہوئے حجاب آتا ہے کہ مجھے آپ کے ضعف و ناتوانی کا حال معلوم ہے۔ تاہم اگر کسی روز طبیعت شگفتہ ہو اور آلام و افکار کا احساس شگفتگیِ طبع سے کم ہو گیا ہو تو دس پندرہ سطور اس کی خاطر لکھ ڈالیے۔ یہ لڑکا آپ کا غائبانہ مربد ہے۔"[1]

اکبر نے دیباچہ لکھا یا نہیں اور اگر لکھا تو چھپا یا نہیں۔ اس کے بارے میں بالتحقیق معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ ان کے کلام میں "ڈاکٹر اقبال کی ایک نظم کی تعریف" کے عنوان سے دو شعر ضرور ملتے ہیں، اور مرتب نے حاشیہ میں لکھا ہے: "یہ تحقیق نہیں

---

[1] شیخ عطاء اللہ، مرتب، کتاب مذکور، صفحہ ۲/ ۶۹-۷۰۔

ہو سکا کہ علامہ اقبال کی کس نظم کی تعریف میں یہ شعر کہے گئے تھے[1]، حالانکہ یہ رباعی اقبال کی نظم "شمع اور شاعر" کے بارے میں ہے جو آپ نے انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس ۱۹۱۲ء میں پڑھ کر سنائی۔ وہ اتنی مقبول ہوئی کہ اس کے بعض اشعار لوگوں کی زبان پر چڑھ گئے۔ روزنامہ "زمیندار" نے اپنی ۱۱ اپریل ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں اس پر تعریفی نوٹ لکھا اور چند بند شائع کیے۔ حضرت اکبرالہ آبادی نے یہ دیکھ کر ۱۳ اپریل ۱۹۱۲ء کو مندرجہ ذیل خط مدیر "زمیندار" کے نام لکھا جو ۱۹ اپریل ۱۹۱۲ء کو شائع ہوا:

"ڈاکٹر اقبال صاحب کی نظم کے دو تین بند جو زمیندار میں چھپے ہیں میں نے دیکھے۔ وہ نظم اس کی مستحق ہے کہ اس کی مدح کی جائے۔ یہ رباعی پیش کرتا ہوں:

اس نظم کا نقطہ نقطہ ہے منبعِ نور — ہر حرف سے ہے تجلیٔ حق کا ظہور
اوجِ ملکوت کا ہے عالم ہر لفظ — ہر بیت اقبال کی ہے بیت المعمور"[2]

کلامِ اکبر کی تضمین

یہ حقیقت ہے کہ ایک شاعر جب کسی بڑے شاعر سے عقیدت کا اظہار کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ وہ اس کے کلام میں تضمین کرے۔ یہ تضمین تائید کا رنگ لیے ہوئے ہوتی ہے۔ تضمین کرنے والا بجا طور پر یہ سمجھتا ہے کہ اس طرح وہ اپنے بیان کو زیادہ مؤثر اور مستند بنا رہا ہے۔ فروری ۱۹۱۹ء کے لگ بھگ اکبر نے یہ شعر کہا جیسا کہ اس خط سے ظاہر ہوتا ہے جو انہوں نے ۱۱ فروری ۱۹۱۹ء کو سید سلیمان ندوی کے نام لکھا:

طاعتِ باری سے دل کو شاد رکھ
ان وعد اللہ حق یاد رکھ[3]

---

[1] بھتیا احسان الحق، مرتب، کتاب مذکور، ۳۹۶/۱۔

[2] ماہنامہ "ادبی دنیا"، لاہور، بابت اپریل۔مئی ۱۹۷۰ء۔

[3] محمد نصیر ہمایوں، مرتب، کتاب مذکور، صفحہ ۸۰۔

علامہ اقبالؒ نے اس پیغام کو جو اہمیت دی وہ مندرجہ ذیل اشعار سے ظاہر ہے:

گرچہ تو زندانیٔ اسباب ہے — قلب کو لیکن ذرا آزاد رکھ
عقل کو تنقید سے فرصت نہیں — عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ
اے مسلماں ہر گھڑی پیشِ نظر — آیۂ لا یخلف المیعاد رکھ
یہ لسان العصر کا پیغام ہے — ان وعد اللہ حق یاد رکھ

لسان العصر پر مضمون

علامہ اقبالؒ نے اکبرؔ کی شاعری پر انگریزی میں ایک مضمون سپردِ قلم کیا۔ اس کا عنوان تھا: [1]

Touch of Hegelianism in Lisan-ul-Asr Akbar.

اس میں انہوں نے اکبر کے اس شعر:

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے عقل عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

پر بہت عمدہ تبصرہ کیا۔ یہ مضمون "نیو ایرا"، لکھنؤ میں شائع ہوا۔ اس کی اطلاع مولانا ماجد نے اکبر کو دی تو اکبر نے ۲۲ مارچ ۱۹۱۹ء کو اس کی نقل بہم پہنچانے کی فرمائش کی:

"اگر مطول مضمون نہ ہو تو اس کی نقل بخط صاف بھیج دیجئے، کم سے کم جو فقرات خاص ہوں۔ کاتب کی اجرت دے دی جائے گی۔" [2]

شاید یہ پرچہ ماجد صاحب کی فائل سے گم ہو گیا۔ لہٰذا وہ تعمیلِ حکم نہ کر سکے۔ اس صورتِ حال کا علم اکبر کو ہوا تو انہوں نے ۲۷ مارچ ۱۹۱۹ء کے خط میں فرمایا:

"نیو ایرا کا کچھ خیال نہ کیجئے۔ اس کو دیکھ کر اس کا ماحصل دو سطروں میں

---

[1] دیکھیں ایس۔ اے۔ واحد کی مذکورہ انگریزی کتاب، صفحہ ۸۷ - ۸۹۔
[2] مولانا عبدالماجد دریا بادی، مرتب، کتاب مذکور، صفحہ ۱۴۸۔

اُردو میں بشرطِ فرصت مجھ کو لکھ دیجئے گا، نوٹ کرلوں گا۔ تاریخ ۱۸ اگست ۱۹۱۸ء دریافت ہوگئی کافی ہے۔" [1]

کلامِ اکبرؔ کی داد

اقبال نے کچھ عرصہ اسلامیہ کالج میں فلسفے کے پروفیسر کی حیثیت سے فرائضِ تدریس سرانجام دیئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے اکبر الہ آبادی کو ۲۸ نومبر ۱۹۱۸ء کو جو خط لکھا وہ ان کے تعلیمی نظریات میں بڑی اہمیت رکھتا ہے:

"جواب لکھنے میں تاخیر ہوئی جس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ آج کل معمول سے زیادہ مصروفیت ہے۔ اسلامیہ کالج لاہور کے پروفیسر فلسفہ ڈاکٹر ہیگ چیچک کی بیماری سے دفعتہً انتقال کر گئے اور انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے اصرار پر دو ماہ کے لیے کالج کی ایم۔ اے۔ کی جماعت مجھ کو لینی پڑی۔ امید ہے دو ماہ تک نیا پروفیسر مل جائے گا۔ یہ لڑکے شام کو ہر روز میرے مکان پر آجاتے ہیں۔ دن میں جو تھوڑی بہت فرصت ملتی ہے اس میں ان کے لیکچر کے لیے کتب دیکھتا ہوں۔ لیکچر کیا ہیں، انسان کی ذہنی مایوسیوں اور ناکامیوں کا افسانہ ہے جسے عرفِ عام میں تاریخِ فلسفہ کہتے ہیں۔ ابھی کل شام ہی میں اُن کو آپ کا یہ شعر سُنا رہا تھا:

میں طاقتِ ذہن غیر محدود جانتا تھا، خبر نہیں تھی\
کہ ہوش مجھ کو ملا ہے تُل کر نظر بھی مجھ کو ملی ہے نپ کر

"سبحان اللہ! کیا خوب کہا ہے۔ جزاک اللہ!

"بہرحال ان لیکچروں کے بہانے سے ان لڑکوں کے کان میں کوئی نہ کوئی مذہبی نکتہ ڈالنے کا موقع مل جاتا ہے:

جان حاضر ہے مگر راہِ خدا ملتی نہیں" [2]

---

[1] ایضاً، صفحہ ۱۴۹۔

[2] شیخ عطاء اللہ، مرتب، کتاب مذکور، ۲/۷۳-۷۴

اکبر کی نصیحت اقبال کو

ایک خط میں اکبر نے اقبال کو نصیحت کی کہ وہ اپنے والدِ ماجد کا خاص خیال رکھیں۔ غالباً ان کا خیال ہوگا کہ جس طرح ان کے صاحبزادے سید عشرت حسین انہیں لندن جا کر بھول گئے تھے، اسی طرح اقبال بھی اپنے والد کی خدمت نہ کرتے ہوں گے۔ اس پر اقبال نے ۱۳ اگست ۱۹۱۸ء کو سیالکوٹ سے انہیں خط لکھا جس میں اپنے طرزِ عمل کی یوں وضاحت فرمائی:

"واقعی آپ نے سچ فرمایا کہ ہزار کتب خانہ ایک طرف اور باپ کی نگاہِ شفقت ایک طرف۔ اسی واسطے تو جب کبھی موقع ملتا ہے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں اور پہاڑ پر جانے کی بجائے ان کی گرمیِ صحبت سے مستفید ہوتا ہوں۔"[1]

اکبر کی وفات پر

اکبر الہ آبادی نے ایک مہینے کی شدید نقاہت اور ضعف کے بعد ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو وفات پائی۔ اقبال کو روزنامہ "زمیندار" لاہور کے ذریعے اس حادثۂ فاجعہ کا علم ہوا۔ انہوں نے پہلے تو ۱۲ ستمبر ۱۹۲۱ء کو اکبر کے صاحبزادے سید عشرت حسین کے نام ایک تار ارسال کیا جس کا مضمون یہ تھا:

"Heart felt Sympathy. India loses a great personality

پھر اسی تاریخ کو ایک مفصل تعزیت نامہ ارسال کیا جس سے اقبال اور اکبر کے باہمی تعلقات پر روشنی پڑتی ہے:

"ابھی 'زمیندار' سے آپ کے والدِ بزرگوار (اور میرے مرشدِ معنوی) کے انتقالِ پُر ملال کی خبر معلوم ہوئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

"اس بات کا ہمیشہ قلق رہے گا کہ ان سے آخری ملاقات نہیں ہو سکی۔

"میں اور میرے ایک دوست قصد کر رہے تھے کہ ذرا گرمی کم ہو جائے تو ان کی زیارت کے لیے الہ آباد کا سفر کریں۔ انہوں نے اپنے آخری خط میں مجھے

---

[1] ایضاً، ۲/۲۶۔

لکھا بھی تھا کہ "امسال ضرور ملنا، بعض باتیں ایسی ہیں کہ خطوط میں نہیں سما سکتیں۔ میری بدنصیبی ہے کہ میں اُن کے آخری دیدار سے محروم رہا۔ ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں میں مرحوم کی شخصیت قریباً ہر حیثیت سے بے نظیر تھی۔

"اسلامی ادیبوں میں تو شاید آج تک ایسی نکتہ رس ہستی پیدا نہیں ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ تمام ایشیا میں کسی قوم کے ادبیات کو اکبر نصیب نہیں ہوا۔ فطرت ایسی ہستیاں پیدا کرنے میں بڑی بخیل ہے۔ زمانہ سینکڑوں سال گردش کھاتا رہتا ہے جب آ کے ایک اکبر اُسے ہاتھ آتا ہے۔

"کاش اس انسان کا معنوی فیض اس بدقسمت ملک اور اس کی بدقسمت قوم کے لیے کچھ عرصہ اور جاری رہتا۔

"خدا تعالیٰ اپنے حبیب کے صدقے ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ میں نے ابھی ایک تار بھی آپ کو دیا ہے۔"[۱]

۱۶ ستمبر ۱۹۲۱ کو مولانا گرامی جالندھری کے نام ایک خط میں اقبال نے اکبر کی وفات پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے ان کی عظمت پر اس طرح تبصرہ کیا ہے:

"اکبر مرحوم بے نظیر آدمی تھے۔ وہ اپنے رنگ کے پہلے اور آخری شاعر تھے۔ مگر شاعری کو چھوڑ کر ان کا پایۂ روحانیات میں کم بلند نہ تھا۔ اس بات کی خبر شاید ان کے عزیزوں کو بھی نہ تھی۔ یوں کئی سال سے ان کے وقت کا بیشتر حصہ قرآن پڑھنے میں گزرتا تھا اور ان کی زندگی رفیقِ اعلیٰ سے ملنے کے لیے ایک تڑپ تھی۔ مگر گذشتہ دو سال سے تو وہ موت کے بہت متمنی تھے کہ کوئی خط مشکل سے ہوگا جس میں انہوں نے اس خواہش کا اظہار نہ کیا ہو۔

"ایک انگریز مصنف لکھتا ہے کہ جوں جوں ہماری عمر بڑھتی ہے زندگی سے محبت ہوتی جاتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ طویل العمری سے عروسِ حیات سے

---

[۱] سید عشرت حسین، مرتب، کتاب مذکورہ، صفحہ ۱۶۲-۱۶۳۔

ہمارا اختلاط بڑھتا رہتا ہے، اور اختلاط کا نتیجہ اُنس ہوتا ہے۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہوئیں نے تو یہ کلمہ صوفی اکبر مرحوم کی صورت میں صحیح نہ پایا۔ خدا ان کو غریقِ رحمت کرے۔ مسلمانانِ ہند کو اپنے اس نقصان کا شاید پورا پورا احساس نہیں ہے۔" [1]

اکبر کا مرثیہ

اپنے انہی مخلصانہ جذبات کے اظہار کے لیے انہوں نے اکبر کا مرثیہ کہا:

دریغا کہ رخت از جہاں بست اکبر　　حیاتش بحق بود روشن دلیلے

سر ذروۂ طورِ معنی کلیمے!!　　بہ بت خانۂ دورِ حاضر خلیلے

نوائے سحرگاہِ او کارواں را　　اذانِ درائے پیامِ رحیلے

ز دلہا بر افگندہ لات و عزیٰ　　بجانہا کشائیندۂ سلسبیلے

دماغش ادب خوردۂ عشق و مستی

دلش پرورش دادۂ جبرئیلے" [2]

اقبال کا خراجِ تحسین

اسی زمانے کے لگ بھگ علامہ اقبالؒ نے پنڈت جواہر لعل نہرو اور بعض قادیانی رسائل وغیرہ کی تنقید کے جواب میں اپنے مشہورِ زمانہ مضامین سپردِ قلم فرمائے۔ ان میں سے ایک مضمون "قادیانی اور جمہور مسلمان" ہے۔ اس میں انہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کے دعویٰ نبوت کے تمدنی و اجتماعی اثرات پر بحث کرتے ہوئے اکبر الہ آبادی کو ملتِ اسلامیہ کا شاعرِ عظیم قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

---

[1] محمد عبد اللہ قریشی، مرتب، "مکاتیبِ اقبال بنام گرامی"، صفحہ ۱۷۷-۱۷۸۔

[2] "یہ مرثیہ پیامِ مشرق کے پہلے ایڈیشن میں شائع ہوا تھا مگر بعد کے ایڈیشنوں سے علامہؒ نے حذف کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ "پیامِ مشرق" میں علامہؒ کے پیشِ نظر زیادہ تر وہ مسائل تھے جن کا تعلق اقوام و ملل کی موت اور زندگی سے تھا اور مرثیہ کی نوعیت ایک دوست کا نوحہ ہونے کی حیثیت سے صرف شخصی اور ذاتی تھی" (سید عبد الواحد و محمد عبد اللہ قریشی، مرتبہ، "باقیاتِ اقبال"، صفحہ ۲۳۹)۔

"۔۔۔ ہندوستان میں کوئی مذہبی سٹے باز اپنی اغراض کی خاطر ایک نئی جماعت کھڑی کر سکتا ہے اور یہ لبرل حکومت اصل جماعت کی وحدت کی ذرہ برابر پروا نہیں کرتی۔ بشرطیکہ یہ مدعی اسے اپنی اطاعت اور وفاداری کا یقین دلا دے اور اس کے پیرو حکومت کے محصول ادا کرتے رہیں۔ اسلام کے حق میں اس پالیسی کا مطلب ہمارے شاعرِ عظیم اکبرؔ نے اچھی طرح بھانپ لیا تھا جب اس نے اپنے مزاحیہ انداز میں کہا:

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ
انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ [1]

---

[1] لطیف احمد شروانی، مرتب، "حرفِ اقبال"، صفحہ ۱۱۷۔

مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبالؒ

سیاسی پس منظر۔ اقبالؔ اور جوہرؔ تحریکِ آزادی کے قافلہ سالار تھے۔ دونوں کی قربتوں اور فاصلوں کا جائزہ لینے سے پیشتر ضروری ہے کہ ان کے عہد کے سیاسی حالات پر ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے۔ انگریزوں نے برِ صغیر پر اپنا قبضہ مستحکم کر لیا تو انہوں نے ایک منظم سازش کے ذریعے مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کو آگے بڑھانا شروع کیا۔ ہندوؤں نے انگریزوں کی اس مسلم دشمن حکمتِ عملی سے خوب فائدہ اٹھایا اور تعلیمی، معاشی اور سیاسی میدان میں تیزی سے ترقی کرنے لگے۔ ۱۸۸۵ء میں حکومت کے ایما پر جب ایک نیم سیاسی تنظیم آل انڈیا نیشنل کانگریس کے نام سے وجود میں آئی تو اس کے در و بام پر ہندو ہی مسلط ہو گئے۔ ہندوؤں نے کانگریس کو نمائندہ اور مفادات کا آلۂ کار بنانے کے لیے جو ناروا حربے استعمال کیے ان سے مسلم رہنماؤں کو بے حد تشویش ہوئی۔ خاص طور پر سیّد احمد خاں نے مسلمانوں کو کانگریس سے دُور رہنے اور اپنے طور پر منظم ہونے کی طرف متوجہ کیا۔ ابھی یہ سلسلہ بالکل ابتدائی مرحلے میں تھا کہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم واقعہ رونما ہوا۔ ۱۹۰۵ء میں انگریزی حکومت نے بعض انتظامی وجوہ کی بنا پر بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ متحدہ بنگال میں مسلمان ہندو سرمایہ داروں اور زمینداروں کے بے رحم تسلط کا شکار تھے۔ اب جو ان کی اکثریت پر مشتمل مشرقی بنگال الگ ہوا تو انہوں نے سُکھ کا سانس لیا۔ مسلمانوں نے اس کامیابی کو مستحکم کرنے کے لیے مزید اقدامات کا آغاز کیا۔ یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو سر آغا خاں کی سرکردگی میں مسلمان زعما کے ایک وفد نے وائسرائے ہند سے ملاقات کی اور جداگانہ انتخاب اور منتخب ارکان پر مشتمل اداروں میں مسلمانوں کیلئے مخصوص نشستوں میں اضافے کے مطالبات پیش کیے۔ وائسرائے نے یہ مطالبات منظور کر لیے۔[1]

۱؎ اس موقع پر وائسرائے لارڈ منٹو نے وعدہ کیا کہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق اور مفادات کا مکمل
(باقی بر صفحہ ۱۵۴)

اس کے بعد مسلم اکابرہ کا ایک اجلاس دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں منعقد ہوا جس میں آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کا فیصلہ کیا گیا تاکہ مسلمانوں کے مطالبات کے سلسلے میں منظم کوشش کی جائے۔ اس جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے اصلاحات کے تحت جو قانون بنا اس میں جداگانہ انتخاب کے اصول کی توثیق کر دی گئی۔ اُدھر ہندوؤں نے تقسیم بنگال کے خلاف پوری قوت سے احتجاج شروع کر دیا۔ حکومت اوپر اوپر تو مسلمانوں کی دلجوئی کرتی رہی لیکن اندر ہی اندر اس نے ہندوؤں کی احتجاجی تحریک کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اپنی تمام یقین دہانیوں کے باوجود اس نے ۱۹۱۱ء میں اچانک تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان پر مسلمان بے حد پریشان ہوئے اور وہ اس حقیقت کو پا گئے کہ انگریزی حکومت پر بھروسہ کرنا سراسر نادانی ہے۔ لہٰذا مسلم لیگ نے بھی ذرا جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہندوستان کے حالات کے موافق حکومت خود اختیاری کے اصول کو اپنا نصب العین قرار دے دیا۔

محمد علی جوھر کی سرگرمیاں۔ ۱۹۰۶ء کے اجلاس مسلم لیگ میں چونکہ علی گڑھ تحریک سے وابستہ زعما نے اہم کردار ادا کیا تھا اس لیے ایک علیگ کی حیثیت سے مولانا محمد علی جوہر نے بھی سرگرم حصہ لیا۔ انہوں نے نہ صرف اس اجلاس میں شرکت کی بلکہ اس کی رُوداد بھی قلم بند کی جو ایک کتابچے کی صورت میں شائع ہوئی۔ ۱۹۰۷ء میں انہوں نے "ٹائمز آف انڈیا" بمبئی میں ہندوستانی عوام میں بڑھتے ہوئے اضطراب کے موضوع پر مضامین لکھے، جو بعد میں
Thoughts on Present Discontent.
کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۶) تحفظ کیا جائے گا۔ ہندوستان میں کوئی بھی جمہوری نظام رائج کرتے وقت یہاں کے مخصوص سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حالات اور مختلف قوموں کی ضروریات پیش نظر رکھی جائیں گی۔ ۱۹۰۹ء کے قانون میں اس وعدے کو عملی صورت دی گئی۔

Struggle for Independence 1857-1947.
(A Pictorial Record, Karachi - 1958)

تقسیم بنگال۔ ۱۴ جنوری ۱۹۱۱ء کو محمد علی نے کلکتہ سے "کامریڈ" کے نام سے انگریزی اخبار جاری کر دیا۔ "کامریڈ" میں ان کی انگریزی انشا پردازی کے جوہر کھلے۔ ہندوستان نے یوں تو انگریزی زبان کے کئی بلند پایہ ادیب اور صحافی پیدا کیے لیکن محمد علی جوہر کی گرد کو بھی کوئی نہ پہنچ سکا۔ ان کی تحریر و تقریر اس قدر زوردار اور مؤثر ہوتی تھی کہ بڑے بڑے اہلِ قلم اور خطیب داد دیئے بغیر نہ رہتے تھے۔ بہرحال محمد علی نے ذاتی محنت و قابلیت سے میدانِ صحافت میں بہت جلد قابلِ رشک مقام حاصل کر لیا۔ ہندوستانی انگریزی دان حلقوں کے علاوہ خود انگریز بھی "کامریڈ" کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھنے لگے۔ "کامریڈ" کی ادارت نے جوہر کے سیاسی قد کاٹھ میں بھی بہت اضافہ کیا۔ دسمبر ۱۹۱۱ء میں جب تقسیمِ بنگال کے فیصلے کو منسوخ کیا گیا اور دارالحکومت کو کلکتہ سے دہلی منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو مسلمانوں نے تقسیمِ بنگال کی تنسیخ پر اظہارِ رنج و غم کے ساتھ ساتھ دارالحکومت کی منتقلی پر قدرے اطمینان کا اظہار کیا۔ علامہ اقبال نے ۱۴ دسمبر ۱۹۱۱ء کو عطیہ بیگم کے نام اپنے مکتوب میں لکھا کہ ان کے نزدیک تقسیمِ بنگال کی تنسیخ سے اگر ہندوؤں کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا ہے تو کیا؟ دارالحکومت کی تبدیلی سے ان کی کامیابی کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے یہ قطعہ بھی تحریر کیا:

مندمل زخمِ دلِ بنگال آخر ہو گیا　　　وہ جو تھی پہلے تمیز کافر و مومن گئی!
تاجِ شاہی آج کلکتے سے دہلی آ گیا　　　مل گئی بابو کو دھوتی اور پگڑی چھن گئی[۱]

لطف یہ کہ محمد علی جوہر کا نقطۂ نظر بھی تقریباً یہی تھا۔ وہ بھی دارالحکومت کی کلکتہ سے منتقلی کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے تھے، لیکن فرق یہ ہے کہ اقبال نے اس سلسلے میں کوئی تقریر کرنے یا اخباری بیان جاری کرنے کے بجائے ایک نجی خط میں اظہارِ خیال کیا جب کہ محمد علی جوہر نے ہر ممکن طریقے سے مسلم رائے عامہ کی ترجمانی کی۔ انہوں نے نہ صرف "کامریڈ" میں تقسیمِ بنگال کی تنسیخ کے فیصلے پر شدید تنقید کی[۲] بلکہ مسلم لیگ کے

---

[۱] عطیہ بیگم "اقبال"، (ترجمہ عبدالعزیز خالد)، صفحہ ۷۸ - ۷۹۔
[۲] افضل اقبال، مرتب، Writings of Maulana Mohammed Ali. ۲۶۲

اجلاس ۱۹۱۲ء میں بھی ایک قرارداد کے ذریعے حکومت کو اس فیصلے کی سنگینی کا احساس دلایا۔[1] تاہم انہوں نے دارالحکومت کی دہلی منتقلی کے اقدام کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔[2] اس سے اقبال اور جوہر دونوں کے مزاج اور رویے میں جو فطری فرق اور اختلاف تھا اس کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ بعض معاملات میں تقریباً یکساں احساسات رکھنے کے باوجود دونوں بزرگوں کا طرز عمل مختلف نظر آتا ہے۔ جوش و خروش جوہر کی طبیعت کا خاصا تھا جب کہ اقبال احتیاط کو ترجیح دیتے تھے۔

ترکیہ کی حمایت۔ ہندوستان کا دارالحکومت دہلی منتقل ہوا تو محمد علی جوہر نے "کامریڈ" بھی دہلی سے شائع کرنا شروع کر دیا۔ "کامریڈ" کا پہلا پرچہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو شائع ہوا۔ محمد علی اب تک اکثر و بیشتر ہندوستان کو درپیش مسائل پر بڑی معتدل زبان میں اظہار خیال کر رہے تھے لیکن جونہی طرابلس اور بلقان کی جنگیں شروع ہوئیں جن میں مغربی طاقتیں باہمی گٹھ جوڑ سے مسلمانوں کو ملیامیٹ کرنے میں مصروف تھیں محمد علی جوہر کا جذبۂ اخوتِ اسلامی بیدار ہو گیا۔ ترک مسلمانوں کی مظلومیت اور کس مپرسی اور دوسری طرف مغربی طاقتوں کی چیرہ دستیوں نے انہیں بے حد مضطرب کر دیا۔ اس اضطراب کو انہوں نے لفظوں میں سمو کر "کامریڈ" کے صفحات پر بکھیر دیا۔ انہوں نے ترکیہ کی امداد کے لیے "کامریڈ ترکی امدادی فنڈ" قائم کر کے جب چندے کی اپیل کی تو عوام نے بڑے جوش و خروش سے چندے کی فراہمی میں حصہ لیا۔ جلد ہی کافی چندہ جمع ہو گیا جس کی مدد سے محمد علی جوہر نے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی زیر سرکردگی ایک طبی وفد ترکیہ بھیجا جس نے ترکوں کی بیش بہا خدمات سرانجام دیں۔

اب تک محمد علی حکومت کی طرف سے تعاون کی امید رکھتے تھے لیکن جلد ہی انہیں ترکوں کے بارے میں حکومت کے معاندانہ عزائم کا علم ہو گیا۔ ستمبر ۱۹۱۳ء میں انہوں نے ترکیہ سے آنے والے ایک کتابچے "مقدونیہ میں آ کر ہماری مدد کرو" کو "کامریڈ"

۱۔ افضل اقبال، Life and times Muhammad Ali صفحہ ۶۷۔

۲۔ ایضاً، صفحہ ۸۴۔

میں شائع کیا جس سے ترکوں پر مغربی ملکوں کے مظالم کی تفصیل عام ہوئی۔ حکومت نے اس کتابچے کو ضبط کر لیا۔ محمد علی جوہر نے اس اقدام کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ فیصلہ حکومت کے خلاف ہوا جس سے حکومت محمد علی جوہر کے خلاف ہو گئی۔ لیکن جوہر کو اس ناراضگی کی کوئی پروا نہ تھی۔ انہوں نے جون ۱۹۱۳ء میں اردو اخبار "ہمدرد" بھی جاری کر دیا تھا جس زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد کا "الہلال" اور مولانا ظفر علی خاں کا "زمیندار" شائع ہو رہے تھے اس زمانے میں "ہمدرد" کا اجرا سخت مشکل کام تھا، لیکن محمد علی کے عزم و ہمت نے اس کو آسان بنا دیا۔ اب صورت یہ تھی کہ "کامریڈ" ہندوستان کے انگریزی خواں طبقے میں مسلمانوں کی آواز پہنچانے کا کام کر رہا تھا اور "ہمدرد" اُردو خواں عوام کو تربیت دینے اور منظم کرنے کی خدمت سرانجام دے رہا تھا۔

حادثۂ کانپور۔ بلقان اور طرابلس کی جنگوں کے علاوہ اس دَور کی سیاست کو کانپور کی مسجد کے حادثے نے بھی بہت متاثر کیا۔ ۱۹۱۳ء میں مچھلی بازار کانپور کی مسجد کے ایک حصے کو مقامی انتظامیہ نے محض ایک سڑک کو سیدھا کرنے کی غرض سے شہید کر دیا۔ اس پر مسلمان مشتعل ہوئے، مظاہرہ ہوا، گولی چلی کئی مسلمان شہید۔ بے شمار زخمی اور متعدد گرفتار ہوئے۔ اس حادثے نے پورے ہندوستان کے مسلمانوں کو مضطرب کر دیا۔ صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے اقبال کو بھی کانپور جانا پڑا۔ آپ مرزا جلال الدین بیرسٹر کے ہمراہ اوائل ستمبر ۱۹۱۳ء میں وہاں پہنچے۔ گرفتار شدگان سے ملاقات کی اور ان کی رہائی کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں سے آگاہی حاصل کی اور واپس تشریف لے آئے۔[۱]

علامہ اقبال کے برعکس اس سلسلے میں جو کارنامہ محمد علی جوہر نے انجام دیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مسلمانوں کے زبردست احتجاج کا جب حکومت پر کوئی

۱۔ رحیم بخش شاہین، مرتب، "اوراقِ گم گشتہ"، صفحہ ۲۲-۲۴۔

اثر نہ ہوا تو انہوں نے خفیہ طور پر محمد علی جوہر اور سید وزیر حسن پر مشتمل ایک وفد انگلستان بھیجا تا کہ وہ ہندوستانی حکومت کے مظالم اور مسلم دشمن رویے سے برطانوی مدبروں کو آگاہ کرے۔ اگرچہ وائسرائے ہند کے ایما پر وزرا نے ملاقات سے انکار کر دیا لیکن محمد علی جوہر نے لندن کے ایسکس ہال Essex Hall میں ہندوستانی مسلمانوں پر ہونے والے ظلم و تشدد کے علاوہ طرابلس اور بلقان کی جنگوں میں مغربی طاقتوں کے ناروا ہتھکنڈوں پر بھی روشنی ڈالی۔ انہوں نے وہاں پر مقیم مسلم زعما، محمد علی جناح، سر سید امیر علی اور سر آغا خان، سے بھی ملاقات کی۔ جوہر کی ان کوششوں کا اثر یہ ہوا کہ حکومت مسجد کانپور اور اس کی حفاظت کے سلسلے میں گرفتار ہونے والے مسلمانوں سے نرم رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی۔

بلقان اور طرابلس کی جنگیں ختم ہوئیں تو مسلمانوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ مسلمانوں سے ناانصافی نہ ہونے دے ورنہ ہندوستانی مسلمان اپنے ترک بھائیوں کی حمایت میں ضروری اقدام پر مجبور ہو جائیں گے۔ حکومت نے اس مطالبے کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا۔ لہٰذا جب ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم اول شروع ہوئی تو مسلم زعما اور عوام نے خاص طور پر انگریزی حکومت کی تائید و حمایت کا فیصلہ کیا۔ اس کے باوجود حکومت نے مفروضہ افراتفری کے خدشے کے بہانے سرکردہ ہندوستانی رہنماؤں کو قید و بند میں ڈال دیا۔ محمد علی جوہر پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ انہوں نے "ٹائمز آف لندن" میں مطبوعہ ایک مضمون The Choice of Turks کا جواب دیتے ہوئے انتہائی سخت اور اشتعال انگیز لب و لہجہ اختیار کیا۔ ان کے اخبار کی ضمانت ضبط کر لی گئی، پھر اخبار بھی بند کر دیا گیا اور بالآخر ۵ مئی ۱۹۱۵ء کو انہیں مہرولی میں نظر بند کر دیا گیا۔

ہندو مسلم اتحاد کی لہر۔ حکومت کے تازہ حملے سے بعض اعتدال پسند زعما کے اس نظریے کو بہت تقویت ملی کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ہندوستان سیاسی ترقی کی شاہ راہ پر گام زن نہیں ہو سکتا۔ ان کی کوششیں ۱۹۱۶ء کے میثاقِ لکھنؤ کی

صورت میں بار آور ہوئیں۔ خاتمۂ جنگ پر جب ۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ کا نفاذ ہوا تو دونوں قوموں نے مل کر اس کے خلاف احتجاج کیا۔ اس احتجاج کو دبانے کے لیے حکومت نے جلیانوالہ باغ اور بعد ازاں پورے پنجاب میں جو جبر و تشدد کیا اس نے ہندوستان بھر میں انگریز دشمنی اور حریت پسندی کی زبردست لہر پیدا کر دی۔ اُدھر ترکی اور عرب مسلمانوں کے معاملے میں انگریزوں نے اپنے وعدوں کے برعکس جو معاندانہ بلکہ وحشیانہ طرزِ عمل اختیار کیا اس نے ہندوستانی مسلمانوں کو اور زیادہ چراغ پا کر دیا۔ ان حالات میں خلافت تحریک اور ترکِ موالات تحریک کا آغاز ہوا۔ ۲۳ اور ۲۴ نومبر ۱۹۱۹ء کو آل انڈیا خلافت کانفرنس منعقد ہوئی جس میں خلافت کے سلسلے میں ہندوستان کے اندر اور باہر آواز بلند کرنے، جشنِ صلح کی تقریبات اور انگریزی سامان کے مقاطعے کے علاوہ انگریزوں سے کامل ترکِ موالات کا فیصلہ کیا گیا۔ ہندو مسلم اتحاد کی فضا میں گاندھی نے دونوں تحریکوں میں مسلمانوں کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا۔

عہدِ اسیری۔ محمد علی جوہر تقریباً پانچ سال تک مہرولی، چھندواڑہ، لینسڈاؤن اور بیتول وغیرہ مقامات پر اسیری و نظر بندی کے مصائب کا شکار رہے۔ اس زمانے میں وہ دُہری اذیت میں مبتلا تھے۔ ایک تو عالمِ اسلام کو مغربی طاقتوں کی تاخت و تاراج کا نشانہ بنتا دیکھ کر ان کے صبر کا پیمانہ چھلکا جا رہا تھا اور دوسرے وہ نظر بندی اور اسیری کی حالت میں خود کچھ کرنے سے قاصر تھے۔ وہ اگر چاہتے تو حکومت سے صلح صفائی کر کے رہائی حاصل کر لیتے، لیکن یہ امر ان کی شانِ عزیمت و حمیت سے فروتر تھا۔ دوسری طرف اگرچہ خلافت و ترکِ موالات کی تحریکوں کے ہنگامے شدت اختیار کر چکے تھے لیکن جوہر کو عوام نے ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہ کیا۔ ان کی قید و بند کے خلاف مسلسل احتجاج ہوتا رہا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ۱۹۱۷ء میں منعقد ہوا تو جوہر کو ان کی غیر حاضری میں صدرِ اجلاس منتخب کیا گیا اور ان کی غیر موجودگی میں کرسیٔ صدارت پر ان کی تصویر سجا دی گئی۔ اسی طرح کانگریس

نے بھی بار بار ان کی رہائی کی اپیل کی۔ وائسرائے ہند پر دباؤ ڈالا گیا، لیکن حکومت جوہر ایسے حریت پسند رہنما کو فوری طور پر رہا کر کے کوئی خطرہ مول لینا نہ چاہتی تھی۔

کلامِ اقبال کا مطالعہ۔ محمد علی جوہر نے مصائب و مشکلات کے، باوجود اس قید و بند کو اپنے لیے مفید بنانے کی کوشش کی۔ انہوں نے نہ صرف ملکی حالات کا گہرا مطالعہ کیا اور مستقبل کی سیاسی جدوجہد کی تیاری اور قومی خدمات کی منصوبہ بندی کی بلکہ اپنی ذہنی و فکری تربیت کا بھی خاص اہتمام کیا۔ صحافتی اور سیاسی سرگرمیوں میں انتہائی انہماک کے سبب اسلام کے وسیع مطالعہ کی فرصت انہیں بہم نہ پہنچی تھی۔ اب جو تنہائی میسر آئی تو انہوں نے ادھر بھی توجہ کی۔ قرآنِ حکیم کے انگریزی اور اردو تراجم کے علاوہ شبلی نعمانی کی عظیم تالیف "سیرت النبیؐ"، کو بغور پڑھا، اور اس کے ساتھ جہاں خود شعر کہے وہاں اپنے محبوب شاعر اقبال کی تازہ تصانیف کے مطالعے کا بھی موقع ملا۔ ہندوستان کے دیگر مشاہیر کی طرح جوہر بھی شروع ہی سے اقبال کے کلام کی تاثیر کے معترف تھے اور اپنی تحریر و تقریر دونوں میں کلامِ اقبال کو بکثرت استعمال کرتے تھے۔[۱]

اقبال کا اسلامی رجحان۔ یُوں تو اقبال کی شاعری کا آغاز ان کی طالب علمی کے زمانے میں ہو چکا تھا لیکن ان کی اصل شہرت انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاسوں میں نظمیں پڑھنے اور سر عبدالقادر کے ادبی رسالے "مخزن"، میں ان کے کلام کی اشاعت سے شروع ہوئی اور بہت جلد ان کا شمار ہندوستان کے صفِ اوّل کے شعراء میں ہونے لگا۔ اس دَور میں اقبال کا مجموعی رجحان قوم پرستی کی طرف تھا اور وہ صدقِ دل سے ہندو مسلم اتحاد کے خواہاں تھے۔ اُن کی نظمیں ہمالہ، ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، نیا شوالہ، پرندے کی فریاد، صدائے درد اور تصویرِ درد وغیرہ ان کے اسی رجحان کی غماز ہیں۔ لیکن اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ میں

---

[۱] مثلاً علمائے ہند کی کانفرنس منعقدہ کانپور میں ۲۳ دسمبر ۱۹۲۹ء کو جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا اس میں جوہر نے تقریباً اکیس شعر علامہ اقبالؒ کے پڑھے تھے۔

قیام کے دوران (۱۹۰۵ تا ۱۹۰۸ء) بعض دیگر تبدیلیوں کے ساتھ ان میں ایک اہم تبدیلی یہ رونما ہوئی کہ اسلام کے گہرے مطالعے اور یورپی معاشرے کے قریبی مشاہدے کی بنا پر انہوں نے ہندو مسلم اتحاد یا متحدہ قومیت کے بجائے مسلمانوں کی قومی ہستی کے جداگانہ تشخص کا عرفان حاصل کیا۔ وہاں آپ نے نہ صرف اسلام کے مختلف پہلوؤں پر تقریریں کیں بلکہ جسٹس سیّد امیر علی کی صدارت میں قائم شدہ آل انڈیا مسلم لیگ کی برطانوی کمیٹی میں شرکت بھی کی۔ ۱۹۰۸ء میں اقبال واپس وطن تشریف لائے تو تقریباً ڈیڑھ سال تک گورنمنٹ کالج لاہور کی پروفیسری اور وکالت کے کاروبار میں مصروف رہے۔ پھر مکمل طور پر وکالت کی طرف متوجہ ہوگئے، لیکن اس دور میں بھی وہ اجتماعی زندگی سے بیگانہ نہ رہے۔ چنانچہ ایک طرف انہوں نے انجمن کشمیری مسلمانانِ لاہور کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے کشمیری مسلمانوں کی خدمت کا بیڑہ اٹھایا اور دوسری طرف پنجاب مسلم لیگ میں شرکت اختیار کی۔ مرزا جلال الدین بیرسٹر کے خیال میں مسلم لیگ میں ان کی شرکت محض اس غرض سے تھی کہ اس طرح مسلمان کسی دوسری سیاسی جماعت میں مدغم ہو کر اپنی حیثیت کو کھو دینے کے بجائے اپنی سیاسی تنظیم کے لیے خود کوشش کریں۔[۱]

۱۹۱۱ء میں جب بلقان اور طرابلس کی جنگیں شروع ہوئیں تو اقبال کی اسلامیت پوری قوت سے اُبھر کر سامنے آئی۔ شکوہ، جوابِ شکوہ، غرۂ شوال یا ہلالِ عید، شمع و شاعر، مسلم، حضورِ رسالت مآب میں، فاطمہ بنت عبداللہ ایسی بلند پایہ نظمیں اسی دور کی یادگار ہیں۔ ان نظموں نے ہندوستانی مسلمانوں میں بیداری کی زبردست لہر دوڑا دی۔ یہی نظمیں تھیں جن کی اثر انگیزی کا اعتراف کرتے ہوئے ظفر علی خاں نے لکھا تھا:

"جنگِ طرابلس کے زمانے میں اقبال کا کلام مسلمانانِ عالم پر عربوں کی رجز خوانی کا اثر رکھتا تھا۔ ہندوستان افلاس کی وجہ سے توپ و تفنگ اور سامانِ حرب نہیں رکھتا لیکن

---

[۱] محمود نظامی، مرتب، "ملفوظاتِ اقبال"، صفحہ ۱۰۲۔

اقبال کا کلام رکھتا ہے۔"[1]

مولانا جوہر کی حکمتِ عملی :۔ جس دَور میں اقبال کا کلام ہندوستان کے کونے کونے میں آزادی و حریت کے جذبات کو شعلۂ جوالہ بنانے میں مصروف تھا، اس دَور میں محمد علی جوہر صحافت اور سیاست کے میدان میں یہی فریضہ سر انجام دے رہے تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر دونوں ایک دوسرے کے لیے ہرگز اجنبی نہ رہے تھے۔ دونوں کا نصب العین ملّتِ اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ تھا، لیکن دونوں کا لائحۂ عمل مختلف تھا۔ اقبال مسلمانوں کو اپنے جداگانہ وجود کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے طور پر جدوجہد کرنے کی تلقین کرتے تھے، جب کہ مولانا جوہر علیگ ہونے اور مسلم لیگ کے اہم رکن ہونے کے باوجود ہندو مسلم اتحاد کے داعی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگرچہ مسلمان ہندوؤں سے الگ تہذیبی تشخص کے مالک ہیں لیکن برِصغیر کے عصری حالات کا تقاضا ہے کہ وہ ہندوؤں کی رفاقت میں پہلے انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کریں اور پھر اپنے حقوق کے تصفیے کے لیے کوشاں ہوں۔ بیک وقت دونوں محاذوں پر جنگ کرنا حکمت و دانائی کے خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دَور میں جوہر ہی نہیں، محمد علی جناح، مولانا حسرت موہانی اور بعض دیگر مسلم زعما بھی اسی نقطۂ نظر کے مالک تھے۔ تاہم بعد میں متعدد تلخ تجربوں نے ان بزرگوں کو اپنا مسلک تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ بہر حال اس اختلافِ مسلک کے باوجود اقبال نے مسلمانوں کی عصرِ حاضر میں بیداری کا جو کارنامہ سر انجام دیا تھا مولانا جوہر اس کو نظر انداز نہ کر سکتے تھے بلکہ وہ اقبال کا تہِ دل سے احترام کرتے تھے اور ان کے کلام کو انتہائی ذوق و شوق سے پڑھتے تھے۔ اپنی خود نوشت سوانح میں اقبال سے اپنی اس عقیدت و محبت کا ان الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں :

"جب کہ دوسروں کو اقبال کی فطانت و ذہانت سے آگاہی حاصل کیے برسوں گزر چکے تھے میں نے اقبال کا ایک شعر بھی نہ پڑھا تھا۔ البتہ میں اس بات کا

---

[1] "نیرنگِ خیال"، اقبال نمبر، صفحہ ۷۹-۸۰۔

دعویٰ کر سکتا ہوں کہ جب یک بارگی اقبالؔ کے کلام نے مجھے مسحور کیا تو میں نے ایک حد تک مافات کی تلافی کی اور یہ اس طرح کہ اردو رسالوں اور اخباروں میں ان کا جو کلام شائع ہوتا اس کو بار بار پڑھتا اور میرا اخبار ["ہمدرد"] پڑھنے والے اقبالؔ کا کلام پڑھ کر جو مسرت محسوس کرتے ہیں ان کی مسرت میں شریک ہوتا۔ میرؔ کو مستثنیٰ کیے بغیر غالبؔ، جو اردو زبان کا سب سے بڑا شاعر تھا اور جو خود میرؔ کی برتری کا معترف ہے، کے اشعار اردو صحافت میں کبھی اس قدر زیادہ نہیں پیش کیے گئے جتنا کہ "کامریڈ" میں، لیکن اب "کامریڈ" اور "ہمدرد" کے کالم اقبالؔ کے اشعار سے مزین ہونے لگے جو غالبًا غالبؔ کے انتقال کے بعد پیدا ہوئے۔

"بحیثیت شاعر اقبالؔ بیسویں صدی کے ہند میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے علم بردار تھے اور اسلامی ہند اس پنجابی گوشہ نشین اور شرمیلے بیرسٹر سے زیادہ کسی اور کا ممنون نہیں۔ اُردو دان دنیائے اسلام کا کوئی گھر ایسا نہیں جو اقبالؔ سے ناواقف ہو اور بلا شبہ میں ان کا قدردان اور عاشق تھا اور اگر کسی نے اقبال سے عقیدت رکھنے میں مجھ سے برابری کی بلکہ مجھ سے بازی لے گیا وہ میرے بھائی شوکت علی تھے۔"[1]

گویا صرف محمد علی ہی نہیں ان کے بھائی شوکت علی بھی علامہ اقبالؒ کے دالہ و شیدا تھے۔ چودھری خلیق الزمان علی برادران سے ان کی پہلی نظربندی کے دوران چھندواڑہ میں ملے تو انہوں نے دونوں بھائیوں کی اقبالؒ سے محبت کا بھی مشاہدہ کیا۔ وہ لکھتے ہیں:[2]

"Meeting the brothers [Ali Brothers] was like gulping wine. It made us fresh and lively. When we were not talking, the Brothers generally sang poems of Iqbal from Shikwa, Shama and Shair, Sicily, Fatima, etc.

---

[1] غلام دستگیر رشید، مرتب، "آثارِ اقبال"، صفحہ ۲۰۴۔

[2] چودھری خلیق الزمان، Pathway to Pakistan، صفحہ ۳۸۔

'These were, of course, the poems which had made Iqbal the idol of Muslim youth. We loved Iqbal the Revolutionary, calling upon his people to rise to action. The Iqbal who introduced Muslim heroes in their true glory, the Iqbal who by his interpretations of Quranic injunctions put into what had been made stale by philosophical pondering.

ایک تجویز کی حمایت :- ۱۹۱۱ء کے لگ بھگ مسلمان عوام و خواص میں احساس پیدا ہونے لگا کہ علامہ اقبال کی شاعری نے جس طرح ملتِ اسلامیہ میں بیداری پیدا کی ہے اور مسلمانوں کی رگوں میں خونِ زندگی دوڑایا ہے اس کی قدر دانی کا تقاضا ہے کہ علامہ اقبالؒ کی ملی خدمات کا باقاعدہ اعتراف کیا جائے۔ اس سلسلے میں کسی شخص نے مدیر "کامریڈ" کے نام ایک خط میں تجویز پیش کی کہ مسلمانوں کی قومی مجلس "آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" کے آیندہ اجلاس میں اقبال کو پھولوں کے ہار پہنا کر ان کی قدر شناسی کا عملی مظاہرہ کیا جائے۔ مولانا جوہر نے اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے علامہ اقبال کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا: لے

"We heartily join our correspondent in the wish that some public testimony should be borne to the inestimable services of Iqbal, whose 'glorious song' has touched all the fine impulses that move the heart of Muslim India today. The poet has felt the pathos of the fallen race; but his message now joyous, how full of faith and celestial fire; it has roused even the most weary and despondent with a voice like the clarion trumpet. Will the garlanding of the poet in the Muslim Educational Conference be appropriate offering of a people's education and gratitude? These 'laurels' too, have not escaped being vulgarised by unworthy use, and have gone in some cases to decorate necks that scarcely deserved a halter. However, any token of appreciation ought to be welcome. We trust our correspondent's suggestion will be enthusiastically received by the Muslim public.

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ اس میں مولانا قاری سید سلیمان پھلواروی، سید سجاد حیدر یلدرم اور مولانا شبلی نعمانی

لے سید رئیس احمد جعفری، مرتب، Selections from Moulana Muhammad Ali's Comrade، صفحہ ۲۶۷-

ایسی ہستیوں نے شرکت کی۔ کانفرنس کے تیسرے اجلاس کی صدارت علامہ اقبالؒ نے فرمائی اور اسلام میں تحصیلِ علم کے مقام اور عہدِ حاضر میں علوم کی تجدید و احیاء اور ترقی میں مسلمانوں کی کوششوں کے بارے میں پُرمغز خطبہ ارشاد فرمایا۔ کانفرنس کے چھٹے اجلاس کی صدارت مولانا پھلواروی نے فرمائی اور اسی اجلاس میں اقبالؒ کو ملّی اعزاز و تحسین سے نوازنے کی رسوم بھی ادا کی گئیں۔ سیّد سجاد حیدر یلدرم کی درخواست پر علامہ شبلی نعمانی نے علامہ کو پھولوں کے ہار پہنائے اور اپنی تقریر میں انہیں خراجِ تحسین پیش کیا۔ اقبال نے اپنے خطاب میں مسلم نشاۃِ ثانیہ کے لیے جدوجہد جاری رکھنے کے عزم کا اظہار کیا اور مولانا پھلواروی نے علامہ اقبالؒ کی قومی و ملّی خدمات کی تعریف کی۔[1] اس طرح اس رسم کی تکمیل ہوئی جس کی ادائیگی کی تجویز و تائید غالباً سب سے پہلے محمد علی جوہر کے "کامریڈ" کے صفحات میں ہوئی۔

"اسرار و رموز" جوہر کی نظر میں:- ۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۹۱۸ء تک کے زمانے میں اگرچہ اقبال عام طور پر خاموش رہے لیکن حقیقت میں ان کی یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ اسی زمانے میں انہوں نے اپنی شہرہ آفاق مثنویاں "اسرارِ خودی" (۱۹۱۵ء) اور "رموزِ بے خودی" (۱۹۱۸ء) مکمل کیں اور شائع کیں۔ ان مثنویوں نے اقبال کو ایک عظیم مفکّر شاعر کی حیثیت سے روشناس کرایا۔ ہندوستان کے اندر اور باہر ان مثنویوں کی خوب پذیرائی ہوئی۔ محمد علی جوہر کو دونوں مثنویاں ان کی نظربندی کے زمانے میں ملیں تو انہوں نے یہ محسوس کیا کہ جیسے انقلابی افکار کا ایک خزانہ ان کے ہاتھ آ گیا ہے۔ نہ صرف جوہر نے بلکہ ان کے بھائی مولانا شوکت علی نے بھی ان مثنویوں سے خوب استفادہ کیا۔ "اسرار و رموز" کے بارے میں اپنے تاثرات رقم کرتے ہوئے جوہر نے ان مثنویوں کو اقبال کے اُردو کلام

---

[1] رحیم بخش شاہین، مرتب، کتاب مذکور، صفحہ ۱۸۲-۱۸۴-

کے مقابلے میں پائدار تر اور عظیم تر قرار دیا ہے۔[1]

مولانا جوہر کی رہائی: ادھر تو جوہر اپنی فکری و علمی تربیت میں مشغول تھے اور اُدھر حکومت نے بپھرے ہوئے عوام کو پرسکون کرنے کے لیے دسمبر ۱۹۱۹ء میں تقریباً تمام سیاسی قیدیوں کو غیر مشروط طور پر رہا کرنے کا اعلان کر دیا۔ علی برادران رہا ہوئے تو انہوں نے سیدھا امرتسر کا رُخ کیا جہاں انہی دنوں کانگریس، مسلم لیگ اور تحریکِ خلافت کے جلسے منعقد ہو رہے تھے۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر سٹیشن پر دونوں بھائیوں کا زبردست خیر مقدم ہوا۔ دونوں بھائی پہلے جلیانوالہ باغ میں گئے اور شہیدوں کے لیے فاتحہ پڑھی اور وہاں سے مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لیے چلے گئے۔ اس اجلاس میں ہندوستان بھر کے مسلم زعما موجود تھے۔ علامہ اقبال سٹیج پر مولانا جوہر سے بغل گیر ہوئے اور انہوں نے علی برادران کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی وہ نظم پیش کی جو انہوں نے سفر کے دوران کہی تھی اور بعد ازاں "اسیری" کے نام سے شائع ہوئی۔[2] علامہ نے فرمایا:

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشکِ اذفر چیز کیا ہے، اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
شہپر زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست

---

[1] افضل اقبال، مرتب، (محمد علی) My Life - A fragment نیز اردو ترجمہ کے لیے دیکھیے غلام دستگیر رشید، مرتب، کتاب مذکور، صفحہ ۲۰۳-۲۰۷۔

[2] محمود نظامی، مرتب، کتاب مذکور، صفحہ ۱۳۵۔

ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند[1]

۳۱ دسمبر ۱۹۱۹ء کو علی برادران نے کانگریس کے اجلاس میں شرکت کی۔ کانگریسی زعما نے علی برادران کی عظیم خدمات پہ انہیں زبردست خراج تحسین پیش کیا۔[2]

وفدِ خلافت۔ امرتسر کے جلسوں میں شرکت کے بعد محمد علی جوہر دہلی تشریف لے گئے۔ یہاں بھی اس مجاہدِ آزادی کا شاندار استقبال کیا گیا۔ ان ہنگاموں سے فرصت ملی تو خلافت کانفرنس کی تجویز کے مطابق ہندو مسلم زعما پر مشتمل ایک وفد محمد علی جوہر کی سرکردگی میں وائسرائے ہند سے ملا۔ وفد نے وائسرائے کو ان مواعید کے ایفاء پر آمادہ کرنے کی کوشش کی جو حکومت نے ترکیہ کے معاملے میں مسلم رعایا سے کیے تھے۔ پھر وہ تاریخی وفد تیار ہوا جس کی دہلی اور امرتسر کی خلافت کانفرنسوں میں قرارداد منظور ہوئی تھی۔ محمد علی جوہر کی سرکردگی میں یہ وفد یورپ کے اربابِ حل و عقد سے مل کر خلافت کے بارے میں مسلمانانِ ہند کے جذبات و احساسات پیش کرنے کے لیے تشکیل دیا گیا تھا۔ یہ وفد یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو روانہ ہوا۔ اس سلسلے میں اقبالؔ کے اس قطعے نے بہت شہرت حاصل کی ہے جو "دریوزۂ خلافت" کے نام سے "بانگِ درا" میں شائع ہوا:

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے
تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی

---

[1] "بانگِ درا" (کلیاتِ اقبال اردو)، صفحہ ۲۵۳۔

[2] عام طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ پہلے کانگریس کے اجلاس میں گئے، پھر مسلم لیگ کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ یہ بات درست نہیں۔ ملاحظہ کیجیے مجلہ "العلم" کراچی، جوہر نمبر، ۱۹۸۰ء۔

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی
مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی[1]

اقبال کا نقطۂ نظر ۔۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کو احیائے خلافت کے سلسلے میں خلافت کانفرنس کے طرزِ عمل سے کچھ اختلاف ضرور تھا۔ اقبال اس بات کے تو مداح تھے کہ تحریکِ خلافت نے اسلامی اخوت کے عالمگیر اصول کے احیاء اور مسلمانانِ عالم کے اتحاد اور مرکزیت کے قیام و استحکام کے لیے عوام کو ہموار کیا ہے لیکن وہ مسلمانانِ ہند کے اس جذباتی طرزِ عمل کی خامی اور کمزوری سے بھی آگاہ تھے۔ ان کے خیال میں وہ خلافت جو دوسروں کی بیساکھی کے سہارے قائم ہو، جس کی بقا کا انحصار دوسروں کے اشارۂ ابرو پر ہو، اور جو محض نمائشی خلافت ہو، مسلمانوں کے کس کام کی ہے؟ یہ درست ہے کہ خلافت مسلمانوں کا سیاسی و مذہبی نصب العین ہے لیکن اس کے لیے اغیار سے بھیک مانگنے کے بجائے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی ضرورت ہے۔ اپنی صفوں میں اتحاد و اتفاق

---

[1] "بانگِ درا" (کلیات)، صفحہ ۲۵۴۔
اس قطعے کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اس وقت کہا گیا تھا جب یہ وفد سفرِ یورپ پر روانہ ہو رہا تھا۔ دسمبر ۱۹۷۸ء میں محمد علی جوہر کانفرنس منعقد ہوئی تو بعض فاضل دوستوں نے بھی اس قسم کی رائے کا اظہار کیا۔ میں نے اجلاس میں اس کی تردید کی بلکہ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مشہور ماہر اقبالیات محترم عبداللہ قریشی نے ایک موقع پر یہاں تک لکھ دیا ہے کہ: "پھر ۱۹۲۰ء میں جب مولانا ایک وفد کے ہمراہ برطانیہ کے وزیرِ اعظم لائڈ جارج کے سامنے خلافت کا مسئلہ پیش کرنے ولایت گئے اور ناکام لوٹے تو اقبال نے اس دریوزہ گری کو باعثِ ننگ قرار دیا۔" (باقی بر صفحہ ۱۶۹)

پیدا کرنے اور عروسِ آزادی سے ہم کنار ہونے کی ضرورت ہے۔ اقبال کے اس نقطۂ نظر کی تائید مذکورہ قطعے کے اس شعر سے بھی ہوتی ہے جو بعد میں حذف کر دیا گیا:

بہت آزمایا ہے غیروں کو تُو نے
مگر آج ہے وقتِ خویش آزمائی[۱]

یہ وفد آٹھ مہینے تک یورپ میں رہا۔ محمد علی جوہر نے مدبرینِ یورپ سے ملاقاتیں کیں، تقاریر کیں اور بیانات دیئے، لیکن کمزور اور غلام ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات و احساسات کے ترجمان محمد علی جوہر کی فریاد و فغان کا کوئی اثر نہ ہُوا۔ بقول پروفیسر محمد سرور:

"محمد علی نے اپنی آواز سیاست اور حکومت کے بڑے بڑے ایوانوں میں پہنچائی لیکن اتحادی غرورِ فتح میں سرمست تھے۔ ظاہر ہے کہ شادی کے شادیانوں میں کسی بے کس ستم زدہ کی آہِ دردناک کون سنتا ہے؟ محمد علی یورپ سے دل شکستہ لوٹے اور یہ ٹھان کر لوٹے کہ آیندہ کبھی اس بارگاہ کی طرف سائل کی حیثیت سے رخ نہ کریں گے۔"[۲]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۸) اس قطعے کے دو شعر نقل کرنے کے بعد پھر لکھتے ہیں: "یہ اشعار بھی "دریوزہ گری خلافت" کے زیرِ عنوان "بانگِ درا" میں شامل ہیں"۔ (مجلہ "صحیفہ"، اقبال نمبر، اکتوبر ۱۹۷۳ء، صفحہ ۱۴۰)۔ "دریوزہ گری خلافت" تو کمپوزنگ کی غلطی معلوم ہوتی ہے لیکن قطعے کی تاریخ کا تعین درست نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ قطعہ ۲۶/۲۷ ستمبر ۱۹۱۹ کی درمیانی رات میں کہا گیا تھا جیسا کہ اقبال کے اس مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے جو انہوں نے ۲۷ ستمبر ۱۹۱۹ کو مولانا سیّد سلیمان ندوی کو لکھا تھا (ملاحظہ ہو شیخ عطاء اللہ، مرتب "اقبال نامہ"، ۱/۱۰۵-۱۰۷)، جبکہ وفدِ خلافت یکم جنوری ۱۹۲۰ کو روانہ ہُوا تھا۔

[۱] شیخ عطاء اللہ، مرتب، کتاب مذکور، ۱/۱۰۶۔

[۲] محمد سرور، "مولانا محمد علی کے یورپ کے سفر"، صفحہ ۷۔ یہاں جس قطعے کا حوالہ دیا گیا ہے اس کے بارے میں وضاحت قبل ازیں کر چکا ہوں۔

بعد ازاں ۱۲ اگست ۱۹۲۷ء کے ایک مضمون میں خود مولانا جوہر نے بھی اعتراف کیا:

"خلافت کے لیے مسلمانانِ ہندوستان نے یورپ کو ایک وفد بھیجا جس کا سرکردہ میں تھا تو ڈاکٹر صاحب [علامہ اقبال مرحوم] کو اس قدر غیرت آئی (اور میں اس غیرت کو بجا سمجھتا تھا) کہ انہوں نے 'دریوزۂ خلافت' نام کا قطعہ لکھا۔ ۔ ۔ لیکن جب 'دریوزہ گرانِ خلافت' خالی کاسۂ گدائی لے کر یورپ سے لوٹے مگر اس کا تہیہ کر کے کہ بیراتمام حجت تھا، اس کے بعد یورپ کے سامنے ہرگز ہاتھ نہ پھیلائیں گے۔ اگر قوت نہ ہو گی تو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنا پسند کریں گے مگر یورپ کے آگے ہاتھ جوڑنا پسند نہ کریں گے اور اگر قوت ہو گی تو کھلا ہاتھ نہ بڑھے گا بلکہ بندھی ہوئی مٹھی سے کام لیا جائے گا۔"[1]

چونکہ اس وفد نے یورپ میں رہ کر بڑی طاقتوں کی ان سازشوں سے بین الاقوامی رائے عامہ کو آگاہ کیا تھا جو وہ مرکزِ اسلام کو تباہ کرنے کے سلسلے میں کر رہی تھیں، اس لیے وفد کی ظاہری ناکامی کے باوجود اقبال اس کی جملہ مساعی کو قدر کی نظروں سے دیکھتے تھے اور اس بات کی توقع رکھتے تھے کہ اس سے مستقبل میں اہم اور دور رس نتائج برآمد ہوں گے۔ چنانچہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں:

"مراجعت مع الخیر مبارک! آپ نے بڑا کام کیا جس کا صلہ قوم کی طرف سے شکر گزاری کی صورت میں مل رہا ہے اور دربارِ نبوی ؐ سے نہ معلوم کس صورت میں عطا ہو گا۔ وزرائے انگلستان کا جواب وہی ہے جو ان حالات میں ہمیشہ دیا گیا ہے:

انؤمن لبشرین مثلنا وقومھما لنا عٰبدون[2]

---

[1] ایضاً، صفحہ ۳۵-۳۶۔

[2] سورۂ مومنون، آیت ۴۷۔

تاہم مجھے یقین ہے کہ ہندی وفد کا سفرِ یورپ بڑے اہم نتائج پیدا کرے گا۔[۱]

اس خط میں اقبالؔ نے محمد علی جوہرؔ اور سید سلیمان ندوی کی رعایت سے قرآن کی جو آیت نقل کی ہے وہ بہت معنی خیز ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اقبال تحریکِ خلافت کے اولین ہمدردوں میں سے تھے کیونکہ یہ تحریک اسلام کے اسی تصوّرِ قومیّت پر مبنی تھی جس کی تعلیم اقبال کئی سال پیشتر سے دیتے چلے آرہے تھے۔ تحریکِ خلافت کا آغاز ہُوا اور صوبائی سطح پر خلافت کمیٹیوں کو منظم کیا گیا تو لاہور میں بھی خلافت کمیٹی قائم ہوئی۔ اقبالؔ اس کے سیکرٹری منتخب ہوئے لیکن جلد ہی وہ اس عہدے سے مستعفی ہوگئے۔ اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ خلافت کمیٹی کے بعض ارکان غیر ذمہ دارانہ رویے کے مالک ہیں اور ناقابلِ اعتبار ہیں۔ تاہم انہوں نے استعفیٰ کے تمام وجوہ عوام کے سامنے پیش کرنے سے گریز کیا۔ تحریکِ خلافت کے مقاصد سے کسی نہ کسی صورت میں ان کی ہم آہنگی کئی سال تک برقرار رہی، لیکن جب انہیں احساس ہُوا کہ ہندو تحریکِ خلافت کے سائے میں اپنے آپ کو منظم کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو آلۂ کار کے طور پر استعمال کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں تو انہوں نے اس تحریک سے لاتعلقی اختیار کرلی۔

مسئلۂ خلافت بنیادی طور پر مسلمانوں کا مسئلہ تھا۔ اس مسئلے کی سنگینی کے احساس نے مسلمانوں کو بیدار کردیا تھا۔ مغربی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں سے مسلمان بے حد مشتعل ہوچکے تھے اور پھر ان کی رہنمائی کی زمام بھی مولانا جوہرؔ ایسے مخلص، صداقت شعار اور بے باک مجاہد کے ہاتھ میں تھی جس نے اپنی زبردست جدوجہد، آتشیں تحریروں اور شعلہ بار تقریروں سے پورے ملک میں ایک آگ لگا رکھی تھی۔ اس زمانے میں مسلمان

---

[۱] شیخ عطاء اللہ، مرتب، کتاب مذکور، ۱/۱۱۲-۱۱۳۔

برِصغیر کی سیاست پر مکمل طور پر چھائے ہوئے تھے۔ گاندھی ایسا شاطر برِصغیر کی سیاسی قیادت کو مسلمانوں کے ہاتھ میں جاتے کیسے برداشت کر سکتا تھا؟ اس نے کانگریس کو مضبوط بنانے کے لیے بڑی ہوشیاری سے مسلمانوں کی ہم نوائی کا اعلان کیا، [1] ورنہ ہندوؤں کو اسلامی خلافت کی بقا اور استحکام سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی اور پھر اس نے جنوبی افریقہ کے حوالے سے اپنے آپ کو ترکِ تعاون یا ترکِ موالات وغیرہ کی تحریکوں کا ماہر ظاہر کیا۔ چونکہ مسلمان رہنماؤں کو اس قسم کی تحریکیں منظم کرنے کا کوئی سابقہ تجربہ نہ تھا، انہوں نے گاندھی کو آگے بڑھنے کا موقع دیا جس سے تحریکِ خلافت کی قیادت خود بخود گاندھی کے ہاتھ میں چلی گئی۔

علامہ اقبالؒ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ تحریکِ خلافت ہو یا تحریکِ ترکِ موالات، اس کے نتائج صرف اسی صورت میں مسلمانوں کے حق میں مفید ہو سکتے ہیں جب ان کی اپنی صفوں میں کامل اتحاد ہو اور وہ اپنے طور پر اس تحریک کو چلائیں۔ بصورتِ دیگر یہ تحریک مسلمانوں کی وحدت کو شدید نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اسی لیے تحریکِ خلافت میں وہ ہندو زعما خصوصاً گاندھی کی شمولیت کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے [2] یہی وجہ ہے کہ جب دفعۂ خلافت کی ناکامی کے احساس نے تحریکِ ترکِ موالات میں شدت پیدا کر دی اور حکومت کے ساتھ ہر قسم کے تعلق کو منقطع کرنے پر زور دیا گیا تو اقبالؒ نے اس سلسلے میں بے حد محتاط رویہ اختیار کیا جس سے مولانا جوہر کو شدید رنج ہوا۔

مولانا جوہر نے سب سے پہلے علی گڑھ کالج کو سرکاری سرپرستی سے نجات دلانے کی کوشش کی لیکن علی گڑھ کے اربابِ اختیار نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ مجبوراً انہوں نے جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی جس کا مقصد مسلمانوں کو سرکاری ملازم کے

---

[1] ڈاکٹر وحید الزمان، Towards Pakistan صفحہ ۲۹۔

[2] معین الدین عقیل، "اقبال اور مسئلۂ خلافت"، مندرجہ مجلہ "اقبال ریویو"، اقبال نمبر، (باقی بر صفحہ ۱۳۲)۔

بجائے مجاہد بنانا تھا۔ اس کے بعد مولانا جوہر مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا شوکت علی کے ہمراہ لاہور پہنچے تاکہ اسلامیہ کالج کے ٹرسٹیوں اور اساتذہ کو تحریک ترک موالات میں شرکت پر آمادہ کریں۔ اس زمانے میں علامہ اقبالؒ انجمن حمایت اسلام کے سیکرٹری تھے جس کے زیرِ اہتمام یہ کالج چل رہا تھا۔ قدرتی طور پر مولانا جوہر اور ان کے رفقاء نے علامہ اقبال پر دباؤ ڈالا۔ اگرچہ انجمن کی کونسل کے اراکین کا ایک مضبوط گروہ کسی مصلحت کے پیشِ نظر ترکِ موالات کی تجویز کو اس وقت رد کرنے کے حق میں تھا، لیکن اقبال چاہتے تھے کہ یہ تجویز برِصغیر کے چوٹی کے علما کی ایک کمیٹی کے سامنے پیش کی جائے جو حالاتِ حاضرہ سے واقف کار لوگوں کے مشورے سے فیصلہ کریں کہ آیا ترکِ موالات احکامِ دین کے مطابق ہے یا نہیں۔ اراکینِ کونسل نے اس تجویز کو قبول نہیں کیا اور اکثریت نے ترکِ موالات کی تحریک سے عدم اتفاق کا اظہار کیا۔ ترک موالات کی کھلم کھلا مخالفت میں سر فضل حسین، سر عبدالقادر اور سر محمد شفیع وغیرہ پیش پیش تھے۔ لیکن مولانا جوہر خاص طور پر علامہ اقبالؒ کے طرزِ عمل سے نالاں تھے۔ مولانا جوہر رقم طراز ہیں :

"ہم لاہور پہنچے اور اسلامیہ کالج کے ٹرسٹیوں اور اساتذہ کو دعوت الی الخیر دی تو ان کو علی گڑھ کالج کے ٹرسٹیوں اور اساتذہ سے بھی زیادہ مستعد پایا اور اسی سے اندازہ کیا کہ طلبہ کس قدر مستعد ہوں گے۔ مگر ڈاکٹر محمد اقبال سیکرٹری تھے اور آپ نے جن سے ہم نے اسلام سیکھا تھا (نہ کہ کسی مولوی سے) ہماری دعوت کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ علمائے کرام کا فتویٰ لے لیا جائے۔ خیر پانچ سو علماء نے بھی چند ماہ بعد فتویٰ صادر فرما دیا مگر ڈاکٹر اقبال نے اس پر بھی توجہ نہیں فرمائی،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۵) جولائی اکتوبر ۷۷ ۱۹ء۔ اس مضمون میں تحریک خلافت کے بارے میں اقبال کے ردِ عمل اور نظامِ خلافت کے بارے میں ان کے افکار کا جائزہ لیا گیا ہے۔

البتہ اجتہاد فرمایا تو ایک علم الاقتصاد کے ماہر کی حیثیت سے اس وقت جب کہ مہاتما گاندھی ایک کروڑ روپیہ جمع کر لائے اور وہ اجتہاد یہ تھا کہ اس سے ٹیکنولاجیکل (صنعتی) انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح کیا جائے۔" [1]

ہندو مسلم اتحاد کا خاتمہ ۔ محمد علی جوہر گاندھی جی کے ہمراہ ترکِ موالات وغیرہ کے سلسلے میں دورہ کر رہے تھے کہ ۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء کو انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ کراچی میں مقدمہ چلا اور انہیں دو سال قید با مشقت کی سزا ہو گئی۔ اس سے تحریکِ ترکِ موالات کو بہت تقویت ملی اور گاندھی نے سول نافرمانی کی تحریک جاری کر دی۔ ان کا مقصد ہندوستان کی آزادی، پنجاب میں انگریزوں کے مظالم کی تلافی اور خلافت کے سلسلے میں مسلمانوں کے مطالبات کی حمایت کرنا تھا۔ لیکن تحریک ابھی ابتدائی مرحلے میں تھی کہ ۵ فروری ۱۹۲۲ء کو چوراچوری کا واقعہ پیش آگیا جس میں ہڑتالی عوام کی طرف سے تشدد کا مظاہرہ ہوا۔ گاندھی نے مسلمان رہنماؤں سے مشورہ کیے بغیر اپنی تحریک کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ ۱۲ مارچ ۱۹۲۲ کو حکومت نے گاندھی کو گرفتار کر لیا اور عدالت نے انہیں چھ سال قید کی سزا دی۔ تحریک کے خاتمے کے ساتھ ہی حکومت سے تعاون کا رجحان پیدا ہونے لگا۔ پنڈت موتی لال نہرو کی سرکردگی میں سوراج پارٹی کا قیام عمل میں آیا جس نے کونسلوں میں حصّہ لینے کی تحریک کا آغاز کیا۔ اُدھر مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکیہ سے غاصب قوتوں کو باہر پھینکنا شروع کیا۔ بالآخر ۱۹۲۲ء میں لوزان کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ترکوں نے اپنے ملک کی آزادی کو تسلیم کروا لیا اور پھر ۱۹۲۴ء میں خود ترکوں نے اس خلافت کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا جس کے لیے ہندوستان کے مسلمانوں نے عظیم الشان قربانیاں دی تھیں۔ پھر اسی دوران میں سوامی شردھانند نے شدھی اور لالہ لاجپت رائے نے سنگھٹن کی تحریکوں کا آغاز کیا جن کا مقصد ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف تیار کرنا تھا

---

[1] محمد سرور، مرتب، "مضامین محمد علی"، ۲/ ۴۲۵-۴۲۶۔

اس کے خلاف مسلمانوں میں تبلیغ اور تنظیم کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ اس طرح ہندو مسلم اتحاد کی ساری جدوجہد ختم ہو کر رہ گئی۔ ستمبر ۱۹۲۳ء میں مولانا جوہر اور پھر ستمبر ۱۹۲۴ء میں گاندھی بھی جیل سے باہر آ گئے۔ اگرچہ مولانا جوہر اور بعض دیگر رہنماؤں نے اصلاحِ احوال کی بھرپور کوشش کی لیکن ہندو مسلم اختلافات نے فسادات کا جو روپ اختیار کیا اس کا مداوا کسی سے نہ ہو سکا۔

علامہ اقبال کی سرگرمیاں۔ اس زمانے میں اقبال سیاسی ہنگاموں سے تقریباً الگ تھلگ رہے۔ تاہم ان کی بعض شاہکار نظمیں "خضرِ راہ" اور "طلوعِ اسلام" اسی دور کی یادگار ہیں جن میں جنگِ عظیم اوّل کے اثرات اور ترکیہ میں مسلمانوں کی کامیابیوں کے پس منظر میں بین الاقوامی حالات پر تبصرہ اور مسلمانوں کی نئی بیداری کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اسی زمانے میں انہوں نے اپنی شہرۂ آفاق فارسی کتاب "پیامِ مشرق" لکھی جو ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی۔ علاوہ ازیں ۱۹۲۴ء میں آپ کا اوّلین اردو مجموعۂ کلام "بانگِ درا" کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔ ۱۹۲۶ء میں اقبال نے پنجاب کونسل کے انتخاب میں حصہ لیا اور نمایاں کامیابی سے ہم کنار ہوئے اور ۱۹۳۰ء تک کونسل کے رکن کی حیثیت سے اہلِ پنجاب کی خدمت سر انجام دیتے رہے۔ پنجاب خصوصاً لاہور میں ہندو مسلم اقوام کے درمیان جو کشیدگی پیدا ہو چکی تھی اقبال نے اس کے انسداد کے لیے بھی کوششیں کیں۔

ڈبی بازار کا حادثہ: ۔ ۳ مئی ۱۹۲۷ء کو لاہور کے ہندوؤں اور سکھوں کی ایک کثیر تعداد باؤلی صاحب ڈبی بازار میں جمع ہوئی جہاں اشتعال انگیز نعرے لگائے گئے اور تقریریں کی گئیں۔ وجہ یہ ظاہر کی گئی کہ ایک مسلمان نے ایک سکھ لڑکی پر مجرمانہ حملہ کیا ہے۔ مشتعل ہجوم حویلی کابلی مل میں داخل ہوا اور مسلمانوں پر کرپانوں اور لاٹھیوں سے حملہ کر دیا۔ اس واقعے سے پورا شہر فسادات کی لپیٹ میں آ گیا۔ کاروباری مراکز بند ہو گئے، شہری زندگی تقریباً معطل ہو گئی۔ مسلم اکابرین نے مسلمانوں کے

جذبۂ انتقام کو ٹھنڈا کیا۔ پنجاب مسلم لیگ نے مظلومین کی اعانت کے لیے ایک مجلس قائم کی جس کے صدر علامہ اقبال مقرر ہوئے۔ علامہ اقبال نے دونوں قوموں میں مصالحت کرانے اور مظلومین کی امداد و اعانت میں اہم کردار ادا کیا۔ اس پر انہیں ہندوستان کے دیگر مسلمان رہنماؤں کی طرف سے ہمدردی اور مبارکباد کے پیغامات موصول ہوئے جن میں ان کی مساعیٔ جمیلہ کو سراہا گیا۔ اگرچہ ترکِ موالات کے سلسلے میں محمد علی جوہر علامہ اقبال سے ناراض تھے لیکن فساداتِ لاہور کو فرو کرنے اور حالات کو سازگار بنانے میں علامہ اقبال نے جس خلوص اور محنت سے کام کیا تھا، وہ بھی اقبال کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ اپنے اخبار "ہمدرد" بابت ۸ مئی ۱۹۲۷ء میں اپنے دلی تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے محمد علی جوہر نے لکھا: "میں نے جب اخبارات میں پڑھا کہ کس طرح علامہ اقبال نے مسلمانوں کو ایک بار نہیں بلکہ بار بار اور دن رات صبر و تحمل کی تلقین فرمائی تو میرے دل سے اس سچے محبِ وطن کیلئے دُعا نکلی"۔[1]

حالات نے جو تازہ کروٹ لی تھی اس سے صاف طور پر معلوم ہو رہا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد ایک خوابِ پریشاں سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اس کے باوجود مولانا جوہر ابھی تک پورے خلوص سے یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل کا حل ہندو مسلم اتحاد میں مضمر ہے۔ اس کے برعکس اقبال نے ۲۳ مئی ۱۹۲۷ کو "مسلم آؤٹ لک" کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا:

"اب میں اس امر کا قائل ہو گیا ہوں کہ اس صوبہ کے مسلمانوں کا اوّلین فرض یہ ہے کہ وہ اپنی داخلی تنظیم اور اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔ ۔ ۔ ۔ تنازع للبقا کے اس عالمگیر دور میں دوسری قوموں سے امداد کی توقع رکھنا فضول ہے۔ سب کو اپنے

---

[1] بحوالہ محمد احمد خاں "اقبال کا سیاسی کارنامہ"، صفحہ ۱۵۶۔

قدموں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ جب سب قومیں فی الواقع مضبوط ہو جائیں گی تو باہمی مفاہمت ہونا یقینی امر ہے۔" [۱]

ایک اہم اختلاف۔ برِصغیر کی دو بڑی قوموں کے باہمی اختلافات نے فسادات کی شکل اختیار کر لی تو اقبال ایسا حساس شخص اس صورتِ حال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ انہوں نے خیال کیا کہ اس طرح کے فسادات کی ایک اہم وجہ دونوں قوموں کے درمیان شدید قسم کی بے اعتمادی کا پیدا ہونا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب پنجاب کونسل میں سرکاری محکموں میں ملازمتوں کو حتی الامکان مقابلے کے امتحان سے پُر کرنے کی تجویز پیش ہوئی اور انتخاب کرتے وقت مستند ترین امیدوار کو بلا لحاظ مذہب و ملت ملازمت دینے کا مشورہ دیا گیا تو اقبال نے ۱۹ جولائی ۱۹۲۷ء کی تقریر میں سابقہ فسادات کے دَوران دونوں قوموں کے رویّے کی مثالیں دیتے ہوئے ثابت کیا کہ دونوں قوموں کی دیسی افسروں کی غیر جانبداری اور دیانتداری پر اعتماد نہیں اور دونوں قومیں دیسی افسروں کے بجائے یورپین افسر چاہتی ہیں۔ انہوں نے کہا: "مجھے بھی ہندو مسلم اتحاد مطلوب ہے لیکن مَیں حقائق سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا، لہٰذا اگر برٹش افسروں کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے تو مَیں اس کا خیر مقدم کروں گا۔" انہوں نے کہا: "جو لوگ متحدہ قومیّت کا نعرہ لگاتے ہیں انہیں چاہیے کہ وہ پہلے دونوں قوموں کے درمیان اعتماد پیدا کریں۔ یہ نہیں کہ زبان سے تو متحدہ قومیت کہیں اور اندرونی طور پر ایک دوسرے کو زک پہنچانے کی سازشیں کی جائیں۔" [۲] محمد علی جوہر نے اقبال کی اس رائے سے شدید اختلاف کیا کہ ہندو مسلم افسروں کے بجائے انگریز افسران مقرر کیے جائیں۔ انہوں نے "ہمدرد" میں "میرا استاد اقبال"، "شاعرِ اسلام" اور "شمع و شاعر کے مصنف سے ایک سوال" وغیرہ عنوانات پر مسلسل مقالات لکھے اور واضح کیا کہ اس سے ہندوستان کی آزادی کے

---

[۱] ایضاً، صفحہ ۳۷۔

[۲] لطیف احمد خان شیروانی، مرتب، "حرفِ اقبال"، صفحہ ۸۷-۹۱۔

مطالبے کو شدید نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ انہوں نے اقبال پر تنقید کرتے ہوئے لکھا:

"وہ آج ہمارے مرض کا علاج اسے نہیں سمجھتے کہ ہندوؤں کو غیرت دلانے کی کوشش کی جائے کہ اقلیت کے ساتھ ناانصافی نہ کرو، جب تک اس کو رام نہ کرو گے سوراج نہ لے سکو گے، اس کے استیصال کا خیال حماقت نہیں جنون ہے" لے

اس کے بعد انہوں نے تاریخ کے حوالے سے ثابت کیا کہ ہندو محض طاقت اور تشدد سے مسلمانوں پر غلبہ نہیں پا سکتے۔ لہٰذا دونوں انصاف اور رواداری کے اصولوں کو اپنا کر آزادی حاصل کریں:

"اب اگر غلامی سے نکلنا ہے تو اس کا یہی طریقہ ہے کہ ہم تم ایک دوسرے کے ساتھ انصاف اور رواداری کا برتاؤ کریں، ایک دوسرے کی طرف سے جو اذیت زبان سے یا ہاتھ سے پہنچتی ہے اس پر صبر کریں، مگر اس غلامی کو ہرگز نہ برداشت کریں جس میں تم بھی سوڈیڑھ سو برس سے مبتلا ہو اور ہم بھی اور جو یقیناً ہندو راج سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے اور مسلم راج سے بھی" ۲ے

اس کے بعد انہوں نے علامہ اقبال کو تلقین کی کہ دونوں قوموں کو خصوصاً مسلمانوں کو صبر کی تعلیم دیں، اور جدوجہد آزادی میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

"نہ ڈاکٹر [اقبال] صاحب اسے ہمارے مرض کا علاج سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو صبر کی تلقین کریں اور ان سے کہیں کہ گو یہ یقینی امر ہے کہ تمہیں خدا کی خاطر ساری خدائی سے لڑنا پڑے گا لیکن تم ایک ہی وقت ساری دنیا سے نہیں لڑ سکتے دشمنوں میں سے ایک کو چھانٹ لو جسے تم الدالخصام سمجھتے ہو جو تمہارے دشمنوں میں سب سے زیادہ قوی ہے، اگر ہو سکے تو اس کے خلاف اوروں کو اس طرح اپنا حلیف بنا لو

لے سید رئیس احمد جعفری، "سیرت محمد علی"، صفحہ ۳۶۵۔

۲ے ایضاً، صفحہ ۳۶۷۔

جس طرح رسولِ اکرمؐ نے یثرب کے یہودیوں تک کو مشرکین مکہ کے خلاف اپنا حلیف بنا لیا تھا۔ اگر کوئی جماعت کبھی تمہارے سیاسی تدبر سے رام ہو کر تمہاری حلیف نہ بن سکے تب بھی ہر محاذِ جنگ پر یکساں زور نہ لگاؤ اور محاذوں پر صرف مدافعت کرتے رہو اور جس محاذ پر جہاں جنگ کا فیصلہ ہونے والا ہے پورا زور صرف کر دو، اور ہر جگہ صبر و ضبط سے کام لو۔ جب سب سے بڑے محاذِ جنگ پر فتح حاصل ہو جائے تو دوسرے محاذوں پر آپ ہی فتح حاصل ہو جائے گی اور اس وقت ایک ایک کر کے ہر دشمن سے دل کھول کر انتقام لے لینا، یہ نامردی نہیں ہے بلکہ اسی کو "عزم" کہتے ہیں۔" [۱]

محمد علی جوہر نے جس سیاسی حکمتِ عملی کو جنگی اصطلاحات کی مدد سے سمجھانے کی کوشش کی وہ اپنی جگہ درست تھی لیکن ہندو اکثریت کا رویہ روز بروز اس قدر غیر منصفانہ، متعصبانہ بلکہ معاندانہ ہوتا جا رہا تھا کہ اس کا مداوا محض مسلمانوں کو صبر کی تلقین کر کے ممکن نہیں تھا۔ خود محمد علی جوہر نے دہلی ملاپ کانفرنس میں شریک ہو کر باہم اعتماد بحال کرنے کی سر توڑ کوشش کی لیکن انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ دراصل ان فسادات کی پشت پر جو عوامل کام کر رہے تھے ان کا سدِ باب صرف سیاسی مسائل کے حل ہی سے ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعد ازاں تمام مسلمان رہنماؤں کو اس نتیجے پر پہنچنا پڑا۔

سائمن کمیشن کا قضیہ۔ ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۷ء میں ہونے والے فسادات سے بعض ہندو اور مسلمان رہنماؤں نے سوچا کہ ان کی اصل وجہ جداگانہ انتخاب کا طریقہ ہے جس سے متعصب نمائندے منتخب ہو کر کونسلوں میں پہنچتے ہیں اور وہ فسادات کو ہوا دے کر اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔ لہٰذا کیوں نہ اس طریقِ انتخاب ہی کو ترک کر دیا جائے؟ ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو جب سرکردہ مسلم زعما کا ایک اجلاس محمد علی جناح کی زیرِ صدارت دہلی میں ہوا جس میں محمد علی جوہر، سر محمد

---

[۱] ایضاً، صفحہ ۳۶۷-۳۶۸۔

شفیع اور ڈاکٹر انصاری ایسے لوگ شامل تھے تو اس اجلاس میں ہندو مسلم سمجھوتے کو ممکن بنانے کے لیے تحفظ و توازن کے اصول کے تحت مشروط طور پر مخلوط انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا گیا۔ کانگریس نے بھی دہلی تجاویز کو منظور کر لیا، لیکن ابھی آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس دسمبر ۱۹۲۷ء میں لاہور میں ہونے والا تھا کہ دہلی تجاویز کے سلسلے میں مسلم لیگ دو گروہوں میں بٹ گئی۔ جناح لیگ ان کی حامی اور شفیع لیگ ان کی مخالف تھی۔ دونوں گروہ اپنے زیر اثر علاقے میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے انعقاد کا مطالبہ کرنے لگے۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ نومبر ۱۹۲۷ء میں برطانوی حکومت نے مزید دستوری اصلاحات کے متعلق سفارشات پیش کرنے کی غرض سے سر جان سائمن کی سرکردگی میں ایک کمیشن مقرر کیا۔ کمیشن پر اعتراض کیا گیا کہ اس میں کوئی ہندوستانی شامل نہ کر کے ہندوستانیوں کی اہانت کی گئی ہے۔ لہٰذا کانگریس، جناح لیگ اور خلافت کمیٹی نے اس کے مقاطعے کا فیصلہ کیا لیکن دوسری طرف شفیع لیگ اس سے تعاون کے حق میں تھی۔ علامہ اقبال نے ۸ نومبر ۱۹۲۷ء کے بیان میں پنجاب مسلم لیگ کے سیکرٹری کی حیثیت سے کمیشن کی ہیئت ترکیبی پر اعتراض کی تو تائید کی لیکن اس کوتاہی کی وجہ ہندو مسلم اقوام کی باہمی بے اعتمادی اور بد ظنی کو قرار دیا۔ علامہ اقبال نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ تمام قوموں کو مل جل کر ملک کے سیاسی مسائل کا تصفیہ کرنا چاہیے[1]۔ ۱۲ نومبر ۱۹۲۷ء کو پنجاب صوبائی مسلم لیگ کے اجلاس میں کمیشن کے مقاطعے کی تجویز کو ملکی اور اسلامی نقطۂ نظر سے مسترد کر دیا گیا اور طے کیا گیا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ آگے بڑھ کر اپنے اندیشے، امیدیں اور مقاصد سائمن کمیشن پر ظاہر کریں۔ لیکن محمد علی جوہر کمیشن کے سخت مخالف تھے اور اس کے مقاطعے کے پُر جوش حامی ہی نہیں بلکہ داعی بھی تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ علامہ اقبالؒ کمیشن سے تعاون پر تلے ہوئے ہیں تو انہوں نے ۱۵ نومبر ۱۹۲۷ء کو "ہمدرد" میں [لیگ] پنجاب کی اس روش پر سخت گرفت کی اور لکھا:

---

[1] محمد رفیق افضل، مرتب، "گفتارِ اقبال"، صفحہ ۵۰-۵۱۔

"سر محمد شفیع" سے بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ کسی وائسرائے کی رائے سے ہم رائے نہ ہوں؟ انھوں نے وفاداری کا راگ گانا شروع کر دیا ہے۔ یہ پنجاب کی بدقسمتی ہے کہ سر اقبال جیسے لیڈر سر محمد شفیع کی وفاداری کی پست سطح پر اُتر آئے ہیں۔ چنانچہ کمیشن کے متعلق پنجاب مسلم لیگ کے سیکرٹری کا بیان اس کے صدر کے بیان سے کہیں زیادہ چاپلوسی کا ہے۔ پنجاب حقیقتاً اچھے لوگوں کا خطہ ہے مگر ان کی رہنمائی صحیح طور پر نہیں کی جاتی۔"[1]

ان سطروں میں علامہ اقبالؒ پر طنز و تعریض کے جو تیر برسائے گئے ہیں وہ ظاہر ہے کہ اقبال کے لیے ناقابلِ برداشت ہوں گے، لیکن اقبال نے حسبِ دستور مولانا جوہر کو کسی قسم کا جواب دینے سے گریز کیا۔ رہے جوہر تو انھوں نے صرف اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ سائمن کمیشن سے تعاون میں اٹھنے والی آواز کو دبانے کے لیے انھوں نے فوراً لاہور کا رخ کیا۔

سائمن کمیشن کی آمد سے ایک روز پہلے موچی دروازہ کے باہر باغ میں کمیشن کی تمام مخالف جماعتوں کا ایک مشترکہ اجلاس ہوا جس کی صدارت کے فرائض لالہ لاجپت رائے نے انجام دیے۔ ڈیڑھ دو لاکھ کے قریب حاضری تھی۔ ظفر علی خاں اپنے مخصوص انداز میں تقریر کیا کر رہے تھے شعلے برسا رہے تھے کہ اچانک حاضرین کے ایک حصے میں ہلچل سی ہوئی۔ معلوم ہوا کہ مولانا محمد علی جوہر جلسے میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔ فضا "محمد علی جوہر زندہ باد" کے نعروں سے گونجنے لگی۔ مولانا جوہر ایک ہاتھ میں چھوٹا سا اٹیچی کیس اور دوسرے میں ایک کتاب لیے ہوئے آگے بڑھتے دکھائی دیے۔ جب وہ سٹیج پر بیٹھ گئے تو کسی نوجوان نے مولانا کی خدمت میں ایک اشتہار پیش کیا جس میں مسلمانوں سے سائمن کمیشن کے مقاطعے سے باز رہنے کی اپیل کی گئی تھی اور اس اشتہار پر سر محمد شفیع، سید افضال علی حسنی، خلیفہ شجاع الدین، نواب ذوالفقار علی خاں، مولانا غلام محی الدین قصوری اور خواجہ فیروز الدین بیرسٹر

---

[1] محمد احمد خاں، مرتب، کتاب مذکور، صفحہ ۱۰۷۔

جیرہم کے علاوہ علامہ اقبالؒ کے دستخط بھی تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کے بعد مولانا جوہر کو تقریر کی دعوت دی گئی۔ مولانا نے کہا:

"مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ سائمن کمیشن کی آمد پر مسلمان ہڑتال میں حصہ کیوں لیں! میں کہتا ہوں کہ وہ ہڑتال اس لیے کریں کہ مسلمانوں کا اقبال مر گیا ہے۔ وہ ہڑتال اس لیے کریں کہ "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" لکھنے والا اقبال اللہ کو پیارا ہو گیا ہے۔ وہ ہڑتال اس لیے کریں کہ اقبال جس نے لکھا ہے ع

طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

اس جہان سے چل بسا۔ بھائیو! میں سٹیشن سے سیدھا جلسہ گاہ میں چلا آیا ہوں۔ دہلی سے لاہور تک دورانِ سفر میں میرے زیرِ مطالعہ اقبال کا "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" رہا ہے اور میرے سوٹ کیس میں روانگی کے وقت ایک جوڑا کپڑوں کا اور "شکوہ" اور "جواب شکوہ" کی دو جلدیں تھیں اور وہی اس وقت میرے ہاتھوں میں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ کل اقبال کا جنازہ اٹھایا جائے گا۔ اس اقبال کا جس نے "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" کے علاوہ دوسری بے شمار نظمیں لکھ کر مسلمانوں میں حریت و آزادی کی روح پھونکی۔ کل اس کا جنازہ اٹھایا جائے گا۔ اس لیے مسلمانوں کو ہڑتال میں حصہ لینا چاہیے ---- سائمن کمیشن کی حمایت میں اشتہار پر کاسہ لیسانِ ازلی اور وفادارانِ سرمدی کے ناموں کے ساتھ علامہ اقبال کا نام دیکھ کر مجھے روحانی، قلبی اور دماغی اذیت ہوئی ہے۔ میں اقبال کو اس دور کے مسلمانوں کا روحانی اور ذہنی قائد سمجھتا ہوں اور اقبال کے اشعار کو آزادی اور اسلام کی سربلندی کی نظیر خیال کرتا ہوں۔ اس کے اشعار مسلمانوں میں آزادی کی روح کو بیدار کرتے ہیں۔ اس کے خیالات منزلِ حریت کی طرف مسلمانوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ لیکن اس کا عمل مسلمانوں میں رجعت کے احساس کو نشوونما بخشتا ہے۔ کاش وہ گفتار کے غازی کے ساتھ ساتھ کردار کا

مجاہد بھی ہوتا! "[1]

بہر حال اس جلسے کا اثر یہ ہوا کہ دوسرے دن جب سائمن کمشن کے ارکان لاہور آئے تو عوام نے زبردست مظاہرہ کیا اور علامہ اقبالؒ اور ان کے رفقاء کی اپیل پر بالکل کان نہ دھرا اور "سائمن واپس جاؤ" اور "برطانیہ مردہ باد" کے فلک شگاف نعروں سے کمشن کا "خیر مقدم" کیا۔

نہرو رپورٹ۔ کانگریس نے مارچ ۱۹۲۸ء میں دہلی میں ایک آل پارٹیز کانفرنس منعقد کی جس میں ہندو مہاسبھا، جمعیت العلمائے ہند، مسلم لیگ، نیشنل لبرلشن فیڈریشن، سکھ لیگ وغیرہ جماعتوں کے نمائندے شریک ہوئے۔ ۱۹ مئی ۱۹۲۸ء کو اس کانفرنس کا دوبارہ اجلاس ہوا جس میں پنڈت موتی لال نہرو کی سرکردگی میں برطانوی مدبرین کے دئیے ہوئے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے متفقہ دستوری سفارشات مرتب کرنے کے لیے کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس کمیٹی کی مرتب کردہ رپورٹ "نہرو رپورٹ" کہلائی۔ اس میں دیگر امور کے ساتھ وحدانی حکومت اور مخلوط انتخاب کا اصول اپنایا گیا۔ ۲۸، ۲۹ اور ۳۰ اگست کو لکھنؤ میں اس کانفرنس کا پھر اجلاس ہوا جس میں رپورٹ پیش کی گئی۔ مولانا محمد علی جوہر بغرض علاج یورپ گئے ہوئے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں مولانا شوکت علی نے ان کی نمائندگی کی۔ شوکت علی اور حسرت موہانی نے مذکورہ اصول کی شدید مخالفت کی، لیکن ان کے شور و غوغا کے باوجود رپورٹ منظور کر لی گئی۔ رپورٹ کی آخری منظوری کے لیے دسمبر ۱۹۲۸ء میں کلکتہ میں آل پارٹیز کنونشن منعقد ہوا۔ محمد علی جوہر اپنا علاج ادھورا چھوڑ کر وطن لوٹ آئے۔ انہوں نے کنونشن میں شرکت کی۔ محمد علی جوہر اور محمد علی جناح نے بعض ضروری ترامیم کے ساتھ رپورٹ قبول کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا، لیکن ہندو رہنماؤں نے مسلم مطالبات پر مشتمل ترامیم ماننے سے

---

[1] اشرف عطا، "کچھ شکستہ داستانیں، کچھ پریشان تذکرے"، صفحہ ۵۰ - ۵۱۔

انکار کر دیا جس کے نتیجے میں دونوں رہنما کانگریس سے مایوس ہو گئے۔ اس طرح یہ دونوں رہنما بھی اس نتیجے پر پہنچ گئے جس پر اقبال برسوں پہلے پہنچ چکے تھے۔

آل انڈیا مسلم کانفرنس۔ نہرو رپورٹ کی مخالفت نے مسلم رہنماؤں کو اکٹھا کر دیا۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۲۸ء تا یکم جنوری ۱۹۲۹ء آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا اجلاس دہلی میں سر آغا خاں کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس میں اقبال، جوہر، شوکت، حسرت، مفتی کفایت اللہ، سر شفیع اور نواب محمد اسمٰعیل خاں ایسے رہنما شریک ہوئے۔ اس جلسے میں وفاقی طرزِ حکومت اور جداگانہ طریقِ انتخاب پر زور دیا گیا۔ اس زمانے میں چونکہ کوئی مسلم سیاسی جماعت بھی پورے طور پر برصغیر میں مقبول اور مؤثر نہ تھی، اس لیے مسلم کانفرنس نے قیادت کے اس خلا کو پُر کرتے ہوئے نمایاں خدمات انجام دیں۔ سر فضل حسین کی کوششوں سے حکومت نے بھی مسلم کانفرنس کو مسلم اکثریت کی نمایندہ ترین جماعت تسلیم کر لیا۔

گول میز کانفرنس۔ ابھی سائمن کمیشن کی رپورٹ پر حکومت نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ لارڈ اروِن، وائسرائے ہند، نے ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء ہندوستان کے دستوری مسائل کے تصفیے کے لیے لندن میں گول میز کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا۔ کانگریس نہرو رپورٹ کو من و عن تسلیم نہ کرنے کی بنا پر حکومت سے ناراض تھی۔ اس لیے اس نے کانفرنس کا مقاطعہ کیا اور گاندھی کی زیرِ قیادت عدم تشدد کے ساتھ سول نافرمانی شروع کر دی۔ ۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو یہ تحریک شروع ہوئی لیکن حکومت نے جلد ہی گاندھی، نہرو اور دیگر اہم سیاسی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ ہندوؤں کے متعصبانہ رویے، گذشتہ تحریکِ عدم تعاون میں گاندھی کی یکطرفہ کارروائی اور مسلم مطالبات کے سلسلے میں ہندو رہنماؤں کے معاندانہ رویے نے محمد علی جوہر ایسے مسلمان رہنما بہت دل برداشتہ تھے۔ اس لیے انہوں نے گاندھی کا ساتھ نہیں دیا جس سے یہ تحریک اپنی موت آپ مر گئی۔

جوہر گول میز کانفرنس میں۔ گول میز کانفرنس کے لیے حکومت نے

جن مسلم رہنماؤں کو مدعو کیا ان میں محمد علی جناح کے سوا تمام رہنما مسلم کانفرنس سے تعلق رکھتے تھے، لیکن ان میں صرف چند رہنما ایسے تھے جو انگریزوں کے سامنے مسلمانوں کا مقدمہ لڑ سکتے تھے۔ ان چند رہنماؤں میں مولانا محمد علی جوہر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں جرأت بھی تھی اور قابلیت بھی، انگریزوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے خطرناک علالت کے باوجود طویل سفر کی زحمت اور لندن میں مسلم مطالبات اور ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں محنت شاقہ برداشت کرنے کا عزمِ مصمم کر لیا۔ ان کے احباب نے انہیں لاکھ سمجھایا کہ اس شدید علالت میں ان کا وطن سے دُور جانا اور طویل سفر اختیار کرنا مصلحت کے خلاف ہے، لیکن محمد علی جوہر کہاں ماننے والے تھے۔ انہیں سٹریچر پر لٹا کر جہاز میں سوار کرایا گیا۔ آخر لندن پہنچ گئے اور مسلم مطالبات کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کی جدوجہد میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ انہوں نے واضح کر دیا کہ وہ اول و آخر مسلمان ہیں اور آبرومندانہ اور منصفانہ تصفیے کے خواہاں ہیں۔ اگر ہندو مسلمانوں کے مطالبات کے لیے ہمدردانہ جذبات کا اظہار کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمانوں کے سروں پر چھائے ہوئے خوف و اضطراب کے بادل چھٹ نہ جائیں اور دونوں قومیں باہمی اعتماد اور حُسنِ ظن کی فضا میں سیاسی اختلافات حل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ غرضیکہ محمد علی جوہر نے اس خلوص اور محنت سے کام کیا کہ اپنے اور غیر سب ان کے قائل ہو گئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ۱۹ نومبر ۱۹۳۰ء کو گول میز کانفرنس سے جو خطاب کیا خطابت، سیاست اور جذبۂ آزادی و حریت کی تاریخ میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ اسی تقریر میں آپ نے درجۂ مستعمرات کے بجائے کامل آزادی کا مطالبہ کیا اور فرمایا:

"آج جس مقصد کے لیے میں یہاں آیا ہوں وہ یہی ہے کہ میں اپنے ملک کو اسی حالت میں واپس جاؤں جب کہ آزادی کا پروانہ میرے ہاتھوں میں ہو۔ میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا۔ میں ایک غیر ملک میں جب تک وہ آزاد

ہے مرنے کو ترجیح دونگا اور اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو پھر آپ کو یہاں مجھے قبر کے لیے جگہ دینی پڑے گی "۔[1]

نیا سال شروع ہوا تو ان کی علالت کثرتِ کار سے بے حد بگڑ گئی۔ اگرچہ محمد علی جوہر بستر علالت پر نہیں بستر مرگ پر لیٹے ہوئے تھے، ان کی سیاسی سرگرمیاں مسلسل جاری رہیں۔ وہ آخر دم تک ہندوستان کی آزادی، اسلام کے غلبے اور مسلمانوں کی عظمت کے لیے جدوجہد میں مصروف رہے۔ کبھی اس سے ملاقات ہو رہی ہے اور کبھی اس سے گفتگو۔ آخر ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو نپولین کے دل، برک کی زبان اور میکالے کے قلم کا مالک، عظیم محبِ وطن، مجاہدِ آزادی اور بے مثال زعیمِ ملتِ اسلامیہ لندن میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا محمد علی جوہر کی وفات پر دلی رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

"افسوس وہ پُر درد آواز جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے ہر قیامت آفریں سانحہ میں صدائے درد بن کر بلند ہوتی رہی، ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی، وہ بے قرار دل جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بے تاب ہو جاتا تھا اور اوروں کو بے تاب کرتا تھا قیامت تک کے لیے ساکن ہو گیا، وہ اشک آلود آنکھیں جو دین و ملت کے ہر ماتم میں آنسوؤں کا دریا بن جاتی تھیں تاکہ ان کی روانی ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی، وہ مترنم جوہر جو بزم میں خوشنوا بلبل بن کر چہکتے تھے ان کے ترانے ہمارے کان نہ سنیں گے، وہ آتش زبان جوہر جو رزم میں تیغ براں بن کر چمکتا تھا اس کی تابش اب کسی معرکے میں ہماری آنکھوں کو نظر نہ آئے گی، وہ پُر جوش سینہ جو ہمارے مصائب کے پہاڑوں کو سیلاب بن کر بہالے جاتا تھا اس کا تلاطم ہمیشہ کے لیے تھم گیا، وہ پُر زور دست و بازو جو شب و روز کی خدمت گزاری اور نبرد آزمائی میں مصروف تھے وہ اب ایسے تھکے کہ پھر نہ اٹھیں گے، اور افسوس کہ

---

[1] سید رئیس احمد جعفری، "سیرت محمد علی"، صفحہ ۵۲۷۔

شکست خوردہ فوج کا وہ آخری سپاہی جو اعداء کے نرغے میں تنہا لڑ رہا تھا آخر دشمنوں سے چور ہو کر ایسا گرا کہ پھر نہ کھڑا ہو گا۔ الوداع محمد علی الوداع! والسلام الی یوم القیام![1]

اقبال کی دادے ۔ اقبال اور جوہر دونوں ایک ہی ملت کے رکن تھے، دونوں خدا کے آخری رسولؐ کے عاشق تھے، دونوں کاروانِ آزادی کے سالار تھے، دونوں ایک نصب العین کے مالک تھے۔ اس کے باوجود سیاست کی موجوں نے بعض اوقات دونوں کے درمیان اختلاف و مغائرت کی دیواریں کھڑی کر دیں۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے دونوں کی باطنی یک رنگی اور ظاہری اختلافِ مزاج کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اقبال اور جوہر کا رنگ عملی دنیا میں ایک دوسرے سے الگ رہا، لیکن نظر اگر سطح سے گزر کر تہ تک پہنچے اور محض عمل نہیں، تو محرکاتِ عمل سامنے ہوں، تو ہر دیکھنے والا دیکھ لے گا کہ دونوں ایک ہی مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔ سرشت ایک، طینت ایک، قالب دو، روح ایک، حبِّ اسلام کے جنون میں دونوں گرفتار، عشق رسولؐ و اسلام کے جام سے دونوں سرشار۔ ایک کی سیاست دوسرے کی شاعری۔ دونوں اس رنگ سے رنگیں۔ فرق صرف اتنا کہ ایک کے کلام میں فن و زِ عرفان، دوسرے کے قلم و زبان میں جوشِ طوفان۔ دونوں دنیا میں جیسے تو اسلام کی توحید کا کلمہ پڑھتے ہوئے، دونوں دنیا سے اٹھے تو آبرو دیے ناز نامِ مصطفیٰؐ کا وظیفہ جپتے ہوئے۔ ایک کے چہرے پر سیاست کا نقاب، دوسرے کے نام کا سخن گویوں کی محفل سے انتساب! حقیقتاً نہ یہ شاعر نہ وہ سیاسی لیڈر۔"[2]

لیکن چونکہ دونوں کی محبت ذاتی اغراض و مفادات سے پاک اور خالص اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے تھی، اس لیے سیاسی معاملات میں شدید اختلاف کے

---

[1] ایضاً، صفحہ ۱۷۲۔

[2] مجلہ "جوہر"، اقبال نمبر، صفحہ ۲۷۔

باوجود دونوں دل کی گہرائیوں سے ایک دوسرے کے قدردان رہے حکیم محمد حسن قرشی لکھتے ہیں:

" علامہ اقبال سے مولانا محمد علی کے بارے میں راقم الحروف کی گفتگو ہوئی علامہ اقبال مولانا محمد علی کے خلوص، ایثار اور قابلیت کے مداح تھے اور انہیں تحریکِ آزادی کا نامور ہیرو سمجھتے تھے۔ علامہ مرحوم مولانا محمد علی کی اس خوبی کے قائل تھے کہ جب کبھی مولانا مرحوم نے اپنی کسی رائے میں نقص محسوس کیا تو اپنی رائے کو تبدیل کرنے میں تامل سے کام نہیں لیا اور اس سلسلے میں بے جا ضد یا ہٹ دھرمی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ علامہ مرحوم نے فرمایا، آخر [عمر] میں مولانا محمد علی نے کہا تھا کہ بعض سیاسی معاملات میں آپ کی رائے صحیح تھی اور میں غلطی پر تھا"۔ [۱]

علامہ اقبالؒ کے اس ملفوظ کی تائید اس خط سے بھی ہوتی ہے جو یکم فروری ۱۹۳۱ء کو انہوں نے ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ کو لکھا تھا۔ اس میں مولانا جوہر کی وفات پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں:

"مسٹر محمد علی کا خاتمہ بخیر ہوا۔ اگرچہ میں ان کی سیاست کا کبھی بھی مداح نہ تھا لیکن ان کی اسلامی سادگی اور آخری سالوں میں اپنی بعض آرا کے بدل لینے میں جس امانت و دیانت کا انہوں نے ثبوت دیا، بہت احترام کرتا ہوں۔ اپنے متعلق ان کی پیش گوئی بھی درست ثابت ہوئی ہے اور اس سے بھی قوم میں ان کا وقار بڑھ گیا ہے۔ مسجدِ اقصٰی میں آخری آرامگاہ کا میسر آنا ان کی خوش نصیبی ہے جس سے ان کا مرتبہ بلند تر ہو گیا ہے۔ اب تو محض ایک سیاسی رہنما کی حیثیت

---

[۱] ہفت روزہ "چٹان" لاہور، ۱۲ فروری ۱۹۶۴ء۔

سے ان کا مرتبہ نہایت ارفع ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔"[1]

خراجِ عقیدت۔ اقبال کو جوہر سے جو محبت تھی اور ان کی نظروں میں اسلام کے اس سچے عاشق کا جو مرتبہ تھا اس کا اظہار اس قطعے سے ہوتا ہے جو انہوں نے جوہر کی وفات پر کہا:

یک نفس جان نزار او تپید اندر فرنگ
تا شرہ برہم زنیم از ماہ و پروین درگزشت
اے خوشا مشت غبار اُو کہ از جذب حرم
از کنارِ اندلس و از ساحل بربر گزشت
خاک قدس اُو را بہ آغوشِ تمنا در گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت
می نہ گنجد جز بہ آں خاکے کہ پاک از رنگ و بوست
بندۂ کو از تمیز اسود و احمر گزشت!
جلوۂ او تا ابد باقی بچشم آسیا است
گرچہ آں نور نگاہ خاور از خاور گزشت[2]

---

[1] شیخ عطاء اللہ، مرتب، کتاب مذکور، ۱/۲۶۸۔

[2] غلام رسول مہر، صادق علی دلاوری، مرتبین، "سرودِ رفتہ"، صفحہ ۱۹۲۔ تیسرے شعر کا مصرعہ اولیٰ ابتدا میں یوں تھا:

مشت خاکش را بہ خاکِ پاک قدس آمیختند

[دوسرے شعر کا مصرعۂ اول "باقیاتِ اقبال"، (مرتبہ سیّد عبدالواحد معینی و محمد عبداللہ قریشی) کی دوسری اشاعت کے صفحہ ۲۵۴ پر اس طرح درج ہے:

اے خوشا مشتِ غبار او کہ در جذبِ حرم۔ مدیر "اقبال"]

تیسری گول میز کانفرنس اور اقبالؒ

پس منظر۔ برصغیر پاک و ہند میں آزادی کی جدوجہد میں مسلمانوں نے ہمیشہ اس بات کی خواہش اور کوشش کی کہ ہندو اکثریت کسی نہ کسی طرح آبرو مندانہ تصفیے پر آمادہ ہو جائے لیکن ہندوؤں نے عددی اکثریت اور انگریزی حکومت کی سرپرستی کے زعم میں ایسی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا۔ ہندو مسلمانوں کے جداگانہ وجود کو تسلیم کرنے پر کبھی تیار نہ ہوئے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان برصغیر میں ان کے غلام اور ماتحت بننے پر قانع ہو جائیں۔ اس کے باوجود مسلمان رہنماؤں نے ہندو مسلم تصفیہ کی کوششیں ایک مدت تک جاری رکھیں۔ ۱۹۱۶ء کا "میثاقِ لکھنؤ" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں ہندوؤں نے مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت کو تسلیم کر لیا، لیکن جلد ہی ہندو اس میثاق کو پس پشت ڈالنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ اس طرزِ عمل کے باوجود مسلمانوں نے ۱۹۲۷ء میں "دہلی تجاویز" پیش کیں جن کی رُو سے مسلمان بعض شرائط کے تحت جداگانہ انتخاب کے مطالبے سے بھی دست بردار ہونے پر آمادہ ہو گئے، لیکن یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ اور "نہرو رپورٹ" نے ہندو مسلم تصفیے کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

نہرو رپورٹ۔ حکومتِ انگلستان نے ۱۹۱۹ء کی دستوری اصلاحات کے نفاذ کے وقت کہا تھا کہ دس سال بعد ان اصلاحات کا جائزہ لینے کے لیے ایک وفد ہندوستان کا دورہ کرے گا جس کی سفارشات کی روشنی میں مزید دستوری اصلاحات نافذ کی جائیں گی۔ مجوزہ وفد کی آمد کا وقت چونکہ قریب آ رہا تھا اس لیے ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں ہندو مسلم مفاہمت کی ضرورت زیادہ شدت سے محسوس کی جانے لگی۔ اسی زمانے میں وزیرِ ہند لارڈ برکن ہیڈ Lord Birkenhead نے کہا کہ ہندوستانی اس حد تک منتشر اور اختلاف

رائے کے شکار ہیں کہ وہ کوئی متفقہ دستور بنانے سے قطعی طور پر قاصر ہیں۔ سیاسی رہنماؤں نے اس خیال کو غلط ثابت کرنا ضروری سمجھا۔ اسی مقصد کے لیے مارچ ۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس میں دستوری مسائل کا جائزہ لینے کے لیے دو ذیلی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں لیکن ۱۹ مئی ۱۹۲۸ء کو جب کانفرنس کا اجلاس ہوا تو دونوں کمیٹیاں اپنا کام مکمل نہ کر سکی تھیں۔ اس لیے اس اجلاس میں فرقہ وارانہ مسائل پر غور و خوض کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا سربراہ پنڈت موتی لال نہرو کو مقرر کیا گیا۔ اس کمیٹی نے تین ماہ میں اپنا کام مکمل کر لیا۔ جب ۲۸ اگست ۱۹۲۸ء کو لکھنؤ میں اس رپورٹ پر غور کیا گیا تو کچھ اراکین نے مکمل آزادی کے مطالبے کی شمولیت پر اصرار کیا۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں کلکتہ میں آل پارٹیز کنونشن میں اس رپورٹ کو زیرِ غور لایا گیا تو قائدِ اعظم محمد علی جناح نے اس میں مسلم مطالبات شامل کرنے پر زور دیا لیکن ان کی تجویز مسترد کر دی گئی۔ اس سے مسلم رہنما ہندو مسلم تصفیے سے ناامید ہو گئے۔

مسلم کانفرنس: "نہرو رپورٹ" میں مسلم مطالبات کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء کو سر آغا خاں کی زیرِ صدارت آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مسلم لیگ کے قائدِ اعظم گروپ کے ماسوا تمام مسلم جماعتوں نے شرکت کی اور اپنے مطالبات پیش کیے جن میں جداگانہ انتخاب، وفاقی طرزِ حکومت، صوبائی خود مختاری سرِ فہرست تھے۔

چودہ نکات: مسلم کانفرنس کی وجہ سے مسلمانوں میں اتحاد کی فضا ہموار ہو گئی۔ مارچ ۱۹۲۹ء میں ایک عرصے کے بعد مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی میں جناح گروپ اور شفیع گروپ دونوں شریک ہوئے۔ قائدِ اعظم نے مسلم رہنماؤں کے مشورے سے ایک ایسی قرارداد مرتب کی جس میں مسلم کانفرنس میں پیش کیے گئے مطالبات بھی شامل تھے۔ یہ قرارداد اس اجلاس میں منظور کی گئی۔ اس

قرارداد کو قائدِ اعظم کے چودہ نکات بھی کہا جاتا ہے۔ اب کانگریس کا مطالبہ یہ تھا کہ "نہرو رپورٹ"، کو من وعن قبول کر لیا جائے، اور دوسری طرف مسلمان اس کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کا مسئلہ مزید پیچیدہ ہو گیا۔

سائمن کمیشن۔ ۱۹۱۹ء کی دستوری اصلاحات کا جائزہ لینے کے لیے حکومت انگلستان نے ۳ فروری ۱۹۲۸ء کو سرجان سائمن **Sir John Simon** کی زیرِ قیادت ایک کمیشن ہندوستان بھیجا۔ کانگریس نے اس کا بائیکاٹ کیا۔ مسلم لیگ کے جناح گروپ نے بھی یہی رویہ اختیار کیا تاہم شفیع لیگ نے تعاون کا فیصلہ کیا۔ سائمن کمیشن نے جو رپورٹ مرتب کی وہ ابھی شائع نہیں ہوئی تھی کہ انگلستان میں لیبر پارٹی برسرِ اقتدار آ گئی۔ ریمزے میکڈانلڈ **Ramsay McDonald** انگلستان کے وزیرِ اعظم کے عہدے پر فائز ہوئے۔ قائدِ اعظم نے جون ۱۹۲۹ء میں انہیں ایک خط لکھا جس میں سائمن کمیشن پر عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے ہندوستانی سیاست دانوں کی کانفرنس کی تجویز پیش کی۔ ادھر ہندوستان کے وائسرائے لارڈ اردن **Lord Irwin** نے وزیرِ اعظم انگلستان اور دوسرے سیاسی رہنماؤں کے مشورے کے بعد ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو اعلان کیا کہ ہندوستان کے لیے برطانیہ کی پالیسی بتدریج حکومتِ خود اختیاری کا نفاذ ہے، اور حکومت ہندوستانی رہنماؤں سے بات چیت کے لیے جلد ہی لندن میں گول میز کانفرنس منعقد کرے گی۔ کانگریس اس اعلان سے مطمئن نہ ہوئی اور اعلان کیا کہ وہ اس وقت تک اس کانفرنس میں شرکت نہ کرے گی جب تک حکومت یہ اعلان نہیں کرے گی کہ اس کانفرنس کا مقصد ہندوستان کے لیے دستور تیار کرنا ہے جس کے تحت ہندوستان کو نوآبادی کا درجہ دے دیا جائے گا۔ وائسرائے ہند نے حکومتِ برطانیہ کی منظوری کے بغیر اس قسم کے وعدے سے معذوری کا اظہار کیا۔ اس پر برافروختہ ہو کر کانگریس نے ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کو سول نافرمانی کی تحریک چلانے کی منظوری دے دی۔ ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو کانگریس نے "یومِ آزادی" منایا۔ ۱۲ مارچ

۱۹۳۰ء کو گاندھی نے سول نافرمانی کا آغاز کر دیا۔ حکومت نے بڑے پیمانے پر گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ گاندھی اور نہرو وغیرہ بھی گرفتار کر لیے گئے چونکہ مسلمانوں نے اس تحریک میں حصہ نہیں لیا تھا اس لیے یہ تحریک جلد ہی ختم ہو گئی۔

پہلی گول میز کانفرنس۔ پہلی گول میز کانفرنس ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو لندن میں شروع ہوئی۔ اس میں کانگریس کے علاوہ تمام سیاسی جماعتوں نے شرکت کی۔ مسلمان نمائندوں میں قائداعظم بھی شامل تھے۔ البتہ علامہ اقبالؒ کو شرکت کی دعوت نہ دی گئی تھی۔ کانفرنس نے یہ طے کر لیا کہ ہندوستان میں وفاقی نظام رائج کیا جائے گا۔ اس کے بعد کام کو ذیلی کمیٹیوں کے سپرد کر دیا گیا۔ ان کمیٹیوں میں وفاقی امور اور اقلیتوں کے مسائل کی کمیٹیاں خاص اہمیت رکھتی تھیں۔ صوبوں اور مرکز میں اختیارات کی تقسیم، نیز ہندوستانی ریاستوں کی وفاق میں شمولیت کے مسائل، پر کوئی تصفیہ نہ ہو سکا۔ اس طرح جداگانہ انتخاب، مرکزی مجلسِ قانون ساز میں مسلمانوں کی ترجیحی نمائندگی اور پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی نشستوں کی اکثریت کے مطالبات پر اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ یہی کیفیت باقی ذیلی کمیٹیوں کی بھی رہی۔ ۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء کو یہ کانفرنس ختم ہوئی۔

خطبۂ الٰہ آباد۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس الٰہ آباد میں منعقد ہوا جس کی صدارت علامہ اقبالؒ نے کی۔ آپ نے اس اجلاس میں ایک عالمانہ خطبہ ارشاد فرمایا جو آپ کی سیاسی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ اس میں آپ نے ہندوستان کے سیاسی مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے "مسلم ہندوستان" کے قیام کی تجویز پیش کی اور واضح کیا کہ اسی صورت میں ہندوستانی مسلمان اپنی تہذیب و ثقافت کو آزادانہ طور پر اپنی آرزوؤں کے مطابق پروان چڑھانے اور برصغیر کے امن و ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

گاندھی اِروِن معاہدہ۔ حکومت نے کانفرنس میں کانگریس کی عدم

موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے کانگریس سے مصالحت کا فیصلہ کیا۔ کانگریس بھی اس طرف مائل تھی۔ بالآخر ۵ مارچ ۱۹۳۱ء کو گاندھی ارون معاہدہ Gandhi - Irwin Pact وجود میں آیا جس کی رُو سے حکومت نے گرفتار شدگان کو رہا کرنے اور مقدمات ختم کرنے کا اعلان کیا اور گاندھی نے گول میز کانفرنس میں کانگریس کی شرکت پر آمادگی کا اظہار کیا۔

دوسری گول میز کانفرنس۔ دوسری گول میز کانفرنس لندن میں ۷ ستمبر ۱۹۳۱ء کو شروع ہوئی اور یکم دسمبر ۱۹۳۱ء تک جاری رہی۔ اس میں کانگریس کی نمائندگی گاندھی نے کی۔ ادھر مسلم وفد میں علامہ اقبالؒ کو بھی شامل کر لیا گیا۔ علامہ اقبالؒ کا موقف بالکل واضح تھا۔ وہ مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارموں سے جداگانہ انتخاب اور وفاقی طرزِ حکومت وغیرہ کا مطالبہ پیش کر چکے تھے اور اپنے اس موقف پر قائم تھے۔ چونکہ مسلمان تمام غیر ہندو اقلیتوں کے لیے جداگانہ حقوق کے تحفظ کا مطالبہ کر رہے تھے اور دوسری اقلیتیں بھی اس مطالبے کی تائید کر رہی تھیں، اس لیے گاندھی نے کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا، اور یوں دوسری گول میز کانفرنس بھی ناکامی سے دوچار ہو گئی۔ کانفرنس سے فارغ ہو کر اقبالؒ نے اٹلی، مصر، فلسطین وغیرہ کا دورہ کیا۔

گول میز کانفرنس میں اہم ترین مسئلہ فرقہ وارانہ تعلقات کا تھا۔ چونکہ کانفرنس اس کو حل کرنے میں ناکام ہو چکی تھی، اس لیے وزیرِ اعظم انگلستان ریمزے میکڈانلڈ نے ۱۷ اگست ۱۹۳۲ء کو عبوری طور پر فرقہ وارانہ نمائندگی کے لیے مشہور فرقہ وارانہ فیصلہ Communal Award کا اعلان کیا جس کی رُو سے جداگانہ انتخاب کا اصول برقرار رکھا گیا۔ نیز مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کو ویٹیج Weightage کے تحت زیادہ نمائندگی دی گئی۔ اس طرح بنگال، آسام میں یورپی اقوام، پنجاب میں سکھوں اور سندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبہ میں ہندوؤں کو زیادہ نمائندگی دی گئی۔ مسلمان اگرچہ اس فیصلے سے مطمئن نہیں تھے

تاہم انہوں نے ملک کے مجموعی مفاد کے تحت اس کو قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دوسری طرف ہندوؤں نے اسے مسترد کر دیا کیونکہ اس میں اچھوتوں کو علیحدہ فرقہ مان لیا گیا تھا۔ گاندھی نے احتجاج کے طور پر مرن برت رکھ لیا جس کے نتیجے میں اچھوت جداگانہ انتخابات سے دست بردار ہو گئے اور ستمبر ۱۹۳۲ء میں فریقین کے مابین "پونا میثاق" Poona Pact عمل میں آیا جسے حکومت نے تسلیم کر لیا۔ اور گاندھی نے مرن برت ختم کر دیا۔

تیسری گول میز کانفرنس۔ تیسری گول میز کانفرنس، ۱۷ نومبر ۱۹۳۲ء سے ۲۴ دسمبر ۱۹۳۲ء تک جاری رہی۔ کانگریس نے اس میں شرکت نہیں کی کیونکہ وہ یو۔پی، بنگال اور سرحد میں تحریک سول نافرمانی میں مصروف تھی۔ اس میں قائدِ اعظم کو بھی مدعو نہیں کیا گیا۔ البتہ علامہ اقبالؒ کو اس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ عملی طور پر اس کانفرنس نے کوئی خاص کام سرانجام نہیں دیا۔ لہٰذا جلد ہی یہ کانفرنس ختم ہو گئی۔

تیسری گول میز کانفرنس میں علامہ اقبالؒ کو خوش دلی سے مدعو نہیں کیا گیا جیسا کہ عظیم حسین صاحب سر فضلِ حسین کے سوانح میں لکھتے ہیں:

"دوسرے سال سر فضلِ حسین نے ترغیب دی کہ ڈاکٹر اقبال کو پھر گول میز کانفرنس میں بھیجا جائے۔ اگلے سال کے تجربے کی بنا پر حکومت ڈاکٹر اقبال کو گول میز کانفرنس میں بھیجنے کے لیے سرد مہری کے ساتھ رضامند ہو گئی" [۱]

حکومت کی اس سرد مہری کا سبب علامہ اقبال کا وہ رویہ تھا جو آپ نے دوسری گول میز کانفرنس کے دوران اختیار کیا۔ نیز ۲۱-۲۲ مارچ ۱۹۳۲ء کے مسلم کانفرنس کے اجلاس میں آپ ہی کی زیرِ صدارت راست اقدام کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ اس لیے حکومت انہیں گول میز کانفرنس میں بلانا پسند نہیں کرتی تھی، تاہم انہیں نظر انداز بھی نہ کر سکتی تھی۔ اس لیے بہ امر مجبوری اس نے علامہ کو بھی

---

[۱] بحوالہ عبدالمالک آروی، "اقبال کی شاعری"، صفحہ ۳۱۲۔

شرکت کی دعوت دے ہی دی۔

اصولِ عمل۔ تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے علامہ اقبالؒ نے یورپ روانہ ہونے سے پہلے، ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو ایک اخباری بیان میں اس عزم کا اظہار کیا کہ مسلم وفد آل انڈیا مسلم کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ کی قرار دادوں کے مطابق مطالبات کی تکمیل کے لیے بھرپور کوشش کرے گا:

"لندن میں گول میز کانفرنس کا یہ اجلاس نہایت اہم ہوگا۔ فرقہ وار فیصلے نے راستے سے بہت سی مشکلات پہلے ہی دُور کر دی ہیں۔ اب ہمارا فرض ہوگا کہ باقی اہم مسائل کا مناسب حل دریافت کریں جو ابھی تک فیصلہ طلب ہیں۔ مَیں مسلمانانِ ہند اور اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلم وفد اپنی طاقت اسلام اور ہندوستان کی خدمت میں صرف کر دے گا۔ مَیں مسلمانوں سے بالخصوص دریافت کرتا (کہتا) ہوں کہ اس حکمتِ عملی پر سختی سے کاربند رہیں جو آل انڈیا مسلم کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ کی قرار دادوں میں درج ہے۔

"مَیں سمجھتا ہوں کہ مَیں اس سے بہتر اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ مسلمانوں کو قرآن کریم کے بیان کردہ اصولِ عمل یاد دلاؤں: 'جب تو نے ایک طریقِ عمل اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو فی الفور عمل شروع کر دے اور خدا پر بھروسہ رکھ۔'" [1]

مفاہمت کا طریقِ کار۔ اسی سلسلے میں آپ نے ایک مکتوب "ہمدم" لکھنؤ کے ڈائرکٹر کے نام ارسال کیا جس میں "ہمدم" کی تجویز پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے آپ نے واضح کیا کہ جب تک ہندو اپنی تجاویز پیش نہ کریں مصالحت و مفاہمت کی گفت و شنید بے فائدہ ہوگی۔ آپ نے فرقہ وارانہ فیصلے کی روشنی میں جداگانہ طریقِ انتخاب سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے پر بھی زور دیا۔ آپ نے فرمایا:

"ہمدم" نے مسلمانوں کو ہمیشہ بے لاگ مشورہ دیا ہے جس کے لیے تمام

---

[1] روزنامہ "انقلاب" لاہور، ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۲ء۔

ملک آپ کا شکر گزار ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مفاہمت کرانے کے لیے دوبارہ کوشش کرنے کی تجویز آپ ہی کی تھی۔ میں نے آپ کی خدمت میں عرض بھی کیا تھا کہ شاید ایسی مفاہمت کا موقع پونا کے سمجھوتے[۱] کے بعد آ جائے۔ میرے ذہن میں اس وقت یہ بات تھی کہ شاید اکثریت کوئی تجاویز مسلمانوں کے سامنے پیش کرے، مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔ پنڈت مدن موہن مالوی صاحب[۲] نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا جو دہلی میں اس سے پہلے مہاتما گاندھی نے اختیار کیا تھا۔ بہر حال آپ نے مسٹر محمد علی جناح کا تار پڑھ لیا ہوگا۔ وہ بھی اس بات سے متفق ہیں کہ مفاہمت کی تجاویز ہندوؤں کی طرف سے پیش ہونی چاہئیں، خواہ ان کی اساس مخلوط انتخابات کا اصول ہی کیوں نہ ہو۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ لکھنؤ کانفرنس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اپنے مطالبات میں، جن کا اعادہ کئی بار کر چکے ہیں، از خود ترمیم کر دیں اور بالخصوص اصولِ انتخاب میں موجودہ حالات میں ایسا کرنا انتہا درجہ کی سیاسی کمزوری کی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ ایسا کرنے سے مسلمانوں میں انتشار اور افتراق کا دروازہ کھل جائے گا، اور جو اتحادِ خیال انہوں نے بڑی مشکل سے حاصل کیا ہے ضائع ہو جائے گا۔

"اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ حکومت کے تصفیے میں اور کچھ ہو نہ ہو پنجاب کے اندر مسلمانوں کی اکثریت پانچ یاسات کی زیادتی کے ساتھ ہو جاتی ہے صوبہ سرحد

---

۱ فرقہ وارانہ فیصلے Communal Award کے ذریعے اچھوتوں کو جداگانہ انتخاب کا حق ملا تو گاندھی نے اس کے خلاف مرن برت رکھ لیا۔ ہندو رہنماؤں نے بالآخر اچھوت لیڈر ڈاکٹر امبیدکر کو مخلوط انتخاب پر رضامند کر لیا۔ اس رضامندی نے پونا میثاق Poona Pact کا نام پایا۔ علامہ اقبال اس میثاق کو اچھوتوں کے حق میں مضر خیال کرتے تھے۔

۲ معروف ہندو مہاسبھائی رہنما، وکیل، قانون ساز کونسل کے رکن، ہندو یونیورسٹی بنارس کے وائس چانسلر اور متعدد بار متعصب فرقہ پرست جماعت مہاسبھا کے صدر رہے۔ کئی مرتبہ کانگریس کے بھی صدر منتخب ہوئے۔

کو آئندہ نظام میں مساوات کا درجہ ملتا ہے۔ سندھ کی علیحدگی کے امکانات بھی قریب تر آ گئے ہیں اور ساتھ ہی اس کے جداگانہ انتخاب بھی قائم رہا ہے جو میری ناقص رائے میں مسلمانوں کے تمام مطالبات کی اساس ہے۔ جداگانہ انتخابات کو غیر مشروط طور پر قائم رکھ کر حکومت نے مسلمانوں کو موقع دیا ہے کہ وہ اپنا مستقبل آپ منتخب کر لیں۔ چاہیں تو اکثریت میں جذب ہو جائیں اور چاہیں تو کم از کم بعض حصص ملک میں اپنی جداگانہ ہستی کو برقرار رکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں۔ اگر آج مسلمانوں نے قبل از وقت جداگانہ انتخاب سے دست برداری کر لی تو آئندہ کا مؤرخ ان کے ہندوستان میں سیاسی اعتبار سے مٹ جانے کے لیے حکومتِ برطانیہ کو ہرگز مطعون نہ کرے گا، بلکہ خود مسلمانوں کو اس بات کا مجرم قرار دیگا کہ جمہوری نظام میں بحیثیتِ اقلیت انہوں نے اپنی بربادی اپنے ہاتھوں مول لی"۔

جداگانہ انتخاب کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

"تاسف کا مقام ہے کہ ہمارے بعض ہندو لیڈر، جن میں بعض علمائے دین بھی شامل ہیں، مسئلۂ انتخاب کو محض نمائندگی کا طریقہ کا تصور کرتے ہیں اور بس جہاں تک میں نے مسلمانانِ ہند کی گذشتہ تاریخ اور ایشیائی اقوام کے موجودہ امیال و عواطف اور مغربی اقوام کی سیاسی ریشہ دوانیوں پر غور کیا ہے جن کا اثر اس وقت مشرقی اقوام کے سیاسیات پر ہو رہا ہے، مجھے اس بات کا کامل یقین ہے کہ ابھی ایک عرصہ تک مسلمانانِ ہند کا مستقبل جداگانہ انتخاب سے وابستہ ہے۔ میرے نزدیک جداگانہ انتخاب قومیت کے مغربی تصور سے بھی (قومیت کا مغربی تخیل ایک روحانی بیماری ہے) متناقض نہیں اور اس کے باوجود ہندی اقوام میں اتحاد اور یک جہتی پیدا ہو سکتی ہے۔ خود یورپ میں بھی اس مقصد کا اب خاتمہ سمجھنا چاہیے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ مشرقی اقوام یورپ کا اترا ہوا لباس پہن لیں اور انہی مصائب سے دوچار ہوں جس سے یورپ دوچار ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔ خاص اس امر کے متعلق میں اپنے خیالات کا اظہار ذرا تفصیل کے

ساتھ عرض کرتا مگر کل شام یورپ جا رہا ہوں اور جانے سے پہلے ابھی بہت سے کام باقی ہیں۔ اس واسطے ان چند سطور پر کفایت کرتا ہوں۔ مختصراً یہ کہ مفاہمت کی تجاویز کا مسلمانوں کی طرف سے پیش کرانا، خصوصاً جب کہ مسلمانوں کے مطالبات ایک مدت سے سب کو معلوم ہیں، خلوص اور حب الوطنی کے نیک جذبات کا ثبوت نہیں، بلکہ ایک سیاسی حیلہ ہے جس کا مقصود یہ ہے کہ مسلمان کسی طرح اپنی مستقل ملی ہستی سے دست بردار ہو جائیں۔ ہندی اقوام کی مفاہمت کا وقت آئے گا اور ضرور آئے گا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اکثریت بھی، جس کا فرض ہے کہ اقلیتوں کا اعتماد حاصل کرے، اس کے لیے تیار نہیں، موجودہ حالات میں فرقہ وارانہ مسائل کی بحث کو از سر نو چھیڑنا نہ مسلمانوں کی خدمت ہے نہ ملک کی۔ زیادہ کیا عرض کروں۔"[1]

عزمِ یورپ۔ علامہ اقبال ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو لاہور سے بذریعہ ریل بمبئی روانہ ہوئے۔ سید امجد علی بھی آپ کے ہم سفر تھے۔ علامہ اقبالؒ نو مسلم مندوب کی حیثیت سے گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے جا رہے تھے اور سید امجد علی مسلم وفد کے سیکریٹری کی حیثیت سے سفر کر رہے تھے۔ علامہ اقبالؒ بمبئی پہنچے تو سٹیشن پر افغان قونسل جنرل نے ان کا خیر مقدم کیا اور انہیں اپنے ساتھ لے گئے۔ سید امجد علی نے اپنی رہائش کا الگ انتظام کیا۔[2]

بمبئی میں اپنے مختصر قیام کے دوران علامہ اقبالؒ نے عطیہ بیگم اور ان کے خاوند کے محل نما مکان میں کچھ وقت گزارا، جہاں عطیہ کے خاوند فیضی رحمین نے فن کے کچھ نادر نمونے اور اپنی تصاویر دکھائیں۔[3]

---

[1] "انقلاب"، لاہور، ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۲ء۔

[2] Speeches and Articles of Iqbal Day 1967، صفحہ ۲۱۔

[3] ایضاً۔

علامہ اقبال اور سید امجد علی ۱۷ اکتوبر کو "SS Conte Rosso" بحری جہاز کے ذریعے لندن روانہ ہوئے۔ یہ جہاز لائڈ ٹریسٹینو کمپنی Lloyd Triestino Line کا تھا۔ یہ جہاز جب عدن پہنچا تو آپ کو وجع المفاصل کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ اس لیے آپ اپنے کمرے میں آرام کرتے رہے۔

نوبل پرائز۔ سید امجد علی کہتے ہیں کہ:

"میں اس صورتِ حال پر بے حد رنجیدہ تھا کیونکہ اسی جہاز پر ایک نامور ہندوستانی طبیب سر سی۔ وی۔ رامن بھی سوار تھے جو یورپ جا رہے تھے۔ سر سی۔ وی۔ رامن دلچسپ اور خوبصورت گفتگو کرنے کا ملکہ رکھتے تھے۔ انہوں نے دورانِ گفتگو اپنے یورپ کے متعدد سفروں اور یورپ کے بلند پایہ ادبا و سائنسدانوں سے اپنی ملاقاتوں کا رنگین حال بیان کیا۔ سر رابندرناتھ ٹیگور کا ذکر آیا تو کہنے لگے:

"وہ رہتا مشرق میں ہے مگر اس کی شہرت مغرب میں پہنچ چکی ہے۔ میں نے علامہ سے اس کا تذکرہ کیا اور کہا کہ اگر علامہ بھی اس طرح یورپ کے سفر کرتے رہیں تو انہیں زیادہ شہرت حاصل ہو گی اور ٹیگور کی طرح وہ بھی بآسانی نوبل پرائز حاصل کر سکتے ہیں۔ علامہ اقبال نے یہ بات سنی تو مسکراتے ہوئے کہا:

"Tagore practises action and preaches rest, whereas Iqbal preaches action and practises rest".

یعنی ٹیگور خود تو حرکت و عمل میں رہتا ہے اور دوسروں کو سکون و راحت کی تلقین کرتا ہے، جبکہ اقبال دوسروں کو حرکت و عمل کی دعوت دیتا ہے اور خود سکون آشنا رہتا ہے۔"[1]

پیرس میں قیام۔ جب جہاز وینس پہنچا تو علامہ اقبال نے سید امجد علی سے فرمایا کہ یہاں سے لندن بذریعہ ریل چلیں گے اور راستے میں دو تین روز پیرس میں ٹھہریں گے۔ چنانچہ آپ وینس سے ریل کے ذریعے پیرس پہنچے۔ پیرس کے

---

[1] فقیر سید وحید الدین، "روزگارِ فقیر"، ۱/۱۴۸۔

سٹیشن پر آپ کو خوش آمدید کہنے کے لیے امراؤ سنگھ مجیٹھیا[1] موجود تھے۔ سردار موصوف نے دونوں مہمانوں کو ایک سادہ سے ہوٹل میں ٹھہرایا۔ علامہ نے پیرس میں قیام کے دوران سردار صاحب کی دو لڑکیوں سے بھی ملاقات کی جن میں سے ایک مشہور فن کار امرتا شیرگل تھی۔[2]

علامہ اقبالؒ نے پیرس پہنچتے ہی امراؤ سنگھ سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس دوران نپولین کی قبر پر جائیں گے، مشہور محقق میسی نوں Massignon سے ملاقات کریں گے جو اندلس میں مسلمانوں کے عہد پر تحقیق کے لیے مشہور تھے اور اگر ممکن ہوا تو فرانس کے شہرہ آفاق فلسفی پروفیسر برگساں Bergson سے بھی ملاقات کریں گے۔ علامہ کا خیال تھا کہ پروفیسر برگسان کا نظریۂ واقعیتِ زماں اسلامی تصور سے بہت قریب ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر وہ ان سے گفتگو کرنے کے خواہاں تھے۔

پروفیسر برگساں کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ ان دنوں پیرس سے باہر مضافات میں ایک گاؤں میں مقیم ہیں۔ علامہ اپنے طبعی تساہل کی بنا پر وہاں جانے پر آمادہ نہ ہوئے اور کانفرنس سے واپسی پر ملاقات کا پروگرام بنا لیا۔ کیونکہ اس وقت تک پروفیسر برگساں کی واپسی کا امکان تھا۔[3]

نپولین کے مزار پر: مشہور فرانسیسی سپہ سالار نپولین بونا پارٹ کی قبر پر جانے کے لیے وقت مقرر ہوا۔ سردار امراؤ سنگھ اور سید امجد علی آپ کے ہمراہ تھے۔ نپولین کے مقبرے کو ڈاکٹر صاحب نے دیکھا اور وہاں دس پندرہ منٹ رہے۔

---

[1] سر سندر سنگھ مجیٹھیا متحدہ ہندوستان کے مشہور اور نامور شخص تھے۔ امراؤ سنگھ انہی کے بھائی تھے، امراؤ سنگھ نے پیرس میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ انہوں نے ایک ہنگرین عورت سے شادی کر لی تھی جس کے بطن سے امرتا شیرگل پیدا ہوئی جس نے مصوری اور ادب کے میدان میں بڑا نام پایا۔

[2] Speeches and Articles صفحہ ۳۹۔

[3] ایضاً، صفحہ ۳۲۔

لیکن مقبرے سے باہر نکلے تو ان کے چہرے سے کسی خاص تاثر اور کیفیت کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ سید امجد علی کو یہ دیکھ کر حیرانی بھی ہوئی اور مایوسی بھی۔ انہیں توقع تھی کہ نپولین ایسے عظیم فرانسیسی سپہ سالار کے مقبرے کی زیارت سے علامہ اقبالؒ پر وہ کیفیت ضرور طاری ہو جائے گی جس کے نتیجے میں وہ شعر کہتے ہیں، لیکن جب انہوں نے علامہ کے چہرے پر اس کی کوئی علامت نہ دیکھی تو ان کا یہ شوق تشنۂ تکمیل رہ گیا۔[1] اس کے باوجود "نپولین کے مزار پر" کے زیرِ عنوان ان کی ایک نظم ہمیں ملتی ہے جس میں انہوں نے نپولین کو یوں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع
کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز
جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز
صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر
جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز
ہے مگر فرصتِ کردار نفس یا دو نفس
عوضِ یک دو نفس قبر کی شب ہائے دراز
"عاقبت منزلِ ما وادیٔ خاموشان است
حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز"[2]

☆

---

[1] فقیر سید وحید الدین، کتاب مذکور، ۱/۱۳۴-۱۳۵۔

[2] "بالِ جبریل"، صفحہ ۲۰۱-۲۰۲۔

میسی نوں سے ملاقات۔ فرانسیسی محقق میسی نون سے علامہ اقبال کی ملاقات ہوئی تو پروفیسر موصوف جس کمرے میں بیٹھے تھے اس میں ہر طرف کتابوں کے انبار تھے۔ علامہ اقبالؒ اور آپ کے رفقا بڑی مشکل سے اپنے بیٹھنے کے لیے جگہ بنا سکے۔ مؤلف روزگار فقیر نے نہ جانے کس بنا پر یہ لکھا ہے کہ میگ نون نے مسلمانوں کے سبب ان دنوں بڑی شہرت حاصل کی تھی (ص: ۱/۱۳۴) نیز یہ کہ میگ نون کے علمی ذوق اور وسعت معلومات کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس نے دوسری متعدد تصانیف کے علاوہ شیخ محی الدین ابن عربی صاحب خصوص الحکم (خصوص الحکم) کے نظریات پر ایک مبسوط و مستند کتاب لکھی۔ جس نے ان کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے (ص: ۱/۱۳۶) حقیقت یہ ہے کہ میسانوں نے یوسف بن منصور حلاج پر تحقیق کے حوالے سے شہرت حاصل کی تھی۔ علامہ اقبال نے کہا کہ مغرب کے مؤرخین کو اسلام سے جو تعصب اور عناد ہے امتدادِ زمانہ سے اس میں کمی آ رہی ہے اور اسلام کی صداقت ان پر واضح ہو رہی ہے۔ کیا آپ اس رائے سے متفق ہیں؟ فرانسیسی پروفیسر نے جواب دیا کہ یہ بات درست ہے کہ اب مغربی مؤرخین پہلے کی نسبت زیادہ غیر جانب دارانہ نقطۂ نظر سے اسلامی تحریکوں کا جائزہ لے رہے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی اعتراف کیا کہ یورپ پر مسلمانوں کے عظیم احسانات ہیں۔ انہوں نے تہذیبی اعتبار سے یورپ کو بیدار کیا اور تعلیم و معاشرت کے بہت سے شعبوں میں مغرب کی ترقی کیلئے نئے نئے مواقع بہم پہنچائے۔[1]

فرانسیسی پروفیسر نے اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا کہ ان کی تحقیقات کو بڑے پیمانے پر قبولیت حاصل ہو رہی ہے اور متعدد مستشرقین اندلس کے عربوں کے پرانے علمی کارناموں میں دلچسپی لے رہے ہیں۔[2]

فرانس میں قیام کے دوران اقبال نے ایک غزل بھی کہی جس کا مطلع یہ ہے:

---

[1] فقیر سید وحید الدین، کتاب مذکور، ۱/۱۳۵۔

[2] Speeches and Articles، صفحہ ۳۲۔

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام
وائے تمنائے خام! وائے تمنائے خام!

اس غزل کے دو شعر یہ ہیں:

پیرِ حرم نے کہا سن کے مری رُوئداد!
پختہ ہے تیری فغاں اب نہ اسے دل میں تھام

• • •

آہ کہ کھویا گیا تجھ سے فقیری کا راز
ورنہ ہے مالِ فقیر سلطنتِ روم و شام[۱]

لندن میں: ۔ علامہ اقبالؒ اور سید امجد علی ریل کے ذریعے پیرس سے روانہ ہوئے اور خلیج عبور کر کے لندن پہنچے تو ریلوے سٹیشن پر ایک نومسلم انگریز خالد شیلڈرک Khalid Sheldrake نے علامہ کا خیر مقدم کیا۔ خالد شیلڈرک نے اس موقعے پر علامہ کی خدمت میں مشہور برطانوی سیاست دان جان برائٹ John Bright کی تقریروں کا مجموعہ (مرتبہ جے۔ ای۔ ٹی۔ راجرس، مطبوعہ میکملن اینڈ کمپنی لندن، ۱۸۹۲ء) پیش کیا اور عرض کیا کہ آپ کو گول میز کانفرنس کے اہم سیاسی مباحث میں حصہ لینا ہے۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ ان تقریروں کو آپ وقت نکال کر ضرور پڑھ لیں۔ سید امجد علی کہتے ہیں:

"رات کے کھانے کے بعد علامہ نے اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا اور رات گئے تک اس میں محو رہے۔ علامہ اس کتاب کے مباحث میں اس قدر محو ہوئے کہ وہ بھول گئے کہ میں بھی کمرے میں موجود ہوں۔ للہذا میں ایک گھنٹے کے بعد انہیں مطالعہ کرتے ہوئے چھوڑ کر چلا گیا۔ اگلی صبح جب میں نے پوچھا کہ آیا وہ رات گئے تک پڑھتے رہے تھے تو انہوں نے فرمایا کہ انہوں نے تقریباً آدھی رات کو یہ کتاب ختم کی۔ اس کتاب کی تعریف کرتے ہوئے اقبال نے کہا کہ بہت کم کتابیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں

---

[۱] "بالِ جبریل"، صفحہ ۹۰-۹۱۔

شروع سے آخر تک پڑھنا پڑتا ہے اور پوری توجہ سے۔" ؎۱

جان برائٹ کی تجویز۔ گول میز کانفرنس کے مباحث میں شرکت کرتے ہوئے اقبالؒ نے جان برائٹ کی تقاریر سے خاصی مدد لی۔ اس انگریز کی فراست اور دور بینی کی داد دینی پڑتی ہے کیونکہ اس نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ایک سال بعد برطانوی حکومت کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ ہندوستان کو خالی کرنے سے پہلے اسے کم از کم پانچ خود مختار حصّوں میں تقسیم کرنے کا اہتمام کرے۔ جان برائٹ نے برطانوی دارالعوام میں ۲۴ جون ۱۸۵۸ء کو ہندوستان کے متعلق پبلک پالیسی کے موضوع پر جو تقریر کی تھی اس کا ایک اہم اقتباس یہ ہے:

"میری تجویز یہ ہے کہ ایک سلطنت ہند اور اس کے گورنر جنرل مقرر کرنے کی بجائے ہم نہ پہلی صورت اختیار کریں نہ دوسری (دونوں سے دست کش ہو جائیں)، بلکہ میں یہ تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں کہ ہم سلطنت قائم کرنے کی بجائے ہندوستان میں صوبے یا یونٹ قائم کریں۔ ۔ ۔ ۔

"میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں کم از کم پانچ صوبے یا احاطے قائم کیے جائیں اور ان کی حکومتیں مرتبے اور مالی ذرائع کے اعتبار سے بالکل مساوی ہوں۔ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ان یونٹوں کے دارالحکومت کلکتہ، مدراس، بمبئی، آگرہ اور لاہور ہوں۔ میری خواہش ہے کہ ہر یونٹ کا محکمہ مالیات، محکمہ وصولیٔ ٹیکس، محکمہ انصاف، پولیس، امورِ رفاہِ عامہ اور محکمہ فوج ایک دوسرے سے علیحدہ ہو۔ گویا ہر علاقہ ایک بالکل خود مختار سٹیٹ (ریاست) ہو جس کا ہندوستان کے دوسرے حصّوں (صوبوں) سے کوئی تعلق نہیں ہو بلکہ ہر یونٹ کو اس ملک (انگلستان) کا صرف ایک تابع Dependency تسلیم کیا جائے۔ اگر آئندہ کبھی انگلستان کو اپنے اقتدارِ اعلیٰ سے دست بردار ہونا پڑے تو ہم ایک ملک کی بجائے ان خود مختار یونٹوں سے دستبردار ہوں جن میں سے ہر علاقہ اپنی آزادی اور اپنی حکومت کو قائم رکھ سکے۔ ۔ ۔ ۔" ؎۲

؎۱ Speeches and Articles صفحہ ۳۲-۳۳-

؎۲ فقیر سید وحید الدین، کتاب مذکور، ۱۴۵/۱-

علامہ نے علیحدگیٔ سندھ کے متعلق ایک یادداشت ۲۲ نومبر ۱۹۳۲ء کو پارلیمنٹ کے جملہ اراکین کو ارسال کی۔ ؎۱

نیشنل لیگ کی تقریب۔ لندن میں مس فارقوہرسن ([redacted] نے ۱۹۱۴ء میں ایک تنظیم نیشنل لیگ کے نام سے قائم کی تھی۔ جس کا مقصد جنگ کے دوران برطانیہ کی مدد کرنا تھا۔ جنگ کے بعد اس کی توجہ اشتراکیت کی روک تھام پر مبذول ہوگئی۔ علاوہ ازیں دنیا بھر کے مسلمانوں کو برطانیہ سے قریب کرنا اور ان کے منصفانہ مطالبات کے لیے رائے عامہ ہموار کرنا بھی اس کے پیش نظر تھا۔ علامہ اقبالؒ شروع ہی سے اس لیگ کی کوششوں کے معترف تھے۔ نیشنل لیگ کی بانی مس فارقوہرسن نے گول میز کانفرنس کے موقعے پر علامہ اقبالؒ کی لندن میں موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۲۴ نومبر ۱۹۳۲ء کو ان کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا جس میں متعدد مقتدر برطانوی، گول میز کانفرنس کے ہندو اور مسلم مندوبین اور مولانا شوکت علی بھی شامل ہوئے۔

تعارف۔ مس فارقوہرسن نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے اقبالؒ کا تعارف ان لفظوں میں پیش کیا:

"علامہ اقبالؒ غیر معمولی صفات کے مالک ہیں۔ وہ اپنی شاعرانہ بصیرت سے مستقبل میں دور تک دیکھ سکتے ہیں، وہ ایک فلسفی کی دقتِ نظر اور عمیق فکر سے انسانی مسائل میں مضمر اصولوں اور ایک عملی آدمی کی قوتوں کو دریافت کرتے ہیں۔ اپنی انھی خصوصیات کی بنا پر وہ گول میز کانفرنس کی رکنیت سے سرفراز ہوئے۔

"یہ ایک خاص موقع ہے جس میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے اراکین، متعدد ممالک کے سفرا اور ہمارے بہت سے شرقی دوست یہاں جمع ہیں تاکہ ان کی عزت افزائی کرسکیں۔"

؎۱ عبدالمجید سالک "ذکرِ اقبال"، صفحہ ۱۸۰۔

اس تعارف کے بعد لارڈ لیمنگٹن **Lord Lamington** نے اقبال کی علمی کاوشوں اور شعری تخلیقات کی تعریف کی اور ان کی خدمات کو سراہا جو اقبال نے دنیا بھر کے انسانوں کی بیداری کے سلسلے میں سر انجام دیں۔ اس کے بعد انہوں نے رسمی طور پر علامہ اقبالؒ کو حاضرینِ اجلاس سے خطاب کرنے کی دعوت دی۔ علامہ اقبال نے ایک مختصر مگر جامع تقریر میں متفقہ آئین تیار کرنے کے لیے باہمی اعتماد اور خیر سگالی کی فضا برقرار رکھنے پر زور دیا۔ انہوں نے اس توقع کا اظہار بھی کیا کہ مسلمانوں کے جائز حقوق کی حفاظت کی ضمانت دی جائے گی۔

اقبال کی تقریر۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی تقریر میں فرمایا:

"ہم برطانوی حکومت کے تعاون سے ہندوستان کے لیے آئین بنانے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں۔ ہمیں ایک ایسا آئین تیار کرنا چاہیے جس کی ناکامی کا امکان نہ ہو۔ ہندوستان ایک وسیع و عریض ملک ہے جس میں مختلف نسلوں اور زبانوں کے لوگ ہزاروں صدیوں سے اکٹھے بس رہے ہیں۔

"یہ ضروری ہے کہ کانفرنس کے مقاصد کی صحیح طریق سے وضاحت کر دی جائے۔ تمام فرقوں کا آپس میں اور ملک (کے مفاد) کے ساتھ گہرا رابطہ ہو۔ باہمی اعتماد بے حد ضروری ہے۔ اعتماد کرنے سے ہی اتحاد حاصل ہوتا ہے۔ کانفرنس میں خیر سگالی کی فضا موجود ہے۔ مسلمان باہمت ہیں اور انہوں نے ہمیشہ برطانیہ سے وفاداری اور محبت کا اظہار کیا ہے۔ مجھے توقع ہے کہ مسلمانوں کے جائز مطالبات اور خواہشات کو آخری سمجھوتہ میں مکمل تحفظ دیا جائے گا۔"[1]

نیشنل لیگ کا اجلاس۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۳۲ء کو نیشنل لیگ نے کمیٹی روم نمبر ۱۰ میں ایک اجلاس منعقد کیا تاکہ مسلم وفد کے ارکان اور علامہ اقبالؒ سے برطانوی عوام و خواص ملاقات کا شرف حاصل کر سکیں۔ اس میں غیر ملکی سفیروں کے

---

[1] **Letters and Writings of Iqbal**، صفحہ ۶۹-۷۰۔

علاوہ دارالامرا اور دارالعوام کے ارکان نے بھی شرکت کی۔ اس میں اقبال نے ایک جامع تقریر میں مسلمانوں کے مطالبات کی توضیح کی اور کہا کہ مسلمانوں کا اہم ترین مسئلہ اپنی تہذیب و ثقافت کا تحفظ کرنا اور اپنی روایات کے مطابق شاہراہِ ترقی پہ گامزن ہونا ہے۔ لہٰذا برطانیہ کو چاہیے کہ وہ مسلمانوں کی اس فطری خواہش کا احترام کرتے ہوئے ان کے مطالبات تسلیم کر لے۔ علامہ اقبال نے فرمایا:

"مسلمانانِ ہند کے مطالبات میں ایک بے حد سادہ اصول کارفرما ہے جو برطانوی عوام کو یقیناً قبول ہوگا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند کی آبادی سات کروڑ ہے۔ اس آبادی کا نصف حصہ پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے جب کہ نصف سے زیادہ حصہ نسبتاً ایک جا اور خاص طور پہ ان صوبوں میں آباد ہے جو ہندوستان کے وسیع مغربی خطے پہ مشتمل ہیں۔ بنگال میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۵۰ فی صد، سندھ میں ۷۰ فی صد اور صوبہ سرحد میں تقریباً ۹۵ فی صد ہے۔"

علامہ اقبال نے مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کے نصب العین کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

"مسلمانانِ ہند کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ وہ ایک قوم کی حیثیت سے ممتاز تاریخی روایت اور ہم آہنگی کے مالک ہیں۔ اس اعتبار سے کوئی دوسری ہندوستانی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس بنا پہ وہ اپنی زندگی اپنے اسلوب پر گزارنا چاہتے ہیں اور اپنی ثقافت کو ترقی دینے کے خواہشمند ہیں۔ یہ ان کے مطالبات کا بنیادی اصول ہے۔ ان کے یہی مطالبات آل انڈیا مسلم کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ کی قراردادوں میں شامل کیے گئے ہیں۔

"جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ فرقہ وارانہ مسئلہ آپ کے لیے اور ہمارے لیے ہمیشہ تشویش کا باعث رہا ہے۔ گذشتہ دس سال کے دوران میں ہم نے اپنے ہم وطنوں سے مفاہمت کی انتہائی کوشش کی ہے لیکن ناکام ہوئے۔ آخر کار اس کا فیصلہ حکومتِ برطانیہ نے کر دیا۔ اگرچہ بعض معاملات کے بارے میں ہم نے آ...

شکایت کرنی ہے تاہم مسلمانوں کے اہم ترین حصے نے اس صورت حال سے نپٹنے اور اس کے نتائج کا انتظار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

"ہمارے دیگر مطالبات پر گول میز کانفرنس میں بحث ہو رہی ہے۔ ہم نے یہ مطالبات کانفرنس کو پیش کر دیئے ہیں اور ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہمیں ایسا کرنے کا موقع دیا ہے۔"

مسلم مطالبات کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

"ہم نے یہ مطالبات سر آغا خاں کی رہنمائی میں کانفرنس کے سامنے پیش کر دیئے ہیں۔ آغا خاں وہ محترم سیاست دان ہیں جن کے ہم سب مداح ہیں اور اہلِ بیت ہونے کی بنا پر مسلمانانِ ہند جن سے محبت کرتے ہیں۔

"میرا خیال ہے کہ اب آپ اس بنیادی اصول سے آگاہ ہو چکے ہوں گے جس کا تذکرہ میں کر چکا ہوں۔ یہ اصول اب ٹھوس مطالبات کی صورت اختیار کر چکا ہے، جن میں جداگانہ انتخابات کو اولیت حاصل ہے۔ اس کے بعد ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں ہمیں قطعی اکثریت دی جائے اور ہمارا قومی مطالبہ یہ ہے کہ فوری طور پر صوبائی خود مختاری بھی دی جائے۔ پھر ہم یہ بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ سندھ کو [بمبئی سے] علیحدہ کیا جائے، سرحد کو مساوی درجہ دیا جائے، نیز بلوچستان میں اصلاحات کا نفاذ کیا جائے۔ ہم مرکز میں ایوانِ بالا اور ایوانِ زیریں میں اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ۳۳ فی صد نمائندگی کا مطالبہ بھی کرتے ہیں۔

"اب میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ صرف مرکز میں ۳۳ فی صد نمائندگی، بلوچستان میں اصلاحات کے نفاذ اور صوبائی خود مختاری کے بارے میں چند لفظ کہوں گا، کیونکہ آپ کے اخبارات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ان مطالبات کے بارے میں بعض غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔

"اخبارات نے یہ تاثر دیا ہے کہ مسلمانانِ ہند نے ۳۳ فی صد نمائندگی کے

مطالبے میں کچھ ترمیم کر لی ہے۔ اس مسئلے کے بارے میں مسلمانانِ ہند کے احساسات جو کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی قرار دادوں میں بیان کیے گئے ہیں یہ ہیں کہ مسلمان اس کو دونوں ایوانوں میں اپنے حقوق کی کم از کم ضمانت تصور کرتے ہیں۔ یقیناً ہمیں معلوم ہے کہ اس راہ میں کچھ مشکلات ہیں اور ہمیں امید ہے کہ ہندوستانی ریاستیں جو آل انڈیا وفاق کا ایک حصہ ہیں یہ دیکھیں گی کہ کوئی ایسا سمجھوتہ کس طرح ہو سکتا ہے جس کی بنا پر ہم وہ کچھ حاصل کر سکیں جو ہم چاہتے ہیں۔ ہم ان کی مشکلات سے بخوبی واقف ہیں لیکن ان مشکلات کی وجہ سے ہم اپنے مطالبات میں ترمیم کرنے سے قاصر ہیں، ہمارا مطالبہ جو کہ مسلمانانِ ہند کی قرارداد میں بیان کیا گیا ہے یہ ہے کہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے مفادات کا تحفظ صرف دونوں ایوانوں میں ۳۳ فی صد نمائندگی سے ہی ممکن ہے۔

"بلوچستان میں اصلاحات کے بارے میں میری تجویز یہ ہے کہ برطانوی بلوچستان اور قلات ولس بیلہ کی ریاستوں کو ملا دیا جائے، ایک قسم کا بلوچستان کا وفاق بنا دیا جائے اور اس کو ہند وفاق کا حصہ بنا دیا جائے۔

"صوبائی خود مختاری کے متعلق یہ بتا دینا میرا فرض ہے کہ ہم اس مسئلہ کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ذاتی طور پر مجھے یقین ہے اور امید ہے کہ ہر ہندوستانی مسلمان اس سلسلے میں مجھ سے اتفاق کرے گا کہ برطانوی عوام اور اپنے ہم وطنوں کے سامنے ہم نے جو مطالبے کیے ہیں یہ ان میں روحِ رواں کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے ہم وطن اس سے متفق نہیں ہیں اور کچھ روز پیشتر کانفرنس کے دوران ایک سمجھوتہ بھی تجویز کیا گیا تھا لیکن میرے علم کے مطابق مسلمانانِ ہند اس نکتے پر بدستور مضبوطی سے قائم ہیں اور ہمارے سیاست دان اور اس مقصد کے لیے بنائی گئی ذیلی کمیٹی کے ارکان بھی اس سے منحرف نہ ہوئے اور مجوزہ مصالحت پر رضامند نہ ہوئے۔

"میں برطانوی عوام کے نمائندوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس بارے میں

ہم بے حد حساس ہیں اور یہ ہم مسلمانوں کے مطالبات کی جان ہے۔"

مسلمانوں کے بارے میں غیر محبِ وطن ہونے کے الزام کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

"یہ وہ چند اہم مطالبات ہیں جو میں نے گول میز کانفرنس کے سامنے پیش کیے ہیں۔ ان مطالبات کی بنا پر ہمارے ہم وطن کہتے ہیں کہ ہم پان اسلامسٹ ہیں، ہم کانی محبِ وطن نہیں ہیں اور ہم فرقہ پرست ہیں۔ میں آپ سے فرقہ واریت اور پان اسلامزم کے بارے میں کچھ کہوں گا۔ اگر کوئی شخص ایک تہذیبی گروہ سے تعلق رکھتا ہے اور اسے اپنی تہذیب کی حفاظت کے فریضے کا احساس ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ کیا ایسے شخص کو آپ غیر محبِ وطن سمجھیں گے؟ میرا خیال ہے کہ ہر برطانوی باشندے کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے ملک کی حفاظت کرے اگر اس کے ملک کو کوئی خطرہ لاحق ہو۔ اسی طرح ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنی تہذیب اور ایمان کی حفاظت کرے درآں حالیکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ ان چیزوں کا تحفظ معرضِ خطر میں ہے۔ بہر حال انسان کی تہذیب، ایمان اور روایت ہی تو ہیں جن کے لیے اسے زندہ رہنا یا جان قربان کرنا چاہیے۔"

ہندوستان کے سیاسی مسئلے کے حل کے لیے اپنی تجویز دُہراتے ہوئے آپ نے فرمایا:

"چار پانچ سال پیشتر میں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے [ہندوستان کے سیاسی مسئلے کا] ایک امکانی حل شمال مغربی ہندوستان میں ایک بڑی مسلم ریاست کے قیام کی صورت میں پیش کیا تھا۔ اگرچہ میری تجویز کو مسلمانانِ ہند کی قرارداد میں شامل نہیں کیا گیا لیکن میری ذاتی رائے اب بھی یہی ہے کہ یہی واحد حل ہے۔ جب تک تجربہ اس کی معقولیت یا نامعقولیت ثابت نہیں کرتا، میں انتظار کروں گا۔"

"اسلام نسل، ذات حتیٰ کہ جنس کی بھی تمیز روا نہیں رکھتا۔ یہ زمان و مکاں

سے ماوری ہے اور اس احساس کے تحت کہ تمام بنی نوع انسان ایک برادری ہے ہم ہندوستان میں آٹھ کروڑ ہیں اور ہم اپنی تہذیب اور تاریخی روایت کا تحفظ چاہتے ہیں۔"

آخر میں اقبال نے فرمایا:

"بنا بریں میں بڑے ادب سے عرض کروں گا کہ مسلمانانِ ہند نے آپ کے سامنے جو مطالبات پیش کیے ہیں ان پر ہمدردانہ غور کریں کیونکہ مضبوط ہندوستان ہی اس زمانے کے سب سے اہم سیاسی مسئلہ یعنی مشرق و مغرب کے باہمی تعاون کو ہمیشہ کے لیے حل کر سکتا ہے۔ ہندوستان مشرق و مغرب کے درمیان واقع ہے اور اگر برطانیہ کے تعاون سے مسلمانوں کو موقع ملے تو وہ ایشیا اور انگلستان کے عوام کی خدمت سرانجام دے سکتے ہیں۔"[1]

سر آغا خان (اور مسلم وفد کے ارکان نے بھی تقریریں کیں اور لارڈ ایپلسن، رکن پارلیمنٹ، نے اظہارِ تشکر کے ساتھ ہی پارلیمنٹ کی طرف سے مسلم مطالبات کی حمایت کا یقین دلایا۔[2]

اقبال کا موقف: علامہ اقبال بار بار اپنا موقف واضح کر چکے تھے۔ بظاہر آپ کا کانفرنس میں شریک ہونا یا نہ ہونا برابر تھا تاہم آپ ضروری سمجھتے تھے کہ کانفرنس کی رسمی بحث سے الگ رہ کر انگلستان کے مدبرین کو مسلم مطالبات کی معقولیت سے آگاہ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے کانفرنس میں شرکت کے باوجود اس کے مباحث میں زیادہ سرگرمی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ تاہم آپ کو اظہارِ خیال کا موقع ملا تو آپ نے سرے سے وفاق کے تصور ہی کی مخالفت کی اور یہ رائے ظاہر کی کہ ہندوستان میں کوئی مرکزی حکومت (خواہ وہ وفاقی ہی کیوں نہ ہو) قائم نہ کی جائے بلکہ ہر صوبے کو خود مختار اور آزاد نو آبادی کا درجہ دیا جائے اور اس کا تعلق ہندوستان

---

[1] ایضاً، صفحہ ۷۰-۷۶۔
[2] عبدالمجید سالک، کتاب مذکور، صفحہ ۱۸۰۔

کی مرکزی حکومت کی بجائے براہ راست لندن میں وزیر ہند سے ہو۔ [1]
برطانیہ کے بعض مقتدر اور بااثر سیاست دانوں کو علامہ اقبالؒ کو مسلم مطالبات خصوصی مسلم انڈیا کے قیام کی تجویز سے آگاہ کرنے میں جو کامیابی حاصل ہوئی اس طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال قائداعظم کے نام اپنے ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں:

"مجھے یاد ہے کہ انگلستان سے روانگی سے قبل لارڈ لوتھین Lord Lothian نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری سکیم ہی ہندوستان کی مشکلات کا واحد حل ہے لیکن اس کے بار آور ہونے کے لیے ابھی پچیس سال درکار ہیں۔" [2]

اس طرح وہ مقصد کسی حد تک حاصل ہوگیا جس کے لیے اقبالؒ نے اپنی عمر کے آخری دور میں اس قدر دور دراز کا سفر اختیار کیا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان کے سیاسی مسئلے کے حل کے لیے جو دستوری تجاویز تیار کی جائیں ان میں اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے جداگانہ حقوق کے تحفظ کی ضمانت ضرور دی جائے۔
ایک موقعے پر آپ نے اس مقصد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"میں ملک کی سیاسیات میں فرقہ وارانہ مناقشات میں حصہ لینے شامل نہ ہوا تھا بلکہ محض اس لیے کہ ہندوستان کے آئندہ نظام سیاسی میں مسلمانوں کو دوسری اقوامِ ہند میں مدغم نہ ہونا چاہیے۔ میں نے اس کے سوا گول میز کانفرنس کی کسی کارروائی میں حصہ نہیں لیا۔" [3]

حکومت نے علامہ اقبالؒ کو اینگلو انڈین تعلیم کی ذیلی کمیٹی کا رکن نامزد کیا، لیکن اس میں بھی اقبالؒ نے کوئی خاص حصہ نہیں لیا۔ سید نذیر نیازی کے نام

---

[1] ڈاکٹر امبیدکر، "پاکستان"، صفحہ ۳۲۹۔
[2] Letter of Iqbal to Jinnah، صفحہ ۲۱۔
[3] محمود نظامی، مرتب، "ملفوظاتِ اقبال"، صفحہ ۱۴۴۔

۳۱ مارچ ۱۹۳۳ء کے مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ ۶ اپریل ۱۹۳۳ء کو اس کمیٹی کا اجلاس وائسرائے کے ہاں منعقد ہونا تھا جس میں اقبال کو بھی شرکت کرنا تھی[1] لیکن اس کی مزید تفصیلات نہیں ملتیں۔ ویسے بھی اس کمیٹی کی کوئی اہمیت نہیں تھی کیونکہ اقبال کے نزدیک اصل مسئلہ ہندو مسلم مفاہمت کا تھا۔ وہ بجا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ جب تک یہ مسئلہ حل نہ ہو جائے دیگر مسائل پر توجہ دینا عبث ہے۔

مشرقی خواتین کی حیثیت۔ ۱۹۳۳ء میں علامہ اقبالؒ کا ایک مضمون "مغربی اور مشرقی خواتین کی حیثیت" کے زیرِ عنوان انگریزی اخبار "لور پوسٹ" میں شائع ہوا، جس میں آپ نے مشرقی خواتین کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کے ازالے کی کوشش کی تھی:

"میں اس مضمون پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں کہ مشرق میں عورت کی پوزیشن کیا ہے اور خواتینِ مغرب کے مقابلے میں ان کی حیثیت کیا ہے۔ لندن کے گلی کوچوں میں مجھے بے شمار ایسی باتیں نظر آ رہی ہیں جو اہلِ لندن کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ حقائق شناس نگاہیں ان امور و حقائق کو فوراً پہچان لیتی ہیں۔ جن لوگوں کو ایک طویل عرصے کی غیر حاضری کے بعد یہاں آنے کا اتفاق ہوا ہے ان کے نزدیک ان کی حیثیت مقابلتاً تعجب انگیز اور حیرت افزا ہے۔

میں اس بات پر حیران ہوں کہ صنفِ نازک کو مغرب میں جو خاص امتیاز حاصل تھا وہ بتدریج کم ہو رہا ہے۔ اب مرد اپنی نشستوں کو مستورات کی خاطر خالی نہیں کرتے اور اگر کبھی کرتے بھی ہیں تو بہت کم۔ موٹر کاروں سے اترتے وقت انہیں اس بات کا خیال نہیں آتا کہ مستورات پہلے اتریں اور مرد بعد میں۔ مردوں کا یہ طرزِ عمل میرے نزدیک قابلِ مذمت نہیں، اس لیے کہ یہ عورتوں کا خود پیدا کردہ ہے۔ انہیں کامل آزادی اور مردوں کے ساتھ مساوات کا جنون لاحق ہو گیا تھا۔

---

[1] "مکتوباتِ اقبال بنام سید نذیر نیازی" صفحہ ۱۰۹۔

اس لیے جو تبدیلی بھی رونما ہوئی ہے وہ حالاتِ گردوپیش کا لازمی نتیجہ ہے جس سے مفر کی کوئی صورت قطعاً نظر نہیں آتی۔

"اس مقام پر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی خواتین بالخصوص اسلامی صنفِ نازک کے اوضاع و اطوار اور ان کے ساتھ مردوں کے سلوک کی بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے جس پر وہ ایک زمانے میں بصد جاہ و جلال متمکن تھیں لیکن بمقابلہ اس کے مشرقی یا اسلامی خواتین کو سابقہ اعزاز و احترام بدستور حاصل ہے۔ یورپ آج بھی اس دھن میں مبتلا ہے کہ ترکی خواتین کو ترکی معاشرت میں کوئی تمیاز حاصل نہیں۔ دراصل مصیبت یہ ہے کہ وہ ہماری طرزِ بود و ماند سے ناآشنا ہیں اور انہوں نے پردے کی حقیقت کو آج تک نہیں سمجھا۔ پردے کا سبب یہ نہیں کہ مردوں کے اخلاق خراب ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت فاطر السمٰوات والارض کی مقدس ترین مخلوق ہے اور اس کا جنسی تقدس اس امر کا متقاضی ہے کہ اسے اجنبی نگاہوں سے بہر نوع محفوظ رکھا جائے۔ عربی زبان میں لفظ "حرم" کے معنی ہیں پاک اور مقدس سرزمین کہ جس کو اغیار و اجانب کی مداخلت سے ملوث نہیں کیا جاسکتا۔"

"پردے" کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

"پردے کے اور بھی اسباب و وجوہ ہیں، لیکن ان کا تعلق علم الحیات سے ہے۔ اس لیے اس موقعے پر مفصل بحث کی گنجائش نہیں۔ میں صرف یہ بتاؤں گا کہ اس رواج کی حقیقی بنیاد و اساس کیا ہے۔ دنیا میں عورت ایک بہت ہی عظیم ذریعۂ تخلیق ہے اور حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی تخلیقی قوتیں مستور و محجوب ہیں۔ مشرقی عورت کا اعزاز و احترام ہی پردے میں مضمر ہے۔ صدیوں سے اس دستور میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوا، بلکہ عورتوں کو آزادانہ اختلاط سے ہمیشہ منع کیا جاتا رہا ہے۔ قرآن پاک میں عورتوں کی علیحدگی کے لیے متعدد اصول بیان کیے گئے ہیں۔ پردہ بھی ان میں سے ایک ہے۔ ایک پابندی یہ بھی ہے کہ جب کبھی مردوں اور عورتوں کو

ایک دوسرے کے روبرو ہونے کا اتفاق ہو تو ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے سے قطعی احتراز کریں۔ اگر تمام دنیا اس پر کاربند ہو جائے تو پھر مروجہ حجاب کی ضرورت نہیں۔ ہندوستان اور بعض اسلامی ممالک کی بے شمار عورتیں برقع استعمال نہیں کرتیں۔ دراصل برقع دل کی ایک خاص کیفیت کا نام ہے اور اس کیفیتِ قلب کو تقویت دینے کے لیے بعض عملی مثالوں کی ضرورت ہے جو ہر ملک اور قوم کے انفرادی حالات پر موقوف ہے۔"

تعددِ ازدواج کے مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے اقبالؒ لکھتے ہیں:

"حرم کے خلاف بھی بے شمار اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ یہ واضح کر دینا نہایت ضروری ہے کہ حرم صرف ملوک و سلاطین کے لیے مخصوص ہے۔ جب میں عورتوں کا ذکر کرتا ہوں تو آپ لوگوں کو تعددِ ازدواج کا خیال ضرور آتا ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام نے تعددِ ازدواج کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ کھلم کھلا زناکاری کے انسداد کا ایک مؤثر علاج ہے۔ وحدتِ ازدواج ہمارا اور آپ کا مطمحِ نظر ہونا چاہیے لیکن مصیبت یہ ہے کہ اس طرح عورتوں کی اکثریت کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔

"قرونِ وسطیٰ میں یورپ نے وافر عورتوں کو جذب کرنے کی بعض خاص خانقاہیں اور عبادت گاہیں کھول دی تھیں لیکن یورپ میں آج اس عمل کا اعادہ بھی ناممکن ہو گیا ہے۔ نام نہاد صنعتی انقلاب نے مردوں اور عورتوں میں تعددِ ازدواج کی خلاف ورزی کے جذبات پیدا کر دئیے ہیں لیکن مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ معاشرتی مصائب بدستور موجود ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ صرف تعددِ ازدواج میں ہی جملہ امراضِ عالم کا مداوا ہے، بلکہ میں اس خیال سے لرزہ بر اندام ہو جاتا ہوں کہ عورتیں اپنے قوتِ لایموت کا خود بندوبست کریں۔ اس طرزِ عمل سے نسائیت کا جوہر تباہ و برباد ہو جائے گا۔

"بہر حال اسلام میں تعددِ ازدواج کا اصول کوئی استمراری اور دائمی اصول نہیں۔ فقۂ اسلام کے بموجب حکومتِ وقت ہی اس قانونی پابندی کو منسوخ

کر سکتی ہے جس سے معاشرتی خرابیاں پیدا ہونے کا احتمال ہو۔ فقۂ اسلام کی رُو سے طلاق کے بعد بھی عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے حقوق کی نگہداشت اور دیکھ بھال کرے۔ وہ اپنے نام پر تجارت، اجارہ اور قانونی چارہ جوئی کا ہر کام کر سکتی ہے۔

"انہی فقہائے اسلام کا یہ بھی فیصلہ ہے کہ اسے بحیثیت خلیفۂ اسلام بھی منتخب کیا جا سکتا ہے۔ مقررہ جہیز کے علاوہ خاوند پر نفقے کا مہیا کرنا بھی فرض ہے اور عورت اس حق کے حصول کی خاطر خاوند کی تمام جائداد پر قابض ہو سکتی ہے!

"اسلام میں طلاق بھی خالی از دلچسپی نہیں۔ مسلمان عورتوں کو طلاق کا حق بھی بعینہٖ اسی طرح حاصل ہے جس طرح خاوند کو ہے۔ اسلامی قانون کے مطابق اس حق کو حاصل کرنے کے لیے عورت بوقتِ نکاح اپنے باپ، بھائی یا کسی غیر شخص کو نامزد کر سکتی ہے۔ مذہبی اصطلاح میں اس کا نام تفویض ہے، یعنی انتقالِ اختیارات۔ آخر اس طرزِ حفاظت میں اس پیچیدگی کی ضرورت کیوں پڑی؟ میں اس کی توجیہ کو فقہائے یورپ کی فہم و فراست کے لیے چھوڑتا ہوں۔"[1]

چراغِ خانہ یا شمعِ محفل: قیامِ لندن کے دنوں میں ایک مرتبہ علامہ اقبالؒ سید امجد علی کے ہمراہ لندن کی مشہور دکان سیلف رجیس **Self Ridges** پر ضرورت کی کچھ چیزیں خریدنے کے لیے گئے اور سیلز گرل سے جرابیں دکھانے کو کہا۔ وہ لڑکی تیزی کے ساتھ سامان لینے کے لیے چلی گئی۔ جب واپس آئی تو ڈاکٹر صاحب پر استغراق کی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ وہ دُکان میں آنے کا مقصد تک بھول گئے۔ جب لڑکی جرابیں لے کر آئی تو ڈاکٹر صاحب نے اس سے پوچھا "تم یہاں کس لیے کھڑی ہو؟"، لڑکی یہ سُن کر آبدیدہ ہو گئی۔ علامہ اقبالؒ کو ہمدرد اور

---

[1] "آئینۂ اقبال"، صفحہ ۱۳-۱۴۔

غم خوار پاکر اس نے بتایا کہ اس کے والدین غریب ہیں۔ ان کی مدد کے لیے اسے نوکری کرنی پڑتی ہے۔ سید امجد علی نے پوچھا: "آپ نے اس لڑکی سے یہ سوال کیوں کیا؟" علامہؒ نے جواب دیا: "اس خاتون کو کسی گھر کی رونق بننا تھا، اولاد کی صحیح تربیت کا فرض انجام دینا تھا، اس کی تخلیق کا مقصد بازار کی رونق بن کر جرابیں فروخت کرنا تو نہیں تھا۔"[1]

واپسی کا ارادہ:۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۲ء کو آپ نے ایک خط کے ذریعے اپنے واپسی کے پروگرام سے مطلع کرتے ہوئے تحریر کیا:

"اس سے پہلے میں نے جو خطوط اپنے بمبئی پہنچنے کی تاریخ کے متعلق چودھری صاحب یا منشی طاہر دین یا کسی اور کو لکھے ہیں ان سب کو منسوخ تصوّر کیجیے۔ پہلے ارادہ یہی تھا مگر بعد میں دیکھا تو جہازوں کی روانگی کی موزوں تاریخیں نہ ملیں۔ اس واسطے اب میں ہسپانیہ، جرمنی اور آسٹریا ہوتا ہوا ۱۰ فروری ۱۹۳۳ء کو وینس سے بمبئی کے لیے جہاز لوں گا۔ اس جہاز کا نام "کالٹے وردی" ہے اور یہ بمبئی ۲۲ فروری کی صبح کو پہنچے گا۔"[2]

دوبارہ پیرس میں۔ علامہ اقبال لندن سے ۳۰ دسمبر ۱۹۳۲ء کو روانہ ہوئے اور پیرس میں فرانس کے مشہور فلسفی پروفیسر برگساں سے ملاقات کی۔ برگساں بہت بوڑھا ہو چکا تھا اور پھر اسے وجع المفاصل کی تکلیف بھی تھی۔ وہ دو پہیوں کی کرسی کے بغیر حرکت کرنے سے بھی قاصر تھا۔ نوکر اس کی کرسی کو اس کی خواہش کے مطابق ادھر اُدھر لے جاتے تھے۔ اس بناء پر اس نے لوگوں سے ملنا جلنا بند کر رکھا تھا۔ لیکن جب اسے اقبالؒ کے شوقِ ملاقات کا علم ہوا تو اس نے خاص طور پر ملاقات کیلیے وقت نکالا۔ یہ ملاقات خاصی طویل رہی۔ اس میں برگساں کے نظریۂ واقعیتِ زماں پر سیر حاصل بحث ہوئی۔ علامہؒ نے پروفیسر موصوف کو حضورؐ کی یہ حدیث سنائی: "زمانہ کو برا مت کہو (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے) میں خود زمانہ ہوں" تو برگساں حیران و ششدر رہ

---

[1] فقیر سید وحید الدین، کتاب مذکور، ۱/۱۳۷-۱۳۸۔

[2] بشیر احمد ڈار، مرتب "انوارِ اقبال"، صفحہ ۱۰۰-۱۰۱۔

گیا، اور بار بار علامہؒ سے دریافت کرتا رہا کہ کیا یہ قول درست ہے۔ اس ملاقات کے بارے میں اقبال نے سر ولیم روتھن سٹائن Sir William Rothenstein کے نام ایک مکتوب میں لکھا:

"پیرس میں برگساں سے میری ملاقات ہوئی اور فلسفیانہ مسائل پہ بے حد دلچسپ باتیں ہوئیں۔ برگساں نے کہا بارکلے کے فلسفہ کا حاصل یہ ہے۔ ادراک میں مادہ بہ تمام و کمال منکشف ہو جاتا ہے، لیکن ذہن میں ایسا نہیں ہوتا۔ یہ بارکلے کے فلسفیانہ افکار کی تشریح کا نہایت دلچسپ انداز ہے۔ ہماری گفتگو دو گھنٹے جاری رہی۔ برگساں بوڑھے ہو گئے ہیں اور بیمار بھی بہت ہیں۔ لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر رکھا ہے، لیکن میری ملاقات کے لیے انہوں نے از راہِ کرم خاص طور پہ وقت نکالا۔ بدقسمتی البتہ یہ ہوئی کہ جو صاحب برگساں کے ساتھ تھے اور ہماری باتیں قلم بند کر رہے تھے بعد میں اپنا لکھا ہوا خود بھی نہ پڑھ سکے۔"[۱]

لارڈ لوتھین کے نام، ۱ مارچ ۱۹۳۳ء کے خط میں اقبال اس ملاقات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"پیرس میں قیام کے دوران میں برگساں سے ملاقات ہوئی۔ جدید فلسفے اور تمدن Civilisation پر ہماری گفتگو تقریباً دو گھنٹے تک جاری رہی۔ کچھ وقت ہم نے برکلے پر تبادلۂ خیال کیا جس کے فلسفے پر بعض فرانسیسی فلاسفروں نے بعض نہایت دلچسپ مشاہدات پیش کیے۔"[۲]

برگساں سے ملاقات کے بارے میں سید نذیر نیازی نے ایک مرتبہ پوچھا:

"جب آپ نے برگساں سے ملاقات کی اور گفتگو ہوئی تو کیا اس کی کوئی یادداشت بھی لی گئی تھی؟" فرمایا "امراؤ سنگھ میرے ساتھ تھے۔ گفتگو بھی انہی کے توسط سے ہوتی

---

[۱] "اوراقِ گم گشتہ"، صفحہ ۱۴۵۔

[۲] رفیع الدین ہاشمی، مرتب، "خطوطِ اقبال"، صفحہ ۲۲۵-۲۲۶۔

رہی اور انہی نے اسے قلم بند بھی کیا، مگر اس برے طریق سے کہ بعد میں انہیں خود بھی اپنی تحریر کا پڑھنا مشکل ہو گیا۔" آپ نے مزید فرمایا: "اس گفتگو میں برکلے کے متعلق بھی خوب خوب باتیں ہوئیں۔ برکلے کی اہمیت موجودہ زمانے میں بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔" پھر فرمایا: "اس گفتگو کا ملخص مشہور فن کار ۔۔۔ کو بھیج دیا گیا تھا، معلوم نہیں وہ کہیں موجود بھی ہے یا ضائع ہو گیا۔" سید نذیر نیازی کے اس سوال پر کہ آپ نے برگساں سے اپنے نظریۂ زماں کا ذکر بھی کیا تھا، فرمایا "ہاں اس کا ذکر آیا تھا۔ اور برگساں کو بھی بڑا افسوس تھا کہ میں نے اسے کیوں ضائع کر دیا۔"[1]

سیاحتِ اندلس۔ سید امجد علی کہتے ہیں کہ "اقبال اور میں دونوں گول میز کانفرنس کے اختتام پر سپین جانا چاہتے تھے، لیکن بد قسمتی سے اقبال کی ناک میں ایک پھنسی نکل آئی جس کی وجہ سے وہ فوری طور پر سپین کے سفر پر روانہ نہ ہو سکے اور میں بھی ان کی معیت سے محروم رہا اور ان سے الگ ہو گیا۔ جب ان کی تکلیف ختم ہو گئی تو وہ سپین کی سیاحت پر روانہ ہو گئے۔"[2] اس سفر میں ان کی ترجمانی کے لیے ایک لڑکی سیکرٹری کی حیثیت سے ان کے ہمراہ تھی جسے غلطی سے اہلِ سپین نے ان کی بیٹی خیال کیا۔[3]

ہسپانیہ پہنچنے کے فوراً بعد اقبال نے بعض اہم شخصیتوں سے ملاقات کی۔ مولانا غلام رسول مہر کے نام اپنے مکتوب میں جو لاہور میں ۴ فروری ۱۹۳۳ء کو موصول ہوا۔ اقبال لکھتے ہیں:

"کل مع الخیر میڈرڈ پہنچے۔ یہاں سے قرطبہ اور غرناطہ وغیرہ جائیں گے۔ ۶ فروری تک وینس پہنچنا ہے۔ آج یہاں کے وزیرِ تعلیم سے ملاقات ہوئی اور

---

[1] سید نذیر نیازی "اقبال کے حضور"، صفحہ ۲۰۵-۲۰۶-

[2] Speeches and Articles، صفحہ ۳۳-

[3] Letters and Writings of Iqbal، صفحہ ۸۷-

پروفیسر آسن سے جنہوں نے دانتے کی ڈوائن کامیڈی اور اسلام پر کتاب لکھی ہے۔ صدر جمہوریہ سے غالباً ملاقات ہوگی ۔" [1]

میڈرڈ میں اقبال سے درخواست کی گئی کہ آپ اہل علم کی ایک مجلس میں خطبہ ارشاد فرمائیں۔ آپ نے جس مجلس میں خطبہ ارشاد فرمایا اس کی روداد سپینی اخبارات میں شائع ہوئی۔ روزنامہ El-Debate میں جو تفصیل شائع ہوئی وہ درج ذیل ہے:

"سر محمد اقبال ایک سیاح کی حیثیت سے اور عربوں سے دلچسپی رکھنے کیلئے ہسپانوی دانشوروں سے رابطہ قائم کرنے کے لیے سپین میں آئے ہیں۔ گذشتہ شام انہوں نے مانکلوا Moncloa میں فلسفہ وادب کی فیکلٹی کی نئی عمارت میں "اسلام کی فکری دنیا اور سپین" کے زیرِ عنوان ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔

مسٹر آسن پیلاشیئس Asin Palacios نے کہا کہ علامہ اقبال ایک نکتہ سنج فلسفی اور بلند پایہ شاعر ہیں۔ آپ ان منتخب ہستیوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے خوش قسمتی سے اسلامی سپین میں شاعری کے آسمانی فن اور مابعد الطبیعیات کے گہرے مطالعے کا ذوق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پروفیسر موصوف نے مزید کہا کہ علامہ اقبالؒ (ایک فلسفی اور شاعر ہی نہیں بلکہ ایک سیاست دان کی حیثیت سے) گاندھی اور دیگر قابلِ ذکر ہندو اور مسلمان رہنماؤں کے ساتھ گول میز کانفرنس کی اعلیٰ کونسل کی رکنیت کا اعزاز بھی رکھتے ہیں۔ [انہوں نے کہا] لیکن ہمارے مہمان [اقبال] گاندھی ایسے سیاست دانوں اور "مقدس" قوم پرست شخص سے مختلف ہیں۔ اقبال ایک دانشور ہیں۔ سیاست اور گول میز کانفرنس میں ان کی شرکت محض ایک اتفاقی امر ہے۔ گاندھی کے برخلاف انہوں نے یورپی طور طریقوں سے عدم مطابقت کا مظاہرہ نہیں کیا جب کہ گاندھی نے اپنا مخصوص لباس تبدیل کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کی تہذیبی نشوونما کیمبرج کی قانون کی یونیورسٹی میں ہوئی ہے، اس لیے وہ ایک نئے طرز کی جیکٹ کی حد تک یورپی لباس

---

[1] بشیر احمد ڈار، مرتب، کتاب مذکور، صفحہ ۱۰۳۔

پہنتے ہیں۔ ان کے نسلی امتیاز کی علامت صرف ان کی ٹوپی ہے۔

"اس سفر میں ان کے ساتھ ان کی صاحبزادی ہیں، دبلی پتلی۔ (اس لڑکی کا) چہرہ کسی یورپین کی طرح گورا چٹا ہے۔

"اپنے خطبے میں اقبالؒ نے واضح کیا کہ اسلامی سپین کے شعرا اور فلسفیوں نے مشرق کے دُور دراز حصوں میں بسنے والے مسلم دانشوروں کو بے حد متاثر کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ مشرق میں کس طرح (ان علماء) خصوصاً ابن خلدون، المسعودی اور الکندی کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ انہوں نے ان بے شمار تحقیقات کا بھی ذکر کیا جو اس سلسلے میں کی جا رہی ہیں۔

"مسٹر آسن نے اپنی تعارفی تقریر میں اقبالؒ کو ایک ایسا ماہر قانون قرار دیا جو اسلامی مشرق کی دور افتادہ حدود سے مسلمانوں کی روح کی صدائے بازگشت لے کر آئے ہیں جو رومانوی انداز میں ہمیں قرونِ وسطیٰ کے اندلس کی یاد دلاتی ہے۔ انہوں نے تاریخِ تصوف کے سلسلے میں اقبالؒ کی کتاب "فلسفۂ عجم" کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اس میں انہوں نے ایرانی صوفیا کے نظریات کا سراغ لگایا ہے جن کا تعلق مرسیہ کے ابن عربی سے ہے جو شوپن ہاور اور ہارٹمین کے نظریے کے مطابق لاشعور کے اصول کا پیش رو ہے۔ سر محمد اقبالؒ نے ابن عربی کی طرح اپنے فلسفیانہ نظریات کو اپنی عمدہ نظم "اسرارِ خودی" کے موزوں عنوان کے تحت شاعری کے مؤثر سانچوں میں ڈھالنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

"وہ ابن عربی کے بارے میں کی جانے والی تحقیقات کے حوالے سے کہتے ہیں کہ ہندوستان اور سپین جو کہ اسلامی دنیا کی دو انتہاؤں پر واقع ہیں تہذیب کے مؤرخین کے نزدیک اس مشترکہ خصوصیت کے مالک ہیں جس کی رو سے ان دونوں ملکوں کو تہذیبی امتزاج کی تجربہ گاہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں اسلامی تہذیب کو آریائی اور سامی عناصر سے واسطہ پڑا اور اندلس میں یونانی، رومی اور عیسائی عناصر سے دوچار ہونا پڑا۔ ہندوستان میں یہ تہذیب تا حال جاری ہے جب کہ

اندلس میں صرف تاریخی تحقیق کا موضوع ہے۔ اس کے باوجود ان دونوں دور افتادہ ممالک کی عظیم ہستیاں سائنس اور فنون کی کشش یکساں طور پر محسوس کرتی ہیں۔[۱]

علمائے اندلس سے خطاب۔ لارڈ لوتھین کے نام ۷ مارچ ۱۹۳۳ء کے مکتوب میں اقبال نے یورپ اور سپین کی سیاحت کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا:

"ہسپانیہ میں قیام کے دوران میں عربی کے بہت سے پروفیسروں سے میرا رابطہ قائم ہوا جو اسلام کے کلچر کے بارے میں بہت پُرجوش نظر آتے تھے۔ میڈرڈ یونیورسٹی نے Spain and the intellectual world of Islam کے موضوع پر مجھ سے یونیورسٹی میں خطاب کرنے کی درخواست کی۔ میرے خطاب کو بے حد سراہا گیا۔ صدارت پروفیسر آسن نے کی جو Islam and Divine Comedy کے معروف مصنف ہیں۔[۲]

"ہسپانیہ کی نئی حکومت غرناطہ کو دنیائے اسلام کے لیے ایک طرح کا تہذیبی مکہ بنانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ میرے خیال میں مناسب ترین وقت یہی ہے کہ انگلستان کو اسلام کے تہذیبی پہلو میں سنجیدگی کے ساتھ دلچسپی لینی چاہیے۔ درحقیقت ایک معاشی نظام کی حیثیت سے اسلام کہیں زیادہ دلچسپ ہے اور ہماری موجودہ مشکلات کے کہیں زیادہ عملی حل تجویز کرتا ہے۔"[۳]

مسجدِ قرطبہ کی زیارت:۔ اقبال نے قیامِ قرطبہ کے دوران مسجدِ قرطبہ کی زیارت بھی کی۔ فقیر سید وحید الدین لکھتے ہیں:

---

[۱] Letter of Iqbal to Jinnah، صفحہ ۷۷-۷۹۔

[۲] پروفیسر آسن کی کتاب کے انگریزی ترجمے اور تلخیص کا نام ہے Islam and Divine Comedy جو ۱۹۲۶ء میں لندن سے شائع ہوئی۔

[۳] رفیع الدین، مرتب، کتاب مذکور، صفحہ ۲۲۶۔

"حکیم الامت علامہ اقبالؒ تیسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد اسپین بھی گئے اور وہاں اسلامی دورِ اقتدار ختم ہونے کے تقریباً سات سو سال بعد انہوں نے مسجد قرطبہ میں پہلی بار اذان دی اور نماز پڑھی۔ مسلمانوں کی عظمت و شوکت کی حامل یہ مسجد اب گرجا بن چکی ہے۔"[1]

اسی واقعے کو عبدالمجید سالک یوں بیان کرتے ہیں:

"علامہ اقبالؒ نے بے اختیار چاہا کہ مسجدِ قرطبہ میں تحیۃ المسجد کے نفل ادا کریں۔ اس عمارت کے نگران سے پوچھا۔ اس نے کہا: مَیں بڑے پادری سے پوچھ آؤں۔ اِدھر وہ پوچھنے گیا اُدھر علامہ نے نیت باندھ لی اور اس کے واپس آنے سے پہلے ہی ادائے نماز سے فارغ ہو گئے۔"[2]

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس واقعے کے متعلق عام طور پر غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ فقیر سیّد وحید الدین کا کہنا ہے کہ اقبال نے (سکون سے) اذان بھی دی اور نماز بھی پڑھی، جب کہ سالک صاحب کا کہنا ہے کہ اقبال نے بڑے حیلے سے اور بعجلتِ تمام نماز ادا کی اور یہ بات علامہ اقبال کی فطرت اور مزاج سے بعید ہے اور خود احترامِ مسجد کے بھی منافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال اس سلسلے میں پہلے ہی ضروری انتظام کر چکے تھے۔ محمود الرحمٰن، امتیاز محمد خاں کے حوالے سے، رقم طراز ہیں:

"قیامِ لندن میں اقبال کا ارادہ ہُوا کہ سپین کے مسلم آثار الحمرا، مسجدِ قرطبہ وغیرہ کی زیارت کریں۔ یہ خیال آنا تھا کہ دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کسی نہ کسی طرح مسجدِ قرطبہ میں نماز ادا کرنے کا موقع بھی مِل جائے تو کیا کہنے۔ سپین کی عیسائی حکومت نے مسجد میں اذان اور نماز دونوں کی ممانعت کر رکھی تھی اور اس مسجد کو گرجا بنا دیا گیا تھا۔

---

[1] فقیر سیّد وحید الدین، کتاب مذکور، ۲/ ۲۱۱۔

[2] عبدالمجید سالک، کتاب مذکور، صفحہ ۱۸۲۔

علامہ اقبالؒ کا دل اس صورتِ حال پر خون کے آنسو رونے لگا کہ اقبال مسلمانوں کی عظیم الشان یادگار مسجد میں حاضری دے اور خدا کے حضور دو رکعت نماز بھی ادا نہ کر سکے۔ اسی اُدھیڑ بن میں اُن کے استاد ڈاکٹر آرنلڈ یاد آئے۔ وہ ان دنوں بہت ضعیف ہو چکے تھے اور لندن ہی میں مقیم تھے۔ اقبال سیدھے ان کے پاس گئے اور مدعا بیان کیا۔ پہلے تو موصوف کچھ سوچتے رہے، پھر انہوں نے کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے حکومتِ ہند کے ہوم سیکرٹری کو ایک خط لکھا اور اس سے درخواست کی کہ وہ حکومتِ اسپین کے ہوم سیکرٹری کو خط لکھ کر اس امر کی اجازت حاصل کرے کہ علامہ اقبال سفرِ قرطبہ کے دَوران مسجدِ قرطبہ میں باقاعدہ نماز ادا کر سکیں۔ پروفیسر آرنلڈ کی یہ کوشش بارآور ثابت ہوئی[1] اقبال کو اس شرط کے ساتھ اجازت مِل گئی کہ جب وہ مسجد کے اندر داخل ہو جائیں تو دروازہ بند کر دیا جائے اور اس پر قفل لگا دیا جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اقبالؒ حسبِ قرار داد مسجد میں داخل ہوئے تو آپ نے آواز کی پوری شدّت سے اذان دی۔ اقبالؒ کہتے ہیں: "میں اس جذبے، سرور اور کیف کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا جو اس وقت [illegible] تھا۔ سالہا سال کے بعد مسجد کے اندر پہلی مرتبہ "اللہ اکبر" کی آواز محراب [illegible] ٹکرا کر گونج رہی تھی؛ اذان سے فارغ ہو لینے کے بعد اقبال نے مصلّٰی بچھایا اور [illegible] ادا کرنے لگے دورانِ نماز ان پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ "مسجد میں گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔" اسی دَوران عالمِ رویا میں دیکھا کہ ایک بزرگ تشریف لائے ہیں اور مجھے مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں: "اقبال تم نے میری مثنوی کا بغور مطالعہ نہیں کیا۔ اسے مسلسل

---

[1] راوی کو اس ہستی کے نام کے سلسلے میں سہو ہوا ہے۔ دراصل ڈاکٹر آرنلڈ ۱۹۳۰ء میں انتقال فرما چکے تھے۔ اسلیے اقبال کی مدد کرنے والے صاحب ڈاکٹر آرنلڈ کی بجائے شاید کوئی دوسرے استاد ہونگے۔ لیکن متعین طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔

پڑھتے رہو اور میرا پیغام دوسروں تک پہنچاؤ"، اور جب اقبالؒ ہوش میں آئے تو دل کا سکون اور اطمینان حاصل ہو چکا تھا۔" [1]

علامہ اقبالؒ مسجد کی شان و شوکت سے اس قدر مرعوب اور متاثر ہوئے کہ آپ نے جب نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو یکایک اشعار کا نزول ہونے لگا حتیٰ کہ انہوں نے پوری دعا اشعار کی صورت میں مانگی اور وہی نظم بعد میں شائع بھی ہوئی۔ اس نظم کا مطلع یہ ہے:

ہے یہی میری نماز ہے یہی میرا وضو
میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو! [2]

اس نظم کا ایک شعر ہے:

چشمِ کرم ساقیا دیر سے ہیں منتظر
جلوتیوں کے سبو خلوتیوں کے کدو! [3]

مسجدِ قرطبہ کا تعارف۔ مسجدِ قرطبہ مسلمانوں کے فنِ تعمیر کا عظیم شاہکار ہے اور اقبال کی نظم "مسجدِ قرطبہ" ان کی شاعری کا عظیم ترین نمونہ۔ اس مسجد کا سنگِ بنیاد امیر عبدالرحمٰن الداخل نے ۷۸۶ء میں رکھا اور اس کی تعمیر پر اَسّی ہزار دینار صرف کیے۔ بعد ازاں عبدالرحمٰن الداخل کے جانشین اور فرزند ہشام اوّل نے ۷۹۳ء میں اس کی تکمیل و توسیع کی۔ بنی امیہ کے دوسرے حکمرانوں نے بھی اس کی توسیع کا کام جاری رکھا۔ اس طرح یہ مسجد اندلس میں مسلمانوں کی عظمت کا بہترین نشان بن گئی۔ اس سے ملحق یونیورسٹی پورے یورپ میں علم و فن کی اشاعت میں بیش بہا کارنامے انجام دئیے۔ علامہ اقبالؒ مسجد کی عظمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] "اوراقِ گم گشتہ"، صفحہ ۳۳۲-۳۳۴۔
[2] "بالِ جبریل"، صفحہ ۱۲۳۔
[3] ایضاً، صفحہ ۱۲۴۔

اے حرم قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

• • •

تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل
تیری بنا پائدار، تیرے ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل
تیرے در و بام پر وادیٔ ایمن کا نور
تیرا منارِ بلند جلوہ گہِ جبرئیل

• • •

کعبۂ اربابِ فن! سطوتِ دینِ مبیں
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
ہے تہِ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں![1]

اندلس کے حکمرانوں کے جمالیاتی اور تعمیراتی ذوق کی آئینہ دار اس مسجد کا نقشہ ایک مستطیل کا ہے جس کا طول ۵۰۷ فٹ اور عرض ۴۲۵ فٹ ہے۔ اس رقبے کا دو تہائی حصہ تو قبلہ کے دالانوں میں اور ایک تہائی حصہ صحن اور صحن کے تین طرف دالانوں اور میناروں میں سمجھنا چاہیے۔

مسجد کے اکیس مداخل تھے، دیوارِ قبلہ کو چھوڑ کر جس میں صرف ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جس سے حاکمِ اندلس مسجد میں آتا تھا۔ اس کے لیے ایک مقصورہ بنا دیا گیا تھا، جس کا فرش چاندی کا تھا، ستون لاجورد کے اور ان پر نہایت خوبصورت بیلیں بنی ہوئی تھیں۔ دروازہ خالص سونے کا تھا۔ سکاٹ رقم طراز ہے:

---

[1] ایضاً، صفحہ ۱۲۹-۱۳۳۔

"خوش نما لوحیں، محراب اور گنبد، وہ کتبے جو بیلیوں خوش آئند رنگوں سے مزین ہیں، خوبصورت پچی کاری کے پھول، مجلا اور مصفا، زخفۃ العرب جس کو فی نفسہٖ قیام و دوام حاصل ہے۔ غرض ہر چیز آج نو سو برس بعد بھی جگمگا رہی ہے۔ اگر قرطبہ کی مسجد کا مقابلہ اسی قسم کے مشہور کام سے کیا جائے جو قسطنطنیہ کے گرجاؤں اور مسجدوں اور وینس اور راونیا کے بڑے گرجاؤں میں ہوا ہے تو قرطبہ کی مسجد کے مقابلے میں یہ سب ہیچ معلوم ہوتے ہیں۔"

مسجدِ قرطبہ کی محراب کی مثال نہ ممالکِ اسلامی میں ملتی ہے نہ کسی اور مقام پر۔ اس کے نقشے نیز دیگر جزئیات کی کہیں بھی نقل نہ ہو سکی۔

مسجد کے دروازوں میں روشن کیے جانے والے جھاڑ کو چھوڑ کر مسجد میں ۲۸۰ پیتل کے جھاڑ روشن کیے جاتے تھے جن میں ۱۰۸۰۵ چراغ جلتے تھے۔ المنصور کے عہد میں تیل کا سالانہ خرچ ۱۳۲۴ من تھا۔ جھاڑوں میں سے تین چاندی کے تھے جن میں نو نو سیر تیل رات بھر میں جل جاتا تھا۔ سب سے بڑا جھاڑ محراب کے کمرے میں، جہاں اونچی رحل پر کلام مجید رکھا رہتا تھا، گنبد میں لٹکا ہوا روشن کیا جاتا تھا۔ اس میں ۱۴۵۴ چراغ جلتے تھے۔ اس کا دور ساڑھے بارہ گز کے قریب تھا اور تمام جھاڑ پر سونے کا ملمع تھا۔ موم بتیاں بھی روشن کی جاتی تھیں ساڑھے تین من موم اور ساڑھے چونتیس سیر سوت موم بتیاں بنانے میں سال بھر میں صرف ہوتا تھا۔ سب سے بڑی مومی شمع جو امام کے قریب محراب میں روشن کی جاتی تھی اس کا وزن پچیس سیر سے تیس سیر تک ہوتا تھا۔ یہ رمضان شریف کے پورے مہینے میں رات دن روشن رہتی تھی اور اس طرح بنائی جاتی تھی کہ عید والی چاند رات کو ختم ہو جائے۔

اقبال نے اپنے اشعار میں ستونوں کی کثرت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اکثر مؤرخین کے بیان کے مطابق ان کی تعداد ۱۴۱۷ ہے۔ صحن مسجد میں قبلہ رُو کھڑے ہو کر دیکھیے تو سامنے اٹھارہ اٹھارہ ستونوں اور انیس انیس دہن کے

انتیس دالان دردالان قبلہ کی دیوار تک نظر آتے ہیں۔ ہر ستون پر ایک اور ستون تھا جس سے ستونوں کی ایک دوسری صف پہلی صف پر قائم ہوتی تھی۔ ستونوں کی اس دوسری صف پر بھی ایک صف محرابوں کی تھی۔ ہر کہیں محرابوں کی پہلی اور دوسری صفوں میں ایک تیسری صف محرابوں کی قائم کر کے نہایت خوبصورت چھت بنائی تھی جس کی اونچائی فرشِ مسجد سے پینتیس فٹ تھی۔ محرابوں کو بھرا نہ تھا بلکہ ان کے بیچ کی جگہ خالی چھوڑی گئی تھی۔ اس لیے جس رخ سے دیکھیے تاحدِ نظر ستونوں کی صفوں پر محرابوں کا ایک لاتناہی جال نظر آتا تھا۔ تمام ستون سنگِ مرمر، سنگِ سماق اور زبرجد کے تھے۔ کہیں کہیں سونے اور چاندی کے جڑاؤ ستون بھی تھے۔ سنگِ مرمر کا کوئی رنگ سپید، نیلگوں، سرخ، سیاہ، سبز، مبگوں، رنگ برنگ کی ابریوں اور چتیوں والا ایسا نہ تھا جس کے ستون اس مسجد میں نہ لگائے گئے ہوں۔

حتیٰ Hitti مسجدِ قرطبہ کو مغرب کا کعبہ قرار دیتے ہوئے اس کے ستونوں کو Forest of Stately Columns سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھتا ہے:

Twelve Hundred and Ninety Three Columns,

a veritable forest supported its roof

مسجدِ قرطبہ اندلس میں صدیوں کی شاندار اسلامی حکومت کی یادگار کو ۱۲۳۶ء میں گرجے میں تبدیل کر دیا گیا۔ اسی لیے اقبال کہتے ہیں:

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں
آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

علامہ اقبالؒ پہلے مسلمان تھے جنہوں نے مسجدِ قرطبہ کے گرجے میں تبدیل کیے جانے کے کئی سو سال بعد ۱۹۳۳ء میں پہلی بار اس میں اذان دے کر دو رکعت نماز ادا کی۔[1]

---

[1] "صحیفہ"، اقبال نمبر (۱)، صفحہ ۳۲۰-۳۲۳-

قرطبہ اور مسجدِ قرطبہ دیکھنے کے بعد اقبالؒ نے مدیر "انقلاب" لاہور، مولانا غلام رسول مہر کے نام ایک مکتوب میں محض یہ فرمایا:

"مرنے سے پہلے قرطبہ ضرور دیکھو"۔ [۱]

علامہ اقبالؒ نے اپنے فرزند جاوید اقبال کے نام دو تصویری کارڈ بھیجے جن پر مسجدِ قرطبہ کے دو عکس چھپے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی لکھا کہ "مَیں خدا کا شکر گذار ہوں کہ مَیں اس مسجد کے دیکھنے کے لیے زندہ رہا۔ یہ مسجد تمام دنیا کی مساجد سے بہتر ہے۔ خدا کرے تم جوان ہو کر اس عمارت کے انوار سے اپنی آنکھیں روشن کرو"۔ [۲]

مسلم طرزِ تعمیر پر تبصرہ۔ پروفیسر حمید احمد خان روایت کرتے ہیں کہ اسپین سے واپسی کے بعد علامہ اقبالؒ نے ایک ملاقات میں اسلامی فنِ تعمیر کی قوت و ہیبت کا ذکر کرتے ہوئے مسجدِ قرطبہ کے حوالے سے فرمایا:
"اندلس کی بعض عمارتوں میں بھی اسلامی فنِ تعمیر کی اس خاص کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے لیکن جوں جوں قومی زندگی کے قویٰ اشل ہوتے گئے تعمیرات کے اسلامی انداز میں ضعف آتا گیا۔ وہاں کی تین عمارتوں میں مجھے ایک خاص فرق نظر آیا۔ قصرِ زہرا دیوؤں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے، مسجدِ قرطبہ مہذب دیوؤں کا مگر الحمرا محض مہذب انسانوں کا"۔ پھر ایک تبسم کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا: "میں الحمرا کے ایوانوں میں جا بجا گھومتا پھرا مگر جدھر نظر اٹھتی، دیوار پر "ہو الغالب" لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ مَیں نے دل میں کہا یہاں تو ہر طرف خدا غالب ہے، کہیں انسان نظر آئے تو بات بھی ہو"۔ [۳]

---

[۱] "انقلاب"، لاہور، ۶ فروری ۱۹۳۳ء۔

[۲] ایضاً، ۹ فروری ۱۹۳۲ء۔

[۳] حمید احمد خان، "نقشِ ناتمام۔ اقبال کی شخصیت اور شاعری"، صفحہ ۶۱-۶۲۔

مراجعتِ وطن ۔ ۲۶ جنوری ۱۹۳۳ء کو سیاحتِ سپین سے واپس تشریف لائے۔ یکم فروری ۱۹۳۳ کو مولانا غلام رسول مہر کے نام مکتوب میں اقبالؔ نے اطلاع دی:

"۲۶ جنوری کو ہسپانیہ کے سفر سے واپس آیا۔ اب ۱۰ فروری کو وینس سے اطالوی جہاز "کانٹے وردی" پر سوار ہو کر ۲۲ کی صبح کو انشاء اللہ العزیز بمبئی پہنچ جاؤں گا۔"[1]

۱۰ فروری کو وینس سے ایک اطالوی جہاز "کانٹے وردی" پر سوار ہو کر ہندوستان روانہ ہوئے۔ ۲۲ فروری ۱۹۳۳ء کو آپ بمبئی پہنچے تو بمبئی کے اخبار "خلافت" کے نامہ نگار نے آپ سے سپین کے بارے میں چند سوالات کیے۔ ان کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے فرمایا:

"مجھے لندن میں اسپین جا کر ایکچر دینے کی دعوت ملی تھی۔ اسلام کے اس مرکز کو دیکھنے کا مجھے پہلے ہی شوق تھا۔ اس لیے مَیں نے دعوت قبول کر لی۔ مجھے وہاں پہنچنے سے پہلے تقریر کے موضوع کا کوئی علم نہ تھا، البتہ خواہش یہ تھی کہ ایسا مضمون ہو جس پر تقریر کرتے ہوئے میں اسلامی ثقافت و تمدن اور اسلامی فلسفہ پر کچھ کہہ سکوں۔ وہاں پہنچنے پر پروفیسر آسن کو انتخابِ مضمون کا اختیار دے دیا۔ اتفاق سے انہوں نے وہی مضمون تجویز کیا جس کا مَیں خود خواہش مند تھا، یعنی "سپین اور فلسفۂ اسلام"۔ میرا لیکچر میڈرڈ کی جدید یونیورسٹی میں ایک گھنٹہ جاری رہا، جس میں مَیں نے اسپین کے مسلمانوں کے تمدن، فلسفہ اور ان کی تہذیب و روحانیت کے مختلف پہلوؤں کی تشریح و تفسیر بیان کرتے ہوئے حاضرین سے اپیل کی کہ سنی سنائی باتوں پر یقین نہ کریں، نہ عیسائیوں کے غلط پروپیگنڈے سے متاثر ہوں، بلکہ عربوں کی تاریخ کا مطالعہ کریں۔

---

[1] بشیر احمد ڈار، مرتب، کتاب مذکور، صفحہ ۱۰۳۔

"مَیں نے موقع کو غنیمت سمجھ کر ملک کے متعدد مشہور تاریخی مقامات و آثار کا بہ نظرِ غائر معائنہ کیا۔ مَیں اپنے تاثرات کا اظہار الفاظ میں نہیں کر سکتا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ جس طرح یہودیوں کے لیے ارضِ موعودہ فلسطین ہے، اسی طرح عربوں کے لیے غالباً اسپین کی سرزمین موعودہ ہے۔ اس قدر خوبصورت، اس درجہ پُر فضا اور ایسا آرام دِہ ملک۔

"پروفیسر آسن عربی زبان کے پروفیسر اور بہت ہی خوش خلق و ملنسار آدمی ہیں۔ ان کا ایک شاگرد قرطبہ کی قدیم یونیورسٹی کا پرنسپل ہے۔ اس یونیورسٹی میں عربی تعلیم پر بہت زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔"

ایک سوال کے جواب میں اقبال نے فرمایا:

"اس وقت تو وہاں کوئی مسلمان نہیں۔ لیکن تعلیم یافتہ طبقہ اب عربی النسل ہونے پر فخر کا اظہار کرنے لگا ہے اور ہر اچھی چیز کو "مورش" کہہ دیتا ہے (یعنی اسلامی)۔ ان میں اسلام کی طرف سے بغض و عناد کم ہوتا جا رہا ہے اور وہ اسلامی تہذیب و تمدن اور فلسفۂ مذہب کا مطالعہ بڑے ذوق سے کرتے ہیں۔ اسپین میں اکثریت رومن کیتھولک کی ہے لیکن مذہب روز بروز کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ گرجے آباد تو ہیں مگر ان میں غریب طبقہ جاتا ہے۔ یہی حالت تقریباً ہر یورپین ملک کی ہے۔"

عربوں کی عمارتوں کے متعلق علامہ نے فرمایا:

"جن مسجدوں کو گرجاؤں میں تبدیل کر دیا گیا تھا وہ اب تک مسجدوں کی شکل میں نہیں آئیں۔ البتہ چند مسجدیں واگذاشت ہو گئی ہیں اور باقی کے متعلق امید ہے کہ تعصب و عناد کی کمی ہونے پر واگذاشت ہو جائیں گی۔ محکمۂ آثارِ قدیمہ نے عربوں کی عمارتیں کئی جگہ کھود کر نکالی ہیں۔ کارڈوا (قرطبہ) میں کھدائی کا کام جاری ہے۔ خلفاء کے زمانے کی چند عمارتیں نکل آئی ہیں۔ ان کے بعض حصوں میں ٹوٹی ہوئی تصویریں بھی نظر آتی ہیں۔"

ایک سوال کے جواب میں علامہ نے فرمایا:

"عربوں کا تمدن اسپین سے بالکل فنا نہیں ہوا ہے۔ چنانچہ شہر طلیطلہ عربی تمدن کی زندہ مثال ہے۔ قدرتی مناظر و حسن کے علاوہ یہاں کی معاشرت بھی آرام دہ اور دلکش ہے۔ وہاں پہنچ کر میں نے محسوس ہی نہیں کیا کہ اجنبی ملک میں ہوں۔ یہاں کے بازار، مکانات بالکل مشرقی نمونہ کے ہیں اور غذا بھی وہی ہے جو ہم لوگوں کو مرغوب ہے۔ چنانچہ پلاؤ کا مجھے وہی مزہ آیا جو لاہور میں آتا ہے۔ لوگ خلیق اور ملنسار ہیں۔ ان کے رہنے سہنے کا طریقہ بھی مشرقی ہے۔ یہاں ایک چھوٹی سی بالکل سادہ وضع کی مسجد ہے جو اپنی ابتدائی حالت میں اب تک قائم ہے۔ غالباً کسی مسلمان سپاہی نے فتحِ طلیطلہ کے بعد اسے بنوایا تھا۔ موجودہ حکومت نے اسے آثارِ قدیمہ میں لے کر محفوظ کر دیا ہے۔ اسپین کی زبان میں اب تک عربی الفاظ بہت زیادہ استعمال ہوتے ہیں "ال" تو اکثر الفاظ میں ملا ہوتا ہے۔"

موجودہ حکومت کے متعلق ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

"جمہوریت سے تمام لوگ خوش ہیں۔ معدودے چند ہوں گے جو شہنشاہیت پسند ہیں۔ موجودہ حکومت کوشش کر رہی ہے کہ قدرتی وسائل اور انعام و اکرام سے استفادہ کرے۔ چنانچہ کان کنی اور معدنیات کے متعلق اب تک جو معلومات بہم ہو سکی ہیں وہ سب وہی ہیں جن کی تحقیقات عربوں نے کی تھی۔ ان کاوشوں کا نفع موجودہ نسل اٹھانا چاہتی ہے۔

"اسکوریل لائبریری بڑی عظیم الشان لائبریری ہے۔ افسوس یہ ہے کہ عربوں کے زمانے کی قلمی تحریروں کا ذخیرہ متعصبین نے پہلے غارت کر دیا تھا۔ اب تھوڑا ذخیرہ رہ گیا ہے جس میں زیادہ تر مولانا جامی اور حضرت حافظ کی قلمی تحریریں ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے آخر میں مشورہ دیا کہ "ضرورت ہے کہ یہاں سے دو چار ایسے تعلیم یافتہ طلبا اسپین بھیجے جائیں جو فلسفۂ الٰہیات، عربی تمدن، اسلامی تاریخ اور مذہب سے اچھی طرح واقف ہوں تاکہ وہ اسلام کا صحیح نمونہ اہلِ ہسپانیہ کو

پیش کر سکیں "۔[1]

اندلس کے سفر کے سلسلے میں علامہ اقبال نے جو کلام لکھا اس کی تفصیل یوں ہے :

دعا (مسجد قرطبہ میں لکھی گئی) "بالِ جبریل"، صفحہ ۱۲۳-۱۲۵-

مسجدِ قرطبہ (ہسپانیہ کی سرزمین بالخصوص قرطبہ میں لکھی گئی)

ایضاً، صفحہ ۱۲۶-۱۳۶

قید خانہ میں معتمد کی فریاد ایضاً، صفحہ ۱۳۷-

عبدالرحمٰن اول کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت، سرزمین اندلس میں

ایضاً، صفحہ ۱۳۸-۱۳۹-

ہسپانیہ (ہسپانیہ کی سرزمین میں لکھے گئے)، (واپس آتے ہوئے)

ایضاً، صفحہ ۱۴۰-

طارق کی دعا (اندلس کے میدانِ جنگ میں) ایضاً، صفحہ ۱۴۲-۱۴۳-

یہ حوریانِ فرنگی، دل و نظر کا حجاب (قرطبہ میں لکھے گئے)

ایضاً، صفحہ ۵۶-۵۷-

لاہور میں خیر مقدم - ۱۵ فروری ۱۹۳۳ء کو اقبال فرنٹیر میل سے لاہور پہنچے تو اسٹیشن کا پلیٹ فارم ان کے خیر مقدم کے لیے آنے والے معززین سے بھرا ہوا تھا، جن میں سے مندرجہ ذیل اصحاب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں: حاجی میر شمس الدین، شیخ اصغر علی، ریٹائرڈ کمشنر، ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ، ریٹائرڈ اسٹنٹ کیمیکل ایگزامینر، علامہ عبداللہ یوسف علی، چودھری ظفر اللہ خاں، بیرسٹر ایٹ لا، جناب عبدالرحمٰن چغتائی، محمد عبداللہ چغتائی، عبدالرحیم چغتائی، سید عنایت شاہ، ایڈیٹر "سیاست"، سید انعام اللہ شاہ، ایڈیٹر "دورِ جدید"، سید نور احمد آف سول اینڈ ملٹری گزٹ، مولانا غلام رسول مہر، ایڈیٹر "انقلاب"، میاں امیرالدین،

---

[1] "آئینہ اقبال"، صفحہ ۱۵-۱۷-

رئیس (میونسپل کمشنر)، چودھری فتح محمد، رئیس و میونسپل کمشنر، ملک میراں بخش، رئیس لاہور، سید شبیر حسین، مجسٹریٹ، چودھری محمد حسین، سیاں ایم - اسلم، چودھری اسداللہ خاں، بیرسٹرایٹ لا، شیخ غلام مصطفیٰ حیرت، ایڈیٹر "فردوس"، سید سلامت اللہ شاہ، مالک، یونائٹیڈ آکشن مارٹ، سید نذیر نیازی، قاضی فضل حق، پروفیسر گورنمنٹ کالج، شیخ آفتاب اقبال، جاوید اقبال، شیخ اعجاز احمد، سب جج، شیخ مختار احمد، حکیم منشی طاہرالدین، خواجہ عبدالوحید، سیکریٹری، مسلم ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، معزز ارکان جمعیۃ الاسلام، لاہور۔[۱]

سپاس نامہ۔ پلیٹ فارم ہی پر جمعیۃ الاسلام کی طرف سے خواجہ فیروزالدین، بیرسٹرایٹ لا، نے سپاس نامہ پیش کیا جس کے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں:

"اس وقت مسلمانانِ ہند کی زبوں حالی "عیاں را چہ بیاں" کے مصداق ہے - یہ عظیم الشان قوم جس کی قسمت میں کبھی دنیا کی جہاں بانی تھی آج کشت و افتراق کی آماج گاہ بن کر ہندوستان میں اپنی تاریخی وسعت کھو بیٹھی ہے اور حقیقت میں آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ یہ زوال اور پستی ہمارے مذہبِ حقّہ اسلام کے سنہری اصول سے روگردانی کی وجہ سے ہے:

"جناب والا کی ہستی دیگر صفات کے علاوہ مسلمانوں کے دلوں میں اس لیے جگہ کیے ہوئے ہے کہ حضور والا نے اپنی ترنم ریزیوں سے مسلمانوں کو وہ بھولے ہوئے اسباق یاد دلائے جو آج سے تیرہ سو سال پہلے عرب کی تپتی ہوئی ریت پر کملی والے ﷺ نے اسلام کی دل نواز اور روح پرور لے سے اہلِ عرب کو سنائے تھے۔ حضور والا نے جس بے باکی اور جس عالمانہ قابلیت کے ساتھ مسلمانانِ ہند کے حقوق کی ترجمانی گول میز کانفرنس میں کی اور جس طرح آپ کی مدبرانہ اور محققانہ تقاریر نے دشمنانِ حقوقِ اسلامی کے ایوانوں میں لرزے ڈالے وہ آج ہر خاص و عام مسلمانوں کے دل سے اخلاص کی نذر وصول کرنے کے علاوہ آپ کی شخصیت کی مرغوبیت کو

---

[۱] ایضاً، صفحہ ۱۔

چار چاند لگا رہی ہیں لیکن ان جملہ حقائق کے باوجود ہم حضورِ والا سے حضور ہی کے الفاظ میں گزارش کریں گے:

دشتِ حجاز منتظر ریگِ عراق تشنہ کام
خونِ حسینؓ باز دہ کوفہ و شام خویش را

"مسلمانوں کا سیاسی نظام ابھی تک اس بات کا متقاضی ہے کہ آپ اس کی تکمیل کے لیے قائدانہ امداد فرماتے رہیں۔ گو نوجوانانِ اسلام ابھی کافی آمادۂ عمل نہیں ہوئے، اس لیے:

حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی" [1]

سپاس نامے کا جواب۔ علامہ اقبالؒ نے سپاس نامے کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"آپ نے اس استقبال اور سپاس نامہ کے پیش کرنے سے میری جس قدر عزت افزائی کی ہے میں اس کے شکریہ سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ میری زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ آپ کی خدمت میں گزرا ہے اور آپ میری سابقہ زندگی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اوّل سے لے کر اب تک میری زندگی کا مطمحِ نظر یہی رہا ہے کہ مسلمان اپنی موجودہ پستی کی حالت سے نکل کر بلندی پر پہنچ جائیں اور ان میں جو کمزوریاں اور اختلافات رونما ہو گئے ہیں وہ دُور ہو جائیں۔ جہاں تک مجھ سے ہو سکا میں نے گول میز کانفرنس میں اسلامی حقوق کے تحفظ کی پوری پوری کوشش کی ہے اور کوئی ایسا لفظ نہیں کہا جس سے مسلمانوں کے حقوق کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ باہمی اختلافات دُور کرنے کے لیے یہ ایک زرّیں موقع ہے۔ وہ اپنی سابقہ روایات کی روشنی میں متحد ہو سکتے ہیں۔ میں نے یورپ میں اس امر کا بخوبی مشاہدہ کیا ہے کہ وہاں کا ہر فرد اور عورت ماہیتِ اسلام سے آگاہ ہونے کے لیے بے تاب ہے اور وہ ایک ایسے مذہب کی تلاش میں ہیں جس سے انسان کی روحانی

---

[1] ایضاً، صفحہ ۱۷-۱۸۔

تشنگی کا ازالہ ہو سکے۔

"وقت چونکہ تھوڑا ہے اس لیے اس موضوع پر مفصل تقریر نہیں کر سکتا اور اپنی تقریر کو ختم کرتے ہوئے آپ سے دوبارہ یہی درخواست کروں گا کہ خدا کے لیے آپ اپنے تمام اختلافات کو، خواہ سیاسی ہوں یا مذہبی، بالکل مٹا دیں اور ایک ہو جائیں۔ اس وقت تمام اسلامی سلطنتوں نے بڑی حد تک ان نقائص کو دور کر دیا ہے۔ آپ کو بھی ان کی تقلید کی کوشش کرنی چاہیے۔"

سٹیشن سے نکل کر اکثر اصحاب حضرت علامہؒ کے دولت کدہ تک ساتھ آئے۔ وہاں بھی کئی اکابر ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ گفتگو زیادہ تر ہسپانیہ کی سیاحت کے متعلق ہوتی رہی اور حضرتِ علامہ قرطبہ کی مسجد کا ذکر فرماتے رہے۔ آپ نے فرمایا:

"میری رائے میں آج تک اس سے زیادہ خوبصورت اور شاندار مسجد روئے زمین پر تعمیر نہیں ہوئی۔ عیسائیوں نے بعد فتحِ قرطبہ اس مسجد میں جا بجا چھوٹے چھوٹے گرجے بنا دیئے تھے جنہیں اب صاف کر کے مسجد کو اصل حالت میں لانے کی تجویزیں کی جا رہی ہیں۔ میں نے ناظم آثارِ قدیمہ کی معیت میں جا کر بہ اجازتِ خاص اس مسجد میں نماز ادا کی۔ قرطبہ پر عیسائیوں کے تسلط کے بعد سے کم و بیش ساڑھے چار سو برس گزر چکے ہیں اس اسلامی عبادت گاہ میں یہ پہلی اسلامی نماز تھی۔"[1]

مجوزہ آئین پر اظہارِ خیال۔ ۲۶ فروری ۱۹۳۳ء کو آپ نے گول میز کانفرنس سے منتج آئین کے متعلق ایک اخباری بیان میں فرمایا:

"جہاں تک مسلمانانِ ہند کا تعلق ہے انہیں لازم ہے کہ آنے والے انتخابات کے لیے اپنے آپ کو منظم کریں اور ایسی باتوں سے احتراز کریں جو آپس میں جماعتی اختلافات کا باعث بن سکتی ہیں۔ مجوزہ نظام میں اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے اصول کو واضح طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اقلیتوں میں قومی نظریہ پیدا کرنے کی یہی صورت ہو سکتی ہے۔ اب یہ لندن والے اقلیتوں کے معاہدے میں فریق کی حیثیت سے حصہ لینے

---

[1] ایضاً، صفحہ ۱۸-۱۹۔

والی اقلیتوں کا اپنا کام ہے کہ وہ ان مراعات سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔

"گول میز کانفرنس کے دوسرے نتائج سے قطع نظر اس امر سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ اس ملک میں ایک ایسی قوم کی تخلیق ہوئی ہے جو بیک وقت جدید اور قدیم ہے۔ میرا خیال ہے کہ موجودہ تاریخ کا یہ سب سے اہم واقعہ ہے۔ ایک دوربین مورخ بھی اس نئی پرانی قوم کی تخلیق کے نتائج کا پورا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ مجھے امید ہے کہ اس قوم کے لیڈر بہت ہوشیاری سے کام لیں گے اور لوگوں میں خود آگہی کے جذبے کی تربیت کو بیرونی سیاسی اور معاشرتی اثرات سے بچائے رکھیں گے۔" ۱؎

سیاحتِ یورپ کے تاثرات۔ اسی تاریخ کو آپ نے یورپ کے حالات اور سفرِ اندلس کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"یورپ کے مختلف ممالک میں پھرنے اور موجودہ زمانے کی اخلاقی ابتری دیکھنے کے بعد میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسلام کو بحیثیتِ دین قبولیت پانے کا یہ بہترین وقت ہے۔ آج لاکھوں ہی نہیں بلکہ کروڑوں یورپ کے مرد اور عورتیں اسلام اور اس کے کلچر کی تعلیمات سمجھنے کے خواہاں ہیں۔ نوجوان مسلم جس قدر جلد اس حقیقت کو سمجھ لیں اتنا ہی اچھا ہے۔ یورپ کے مسلمان اب اس حقیقت کو سمجھتے ہیں۔ وہ آئندہ اگست میں جنیوا میں ایک کانفرنس منعقد کر رہے ہیں جس کے اغراض و مقاصد محض معاشرت اور کلچر تک ہی محدود ہوں گے۔ مجھے امید ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے مسلمان کانفرنس کو کامیاب بنانے میں دلی تعاون پیش کریں گے۔

"میں نے قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ، طلیطلہ اور میڈرڈ کی سیاحت کی اور قرطبہ کی تاریخی مسجد اور غرناطہ کے قصر الحمراء کے علاوہ میں نے مدینۃ الزہرا کے کھنڈر بھی دیکھے۔ یہ مشہورِ عالم قصر عبدالرحمٰن اوّل نے اپنی چہیتی بیوی زہرا کے لیے ایک پہاڑ

۱؎ "حرفِ اقبال"، صفحہ ۱۹۲۔

پر تعمیر کرایا تھا۔ آج کل یہاں کھدائی کا کام جاری ہے۔ بارھویں صدی عیسوی میں ایک مسلمان موجد نے سب سے پہلے اس جگہ پر ایک ہوائی جہاز کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہاں پر منجملہ اور لوگوں کے وزیرِ تعلیم ہسپانیہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ صاحب ہسپانیہ کی موجودہ روایات کے خلاف بہت خلیق اور روشن خیال ہیں۔ ان کے علاوہ "ڈوائن کومیڈی اینڈ اسلام" Divine Comedy and Islam کے شہرہ آفاق مصنف پروفیسر آسن سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ وزیرِ تعلیم کی زیرِ صدارت غرناطہ کی یونیورسٹی میں شعبۂ عربیہ میں کافی توسیع ہو رہی ہے۔ اس شعبہ کا صدر پروفیسر آسن کا ایک شاگرد ہے۔ جنوبی اسپین میں رہنے والے اپنے موروثی الاصل ہونے اور اسلامی تہذیب کی عظیم الشان یادگاروں کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتے ہیں۔ اب پھر ملک میں بیداری کی ایک لہر دوڑ رہی ہے اور تعلیم کی ترقی کے ساتھ اسے اور بھی فروغ حاصل ہوگا۔ لوتھر کی اصلاحی تحریک ابھی تک ختم نہیں ہوئی بلکہ یورپ کے مختلف ممالک میں اب بھی یہ تحریک بہت خاموشی سے اپنا کام کر رہی ہے اور بالخصوص ہسپانیہ میں پادریوں کا اثر آہستہ آہستہ کم ہو رہا ہے۔"[1]

محمد اکرام کے نام ۲۷ مارچ ۱۹۳۳ء کے مکتوب میں علامہ اقبالؒ سیاحتِ اندلس کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"میں اپنی سیاحتِ اندلس سے بے حد لذت گیر ہوا۔ وہاں دوسری نظموں کے علاوہ ایک نظم مسجد قرطبہ پر لکھی جو کسی وقت شائع ہوگی۔ الحمرا کا تو مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہ ہوا، لیکن مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت تک پہنچا دیا جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ میڈرڈ یونیورسٹی کے اربابِ اختیار نے مجھ سے درخواست کی کہ میں "ہسپانیہ اور عالمِ اسلام کا ذہنی ارتقاء" کے زیرِ عنوان ایک لیکچر دوں۔ یہ لیکچر نہایت پسند کیا گیا۔ پروفیسر آسن نے جو Divine Comedy and Islam کے مصنف ہیں بحیثیتِ صدر اپنی افتتاحی تقریر میں میری تعریف و توصیف میں خوب مبالغہ کیا۔"[2]

---

[1] ایضاً، صفحہ ۱۹۳-۱۹۴۔ [2] شیخ عطاء اللہ، مرتب "اقبال نامہ"، ۲/۳۲۱-۳۲۲۔

ہسپانیہ میں علامہ اقبال کی ملاقات ایک عرب محقق محمود خضیری سے ہوئی۔ اس کے بارے میں وہ اپنے ۱۳ جون ۱۹۳۴ء کے مکتوب بنام محمد عبداللہ چغتائی میں لکھتے ہیں:

"محمود خضیری سے میں سپین میں ملا تھا۔ وہ اس وقت فقہ اسلامی پر ریسرچ کر رہے تھے۔ نہایت نیک نوجوان ہیں۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ وہ نصیرالدین طوسی پر مقالہ پڑھیں گے۔ ان سے کہیے کہ نصیرالدین طوسی کی تحریروں کا وہ حصہ جس میں طوسی نے Euclid کے Parallel Postulate کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے بالخصوص مطالعہ کریں بلکہ اسی ضمن میں ان کے معاصرین کی تحریروں کا مطالعہ بھی کریں۔ اس تحقیق سے ان کو معلوم ہو گا کہ مسلمان ریاضی دان قرونِ وسطیٰ میں ہی اس نتیجے تک پہنچ چکے تھے۔ یہ ممکن ہے کہ مکان کے ابعاد Dimensions تین سے زیادہ ہوں اور ہمارے اسلامی صوفیہ تو ایک مدت سے تعددِ زمان و مکان کے قائل ہیں۔ یہ خیال یورپ میں سب سے پہلے جرمنی کے فلسفی Kant نے پیدا کیا تھا۔ لیکن مسلمان صوفیہ اس سے پانچ چھ سو سال پہلے اس نکتہ سے آشنا تھے۔ عراقی کے رسالے کا قلمی نسخہ غالباً ہندوستان میں موجود ہے اور میں نے ان کے ایک رسالہ کا جو خاص طور پر زمان و مکان پہ ہے اپنے لیکچروں میں ملخص بھی دیا ہے۔ اگر محمود خضیری بھی اس مضمون پہ ریسرچ کریں تو مجھ کو یقین ہے کہ یورپ میں نام پیدا کریں گے۔" [1]

---

[1] ایضاً، صفحات ۳۴۳-۳۴۴۔

اقبالؒ کا ایک نادر مکتوب

علامہ اقبال ایک شاعر اور فلسفی تھے۔ اس کے باوجود وہ شروع ہی سے مسلمانوں کے اجتماعی معاملات میں عملاً دلچسپی لیتے رہے۔ ۱۹۰۵ء میں اقبال تعلیم کے سلسلے میں یورپ گئے تو وہاں لندن میں چند محبِ وطن اور اسلام دوست احباب کی قائم کردہ نیم سیاسی تنظیم "پان اسلامک سوسائٹی" میں شرکت اختیار کی۔ یورپ سے واپس آئے تو مسلم لیگ قبل ازیں قائم ہو چکی تھی اور ان کے بعض قریبی احباب اس میں شامل ہو چکے تھے۔ اس لیے اقبال بھی مقامی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ کچھ عرصہ تحریکِ خلافت میں بھی حصہ لیا۔ اس کے باوجود وہ سیاست کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اس کی وجہ سیاسی رہنماؤں کی خود غرضی اور ملت فروشی تھی۔ تاہم وہ اس بات کے ضرور قائل تھے کہ اگر سیاست دان ہوش مند اور بے لوث ہوں تو وہ ملک اور قوم کی بہت خدمت کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۲۳ء میں لاہور کے عوام نے ان سے درخواست کی کہ وہ پنجاب مجلس قانون ساز میں ان کی نمائندگی کریں تو انہوں نے بڑے اصرار کے بعد آمادگی کا اظہار کیا۔ لیکن اسی حلقے سے میاں عبدالعزیز، بیرسٹر ایٹ لا، بھی مجلسِ قانون ساز کی رکنیت کے امیدوار تھے۔ چونکہ میاں عبدالعزیز اقبال کے پرانے دوست تھے اس لیے انہوں نے میاں صاحب کے مقابلے میں کھڑا ہونا پسند نہیں کیا۔ البتہ ۱۹۲۶ء میں جب مجلسِ قانون ساز کے دوبارہ انتخابات ہوئے تو انہوں نے لاہور کے عوام کی خواہش کے احترام میں بطور امیدوار کھڑا ہونا قبول کر لیا۔ علامہ اقبالؒ کے اس فیصلے کا عوام و خواص نے بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ روزنامہ "زمیندار" نے زبردست اداریہ لکھا اور دوسرے امیدواروں سے اپیل کی کہ وہ علامہ اقبالؒ کے حق میں دست بردار ہو کر دانشمندی کا ثبوت دیں۔ اس مرتبہ مجموعی طور پر اس حلقے میں چار امیدوار تھے۔ ان میں سے میاں عبدالعزیز

نے علامہ کے حق میں امیدواری سے دست برداری کا اعلان کر دیا۔ چونکہ میاں صاحب علامہ اقبال کے قریبی احباب میں سے تھے اس لیے اقبال نے ابھی تک اپنی امیدواری کا باقاعدہ اعلان نہیں کیا تھا۔ میاں صاحب کی دست برداری کے بعد ۲۹ جولائی ۱۹۲۶ء کو اقبال نے اپنی امیدواری کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔ اس موقع پر اقبال نے جو بیان دیا اس میں انہوں نے فرمایا: "مسلمانوں کو معلوم ہے کہ میں اب تک اس قسم کے مسائل سے بالکل علیحدہ رہا محض اس لیے کہ دوسرے لوگ یہ کام انجام دے رہے تھے اور میں نے اپنے لیے دوسرا دائرۂ کار منتخب کر لیا تھا۔ لیکن اب قوم کی مصیبتیں مجبور کر رہی ہیں کہ میں اپنا حلقۂ عمل قدرے وسیع کروں۔ شاید میرا ناچیز وجود اس طرح ملت کے لیے زیادہ مفید ہو سکے جس کی خدمت میں میری زندگی کے تمام لیل و نہار گزرے ہیں" اس بیان کی اشاعت کے بعد ملک محمد حسین، صدر بلدیہ لاہور، نے بھی اقبال کے حق میں اپنا نام واپس لے لیا۔ اب مقابلے میں صرف ملک محمد دین باقی رہے گئے تھے۔ اس کے باوجود کہ ان کے جیتنے کا کوئی امکان نہ تھا اور انہیں بھی دست برداری پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ علامہ اقبالؒ بلا مقابلہ منتخب ہو سکیں، وہ بدستور ڈٹے رہے۔ بہرحال انتخابی مہم شروع ہوئی تو عوام نے بڑے زور و شور سے اس میں حصہ لیا۔ مختلف انجمنوں اور برادریوں نے اقبال کی حمایت کا اعلان کیا۔ معززینِ شہر نے تائیدی بیانات دیئے اور شہر کے کوچہ و بازار میں متعدد جلسے ہوئے، جلوس نکلے اور علامہ اقبالؒ نے عوام سے خطاب کیا، اخباری بیانوں میں اپنا موقف پیش کیا۔ انتخابی مہم نے واضح کر دیا کہ علامہ اقبال کا پلہ بھاری ہے۔ ۲۳ اور ۲۴ نومبر ۱۹۲۶ء کو شہر اور چھاؤنی میں ووٹ ڈالے گئے۔ گنتی ہوئی تو اقبال کے ووٹ زیادہ نکلے۔ وہ جیت گئے تھے۔ ۶ دسمبر ۱۹۲۶ء کو انتخاب کے نتائج کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا۔ ملک محمد دین نے ۲۴۹۸ اور علامہ اقبال نے ۵۶۷۵ ووٹ حاصل کیے۔ اس طرح اقبالؒ ۳۱۷۷ ووٹوں کی اکثریت سے

کامیاب قرار دیے گئے۔ جنوری ۱۹۲۷ء میں اقبال نے پنجاب مجلسِ قانون ساز کے افتتاحی اجلاس میں شرکت کی۔ رکنیت کے زمانے میں انہوں نے نہ صرف اہلِ لاہور کے مسائل کے حل کے لیے قابلِ قدر کوششیں کیں بلکہ ملکی اور قومی سطح پر بھی اہم خدمات سر انجام دیں۔

۱۹۳۰ء میں مجلس کی رکنیت کی مدت ختم ہو گئی اور از سرِ نو انتخابات کا مرحلہ سامنے آ گیا۔ اس مرتبہ کسی وجہ سے اقبال نے یہ طے کیا انبالہ سے کاغذاتِ نامزدگی داخل کرائیں۔ اس کے لیے انہوں نے میر غلام بھیک نیرنگ[1] سے خط و کتابت کی۔ میر نیرنگ نے مشورہ دیا کہ اس سلسلے میں سید محمد حنیف، ایڈووکیٹ،

---

[1] میر غلام بھیک نیرنگ علامہ اقبال کے دیرینہ دوست تھے۔ ان کا اصلی وطن انبالہ کے مضافات میں واقع ایک گاؤں موضع دورانہ تھا۔ ۱۸۷۵ یا ۱۸۷۶ء میں یہیں پیدا ہوئے۔ میٹرک کا امتحان انبالہ سکول سے ۱۸۹۵ء میں پاس کیا اور مزید تعلیم کے لیے لاہور کے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا۔ حسنِ اتفاق سے اُسی سال علامہ اقبال بھی گورنمنٹ کالج میں بی۔ اے میں داخل ہوئے۔ دونوں کی ملاقات ایک مشترکہ دوست چودھری جلال الدین کی وساطت سے ہوئی۔ اقبال کی طرح میر نیرنگ کو بھی شعر و شاعری سے لگاؤ تھا اور وہ بھی نواب مرزا داغ کے شاگرد تھے۔ جلد ہی دونوں آپس میں گہرے دوست بن گئے۔ دونوں لاہور کی علمی و ادبی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ بی۔ اے کے بعد نیرنگ نے وکالت کا امتحان پاس کیا اور انبالہ میں وکالت شروع کر دی۔ کچھ عرصہ پبلک پراسیکیوٹر بھی رہے۔ پھر یہ ملازمت ترک کر کے وکالت کرنے لگے۔ وکالت اور شعر و شاعری کے ساتھ ساتھ مذہبی اور قومی تحریکوں میں حصہ لیتے رہے۔ انجمن دعوتِ تبلیغِ اسلام قائم کی۔ انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے۔ جمعیۃ العلمائے ہند میں شرکت اختیار کی، لیکن "نہرو رپورٹ" کے مسئلے پر جمعیۃ سے علیحدہ ہو گئے اور مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں قائدِ اعظم نے مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی قائم کی تو نیرنگ اس کے ڈپٹی لیڈر مقرر ہوئے۔ پاکستان کی مجلسِ دستور ساز بنی تو نیرنگ اس کے بھی رکن منتخب ہوئے۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو فوت ہوئے اور لاہور میں دفن ہوئے۔ "کلامِ نیرنگ" اور "غبارِ افق" دو کتابیں آپ کی یادگار ہیں۔ اقبال اور نیرنگ کے باہمی روابط کیلیے ملاحظہ کیجیے: گوہر نوشاہی کی مرتبہ "مطالعۂ اقبال"۔

سے رابطہ قائم کیا جائے جو میر نیرنگ کے انتہائی قابلِ اعتماد رفیق تھے اور انبالہ کے مسلمانوں میں بڑی قدر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ انبالہ کے مسلمان اپنے اجتماعی مسائل کے بارے میں کوئی فیصلہ ان کی رائے کے بغیر نہیں کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک مخلص، قومی خدمت کے جذبے سے سرشار اور سیاسی بصیرت سے بہرور رہنما تھے۔ وہ انبالہ میں وکالت کرتے تھے، انجمنِ اسلامیہ انبالہ کے صدر تھے اور انبالہ مسلم ہائی سکول[1] کی داغ بیل بھی انہوں نے ہی ڈالی تھی اور اس کے مہتمم بھی رہے تھے۔

سید محمد حنیف کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے انبالہ کے مسلمانوں کو ان کی اہمیت سے آگاہ کیا اور انہیں متحد ہو کر اپنے حقوق حاصل کرنے اور مشترکہ فلاح و بہبود کے لیے جدوجہد کرنے پر آمادہ کیا۔ سیّد محمد حنیف سے پہلے سیاسی میدان میں انبالہ کے مسلمانوں کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ وہ ہندوؤں کے مقابلے میں اکثریت کے مالک تھے۔ مسلمانوں کی تعداد باون فی صد تھی اور ہندوؤں کی اڑتالیس فی صد۔ گویا مسلمان ہندوؤں سے دو فی صد زیادہ تھے۔ اس کے باوجود مسلمان معاشی اور تعلیمی شعبوں کی طرح سیاسی شعبے میں بھی ہندوؤں سے پیچھے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مسلمان منتشر تھے۔ ان میں اتحاد و اتفاق کا فقدان تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کو مخلص اور نڈر قیادت میسر نہیں تھی اور تیسری وجہ ہندوؤں کی جتھہ بندی اور روایتی مکر و فریب پر مبنی سیاست تھی۔ انبالہ میونسپل کمیٹی ان کی سیاست کا اکھاڑہ تھی۔ ہندو یہ جانتے تھے کہ اگر انہوں نے مسلمانوں سے براہِ راست تصادم کا راستہ اختیار کیا تو خسارے میں رہیں گے۔ اس لیے انہوں نے یہ طریقہ اپنایا کہ میونسپل کمیٹی کے انتخابات جب ہوں تو کسی ایسے مسلمان کو آگے کر دیا جائے جو منتخب ہو کر ان کا مرہونِ منت ہو اور

---

[1] یہی سکول پاکستان قائم ہونے کے بعد سرگودھا منتقل ہو گیا اور وہاں سکول کے علاوہ اس نام سے کالج بھی قائم ہو گیا تھا جو اب دوسرے کالجوں کی طرح حکومت کی تحویل میں ہے۔

آلۂ کار بن کر کام کر سکے اور خود پس پردہ رہ کر داؤ پیچ لڑاتے رہیں۔ سید محمد حنیف نے جب شہر کی سیاست میں قدم رکھا تو جلد ہی صورتِ حال کو بھانپ گئے۔ انہوں نے ہندوؤں کے عزائم کو خاک میں ملانے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ لہٰذا ایک سال جب انتخابات قریب آئے تو انہوں نے میونسپل کمیٹی کے صدر کے عہدے کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ پہلی مرتبہ تو وہ کامیاب نہ ہو سکے، البتہ اگلے سال انتخابات کے موقع پر ہندوؤں نے جب خان بہادر نذر محمد کو اپنی حمایت کے لیے منتخب کیا تو مسلمانوں نے ان کے فریب میں آنے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں کے مادی وسائل اور مکر و فریب بے اثر ہو کر رہ گئے۔ مسلمان ارکان کمیٹی نے سید محمد حنیف کو کامیاب کرا دیا۔ اس پر ہندو بہت تلملائے۔ انہوں نے انتقام لینے کے لیے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ با اثر ہندوؤں نے گورنر پنجاب کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔ اس زمانے میں گورنر تھا سر میلکم ہیلی[1] جو نہ صرف بڑے رعب اور دبدبے والا گورنر تھا بلکہ بے حد ضدی اور خود سر تھا جو مسلمانوں کے خلاف زبردست کینہ رکھتا تھا۔ اس کا حکم تھا کہ مجھ سے کوئی دیسی آدمی ملنے آئے تو سوٹ، ٹوپی اور چھڑی کے بغیر معمولی کپڑے پہن کر اور سر پر پگڑی باندھ کر آئے۔ اس حکم کا مقصد دیسی لوگوں کی تذلیل کرنا تھا۔ گورنر انبالہ آیا تو اس نے سید محمد حنیف کو بلا بھیجا۔ ڈپٹی کمشنر نے گورنر کا حکم سید محمد حنیف تک پہنچایا تو انہوں نے کہا کہ اگر آؤں گا تو سوٹ پہن کر آؤں گا۔ گورنر کو پیغام دیا گیا تو اس کو یہ مطالبہ طوعاً و کرہاً ماننا پڑا۔ لہٰذا وہ شارک سکن کا سوٹ پہن کر، ترکی ٹوپی سر پر رکھ کر، چھڑی ہاتھ میں لے کر اور سفید بوٹ پاؤں میں پہن کر بڑی شان سے گورنر کے پاس پہنچے۔ ملاقات ہوئی تو گورنر نے سید صاحب کو مرعوب کرنا چاہا اور کہا کہ آپ کے بارے میں ہندوؤں نے شکایت کی ہے کہ آپ ان کی

---

[1] سر ڈبلیو۔ ایم ہیلی۔ ۱۹۲۴ تا ۱۹۲۸ء گورنر رہا۔

پروا نہیں کرتے۔ سید محمد حنیف نے صورتِ حال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ہم اکثریت میں ہیں، لہٰذا قدرتی طور پر فیصلہ اکثریت کے مطابق ہونا چاہیے۔ یہ یادتی نہیں، قانون اور انصاف کا بنیادی تقاضا ہے۔ گورنر نے کہا: اگرچہ آپ لوگ اکثریت میں ہیں، لیکن یہ اکثریت بہت معمولی ہے۔ انہوں نے جواب دیا: یہ درست ہے کہ اکثریت تھوڑی ہے لیکن ہے تو سہی۔ اس کے باوجود ہم اقلیت پر کوئی زیادتی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہماری تو خواہش یہ ہے کہ ہندو آئیں تو وہ ہمارے ساتھ مل کر انبالہ کے شہریوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کریں۔ باہمی تعاون سے کام کرنے کا سب کو فائدہ ہوگا، لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کمیٹی کا صدر ان کا نامزد کردہ ہو اور تمام فیصلے ان کی مرضی سے ہوں، حالانکہ وہ اقلیت میں ہیں؟ اس پر گورنر کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا اور وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوگیا۔ سید محمد حنیف بھی کھڑے ہو گئے۔ گورنر نے کہا: تم بہت تیز طبیعت معلوم ہوتے ہو۔ انہوں نے جواب دیا: مَیں نے طبیعت کی تیزی یا غصے کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ مَیں نے تو صرف ایک حقیقت آپ کے گوش گزار کی ہے۔ اس پر گورنر نے کہا: مجھے افسوس ہے، مَیں ہی ذرا غصے میں آگیا تھا۔ ملاقات ہوگئی۔ ہندوؤں نے گورنر سے جو امیدیں قائم کر رکھی تھیں نقش بر آب ثابت ہوئیں۔

سید محمد حنیف کے جذبۂ حبِّ قوم کی یوں تو بہت سی مثالیں ہیں لیکن ایک واقعہ خاص طور پر لائقِ ذکر ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے کہ جب وہ میونسپل کمیٹی کے صرف رکن تھے۔ ایک مرتبہ کمیٹی کا اجلاس ہونا تھا اور انہیں اس کی اطلاع مل چکی تھی، تاہم وہ اپنی بگھی میں بیٹھ کر فوراً میونسپل کمیٹی پہنچ گئے۔ اندر داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کمیٹی کے مسلم ارکان نے ہاتھ کھڑے کر رکھے ہیں۔ سید محمد حنیف نے اجلاس میں داخل ہوتے ہی بلا تامل اپنا ہاتھ بھی کھڑا کر دیا۔ ایک ہندو رکن لالہ گنگا رام نامی یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا: سید صاحب! آپ کو معلوم بھی ہے کہ مسئلہ کیا ہے؟ انہوں نے فوراً جواب دیا: اگر پتا نہیں تو آپ کا خیال ہے کہ یوں ہی

ہاتھ کھڑا کر رہا ہوں؟ بہر حال گنتی ہوئی اور فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہو گیا۔ بعد میں بتایا کرتے تھے کہ دراصل پتا تو مجھے بالکل نہیں تھا کہ مسئلہ کیا درپیش ہے۔ البتہ یہ یقین ضرور تھا کہ ایوان میں موجود تمام مسلم ارکان نے جو ہاتھ کھڑے کر رکھے ہیں تو ضرور کوئی ایسا مسئلہ ہے جس کا تعلق خاص طور پر مسلمانوں سے ہے، اس لیے میں نے بے سوچے سمجھے محض دوسرے مسلمانوں کی دیکھا دیکھی ہاتھ کھڑا کر دیا تھا۔

قیامِ پاکستان کے بعد سید محمد حنیف اس وقت تک انبالہ میں رُکے رہے جب تک اکثر و بیشتر مسلمان وہاں سے نکل نہیں آئے۔ پاکستان میں کچھ عرصہ لاہور میں اپنے چچازاد بھائی سید سبط حسن، صوبیدار میجر، کے پاس ٹھہرے رہے۔ یہاں سے ایک شخص کے ذریعے اسسٹنٹ کسٹوڈین مقرر ہو کر گوجرانوالہ چلے گئے جہاں ایک عرصے تک افسر بحالیات اور بعد ازاں ضلعی افسر بحالیات کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔ پھر مستعفی ہو کر وکالت شروع کر دی۔ آخر ۲۳ اگست ۱۹۶۸ء کو گوجرانوالہ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر اسی سال سے زیادہ تھی۔

سید محمد حنیف کی بے لوث خدمت اور نڈر قیادت۔ انبالہ کے مسلمانوں کے دلوں میں گھر کر رکھا تھا۔ مقامی سیاست میں ان کی پوزیشن بڑی مستحکم تھی۔ وہ میر نیرنگ کے موید تھے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ میر نیرنگ نے ملکی اور قومی سطح پر جو خدمات سرانجام دیں ان میں سیّد محمد حنیف کی تائید و اعانت بھی کارفرما تھی۔ میر نیرنگ کو ان کی اہمیت کا پورا پورا احساس تھا، اس لیے جب علامہ اقبالؒ نے ان سے رجوع کیا تو انہوں نے بجا طور پر اقبال کو لکھا کہ وہ سید محمد حنیف سے رابطہ قائم کریں۔ علامہ اقبال نے میر نیرنگ کی اس تجویز کے مطابق سیّد محمد حنیف کو خط لکھا۔ یہ خط اپنے تاریخی پس منظر کی بنا پر علامہ اقبال کی زندگی کے ایک اہم پہلو کے بارے میں قیمتی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال کی سوانح نگار اس پہلو کے بارے میں کوئی معلومات مہیا نہیں کرتے۔ پنجاب مجلسِ قانون ساز کی رکنیت کی مدت ختم ہوئی تو اقبال نے نئے انتخابات میں کوئی دلچسپی لی یا نہیں، ایسا سوال ہے جس کی طرف کچھ

اشارہ اس نادر خط سے ہوتا ہے جو اقبال نے ۲۱ جولائی ۱۹۳۰ء کو سید محمد حنیف کے نام لکھا۔ لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سید محمد حنیف نے اس کا کیا جواب دیا۔ اس بارے میں تلاش بسیار کے باوجود کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ کاش وہ خطوط محفوظ ہوتے جو دوسرے لوگوں نے اقبال کو لکھے تھے تو اس مسئلے پر زیادہ اچھی طرح روشنی ڈالی جا سکتی۔ بدقسمتی سے نہ تو میر نیرنگ کا خط اقبال کے نام دستیاب ہو سکا نہ ان کا سید محمد حنیف کے نام خط مل سکا اور نہ سید محمد حنیف کا خط اقبال کے نام ہی ہاتھ آ سکا۔ یہی غنیمت ہے کہ پچاس سال پہلے کا یہ نادر خط دریافت ہو گیا۔

"لاہور، ۲۱ جولائی ۱۹۳۰ء

"ڈیئر مسٹر محمد حنیف، السلام علیکم۔

"میر غلام بھیک صاحب کو میں نے آپ کے حلقے اور آئندہ انتخابات کے متعلق لکھا تھا۔ ان کا خط چند روز ہوئے مجھے آیا تھا جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ انہوں نے آپ کو اپنے خیالات سے آگاہ کر دیا ہے کہ میں مزید خط و کتابت آپ سے کروں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ آپ کے احباب و معاونین نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ اگر میر صاحب یا آپ کی جماعت میں سے کوئی اور صاحب کھڑے ہوں تو بڑی خوشی کی بات ہے، لیکن اگر ایسا نہ ہو [تو] آپ مہربانی کر کے اپنی جماعت کے فیصلے سے مجھے آگاہ فرمائیں کہ صورت حال کیا ہے اور آپ کے حلقے کی طرف سے کون کون امیدوار کھڑے ہوں گے۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔ والسلام۔

مخلص

محمد اقبال

ماخذ

جناب سید شاہد محسن کی روایت کے علاوہ اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے:

(۱) محمد حنیف شاہد، "اقبال اور پنجاب کونسل"

(۲) عاشق حسین بٹالوی، "چند یادیں، چند تاثرات"

(۳) "نقوش"، لاہور نمبر۔

(۴) لطیف احمد شیروانی، مرتب، "حرفِ اقبال"

(۵) گوہر نوشاہی، مرتب، "مطالعۂ اقبال"

اقبالؒ کا ایک گم شدہ اہم مکتوب

علامہ اقبال کے عقیدت مندوں اور جلیسوں میں سید نذیر نیازی مرحوم کو جو مقام حاصل تھا وہ اہلِ علم پر بخوبی آشکارا ہے۔ سید مرحوم نے علامہ اقبال کی فکر اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر جس انداز سے قلم اٹھایا وہ انہی کا حصہ ہے۔ ان کی ایک تصنیف "مکتوباتِ اقبال" ہے جس میں انہوں نے اپنے نام علامہ اقبالؒ کے خطوط مرتب کر کے پیش کیے ہیں۔ ان خطوط کی تعداد ۱۸۲ ہے جن میں ایک خط سید سلامت اللہ کے نام ہے[1]۔ اس مجموعہ میں ۱۹۳۱ء کے سال کے تحت جو خطوط درج ہیں ان میں سب سے پہلا خط ۳۱ مارچ کا ہے۔ سید مرحوم لکھتے ہیں:۔

> "مجھے تو اب یہ بھی یاد نہیں پڑتا کہ اس اثنا میں حضرت علامہ کا کوئی گرامی نامہ آیا یا نہیں، اگر آیا تو ضائع ہو چکا ہے۔ بہر حال اب جو اپنے مکتوبات دیکھتا ہوں تو جہاں تک ۱۹۳۱ء کا تعلق ہے اس میں سب سے پہلا مکتوب ۳۱ مارچ کا ہے"[2]۔

اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کو اس امر کا احساس ضرور تھا کہ مکتوبات میں سے کوئی مکتوب غائب ہے، اس لیے مکتوبات کا ربط و تسلسل برقرار نہیں رہا۔ ہو سکتا ہے کہ اس دوران کوئی خط آیا ہو لیکن اب وہ خط کہاں ہے؟ اس سلسلے میں ان کی یادداشت نے ان کا ساتھ نہیں دیا، ۱۹۳۲ء کے سال میں انہوں نے جو مکتوبات درج کیے ہیں ان میں آخری خط ۲۹ ستمبر ۱۹۳۲ء کا ہے۔ اس خط کے مندرجات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے سید نذیر نیازی نے ایک گم شدہ خط کا تذکرہ کیا ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ جیسے وہ یہ خیال کرتے تھے کہ گمشدہ خط ۱۹۳۲ء ہی کی کسی تاریخ کا تھا۔ جیسا کہ وہ رقم طراز ہیں:۔

---

[1] مکتوباتِ اقبال، اقبال اکیڈمی، کراچی، ۱۹۵۷ء۔ [2] ایضاً۔ صفحہ: ۵۰۔

"۱۹۳۲ء کے اتنے ہی مکتوبات تھے مگر ابھی ایک مکرمت نامہ کا ذکر باقی ہے جو افسوس ہے ضائع ہو گیا۔ لیکن جس کی عکسی نقل شاید روزنامہ "احسان" کی کسی اشاعت میں محفوظ ہو گی۔ یہ غالباً ۱۹۳۸ء کے اواخر یا ۱۹۳۹ء کی ابتداء کا ذکر ہے کہ روزنامہ "احسان" اور شیرازہ کے مدیر شہیر جناب چراغ حسن حسرت مرحوم نے حضرت علامہ کا یہ مکرمت نامہ مجھ سے مستعار لیا۔ مقصد یہ تھا کہ اس کی نقل "احسان" کے اقبال نمبر یا "شیرازہ" کے کسی پرچے میں شائع کر دی جائے۔ حسرت مرحوم کا یہ ارادہ تو پورا ہو گیا۔ لیکن یہ مکرمت نامہ پھر کبھی واپس نہ ملا۔ حالانکہ مَیں نے بار بار اس کا مطالبہ کیا۔ حسرت مرحوم بڑے مصروف انسان تھے اور کاغذات بھی شاید احتیاط سے نہیں رکھتے تھے۔ پھر جب وہ سلسلۂ ملازمت میں منسلک ہو گئے تو ان سے ملاقات کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ جنگ ختم ہوئی اور حسرت صاحب ملازمت سے واپس آئے تو مَیں نے پھر تقاضا کیا لیکن انہیں موقع نہ ملا کہ اس مکرمت نامے کو تلاش کرتے تا آنکہ مَیں اس کی واپسی سے مایوس ہو گیا۔ بہر حال یہ مکتوب یا اس کی عکسی نقل اگر کسی صاحب کے پاس موجود ہو یا حُسنِ اتفاق سے "احسان" کے کسی پرچے میں مل جائے تو راقم الحروف کو بھیج دیں ان کی بڑی نوازش ہو گی وہ سفید ہلکے لکیردار دو صفحے کاغذ پر جو کبھی مراسلات نویسی کے لیے استعمال ہوا کرتا تھا۔ لکھا گیا ہے اور ہے بھی مختصر۔"[۱]

حُسنِ اتفاق سے روزنامہ "تعمیر" راولپنڈی کے سابق ایڈیٹر محمد فاضل صاحب نے مجھے "شیرازہ" کی فائل مطالعہ کی غرض سے عنایت کی۔ اس میں "شیرازہ" کا اقبال نمبر بھی تھا جو بعد میں "اقبال نامہ" کے نام سے کتابی صورت میں بھی شائع ہوا۔ اور وہ خط بھی جس کے ضائع ہونے کا خدشہ سیّد نذیر نیازی مرحوم نے ظاہر کیا تھا۔ مذکورہ خط ۲ دسمبر ۳۸ ۱۹ء کے "شیرازہ" میں اس عنوان اور تعارف سے شائع ہوا۔

"علامہ اقبال مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ خط سیّد نذیر نیازی کے نام۔

ذیل میں حضرت علامہ اقبال مرحوم کے ایک غیر مطبوعہ خط کا عکس شائع کیا جاتا

۱۔ ایضاً۔ صفحہ: ۸۴-۸۵۔

ہے جس میں مرحوم نے اسلامی ریاست کے متعلق ایک اہم نکتہ کی وضاحت کی ہے"۔

اپنی وفات سے چند سال پیشتر سید نذیر نیازی مرحوم راولپنڈی تشریف لائے تو ایک عجیب اتفاق سے ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اور یہ ملاقات مزید ملاقاتوں کی تمہید بن گئی۔ اس کے بعد وہ جب بھی راولپنڈی آتے مجھ سے ضرور ملاقات کرتے۔ ان ملاقاتوں میں فکرِ اقبال کے مختلف گوشوں پر تبادلۂ خیال ہوتا اور اس طرح میں ان کے علم اور تجربہ سے فیض یاب ہوتا۔ ان کی معیت میں اقبال کے بعض معاصرین اور عقیدت مندوں سے بھی ملا۔ اس دوران ان سے کچھ خط و کتابت بھی رہی جو کسی مناسب موقع پر مرتب کر کے شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ بہر حال اس زمانے میں جی چاہتا تھا کہ یہ خط ضروری معلومات کے ساتھ کسی علمی مجلہ میں شائع کر کے سید صاحب کو مسرت آمیز حیرت میں مبتلا کر دیا جائے لیکن مصروفیات کی کثرت کی بنا پر ایسا نہ ہو سکا۔ میری خواہش ہنوز تشنۂ تکمیل تھی کہ سید نذیر نیازی انتقال فرما گئے۔ اب جب کہ وہ ہم سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اس خط کی اشاعت کی نوبت آ رہی ہے اس سے جہاں ایک گونہ خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ بزرگوارم سید نذیر نیازی کو ایک عرصے سے جس خط کی تلاش تھی وہ نہ صرف دستیاب ہو چکا ہے بلکہ شائع بھی ہو رہا ہے وہاں دل میں یہ احساس بھی ہے کہ کاش یہ خط ان کی زندگی ہی میں اشاعت پذیر ہو جاتا۔ اسی طرح وہ "مکتوباتِ اقبال" کے نئے ایڈیشن میں یہ خط شامل کر کے سرخرو ہو سکتے تھے۔ اقبال اکیڈمی لاہور نے نومبر ۱۹۷۷ء میں جناب محمد عبداللہ قریشی کی مرتب کردہ کتاب "روحِ مکاتیبِ اقبال" شائع کی ہے۔ اس کے صفحہ نمبر ۶۱۶ پر مکتوب نمبر ۲۸۰ درج ہے اور اس میں قریشی صاحب نے اس خط کا خلاصہ دے کر اس کو غیر مطبوعہ ظاہر کیا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ خط مطبوعہ ہے البتہ اس کو اس سے قبل مرتب صورت میں پیش نہیں کیا گیا۔ بہر حال "شیرازہ" سے خط نقل کرتے ہوئے میں نے اس امر کا لحاظ رکھا ہے کہ خط کا انداز اور سطروں کی ترتیب بعینہٖ وہی ہو جو اقبال کے اصل خط کے عکس کی ہے۔

لاہور، ۱۱ر جنوری ۱۹۳۱ء

ڈیئر نیازی صاحب

السلام علیکم۔ آپ کا خط مل گیا ہے۔

ایڈریس کا اُردو ترجمہ شائع کرنے کا خیال اچھا ہے۔ ضرور کیجئے۔ اس سے پہلے انقلاب کے دو نمبروں میں اردو ترجمہ شائع ہو چکا۔ وہ ترجمہ بھی خاصہ ہے۔ اس پر نظر ثانی کر لیجئے۔ غالباً مولوی غلام رسول صاحب مہر نے کیا تھا۔

اقبال کے فسٹ[1] کے متعلق میں نے چودھری محمد حسین صاحب سے کہہ دیا تھا بلکہ آپ کا خط ہی ان کو دکھا دیا تھا۔ پھر کہوں گا۔ غالباً وہ لکھیں گے۔

مجوزہ اسلامی ریاست ایک نصب العین ہے۔ اس میں آبادیوں کے تبادلے کی ضرورت نہیں، یہ خیال (آبادیوں کے تبادلے کا) مدت ہوئی لالہ لاجپت رائے نے ظاہر کیا تھا۔ اس ایک ریاست یا متعدد اسلامی ریاستوں میں جو شمال مغربی ہند میں اس اسکیم کے مطابق پیدا ہوں گی۔ ہندو اقلیت کے حقوق کا پورا پورا تحفظ کیا جائے گا۔ والسلام

محمد اقبال

توضیحات

سیّد نذیر احمد نیازی

سیّد نذیر احمد نیازی (مارچ ۱۹۰۰ء۔ ۲۴ جنوری ۱۹۸۱ء) اقبال کے ہم وطن اور ان کے اُستادِ مکرم مولانا سیّد میر حسن کے حقیقی بھتیجے تھے۔ وہ نہ صرف اقبال کی فکر سے متاثر تھے بلکہ انہوں نے فکرِ اقبال کی تشریح و توضیح کے لیے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی۔ اقبال کی زندگی میں جن چند لوگوں کو اقبال کے انتہائی قریب رہنے کا موقعہ ملا ان میں سیّد نذیر نیازی کو اہم مقام حاصل ہے۔ انہوں نے ستمبر ۱۹۵۷ء میں "مکتوباتِ اقبال" کے نام سے وہ خطوط مرتب کر کے شائع کیے، جو اقبال نے ۱۹۲۹ء سے لے کر ۱۹۳۷ء تک انہیں لکھے تھے۔ انہوں نے اقبال کی مشکل ترین تصنیف خطبات کا ترجمہ "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" کے نام سے کیا یہ ترجمہ اکثر و بیشتر اقبال

[1] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو۔ صفحہ ۲۵۵۔

کی زیرِ ہدایت اور زیرِ نگرانی کیا گیا۔ نیازی مرحوم نے نہ صرف ترجمہ کیا بلکہ اس کو ضروری حواشی و تعلیقات سے زیادہ سے زیادہ عام فہم بنانے کی کوشش بھی کی۔" اقبال کے حضور" ان کا ایک اور کارنامہ ہے اس میں انہوں نے اقبال کے ساتھ اپنی گفتگوؤں کو قلمبند کیا ہے۔ یہ ایک ہی جلد شائع ہوئی مگر ان کے بقول ابھی تین جلدوں کا مزید مواد ان کے پاس موجود تھا، ان کی آخری تصنیف "دانائے راز" ہے جو حیات اقبال کے موضوع پر ہے اس کی پہلی دو فصلیں ۹ رنومبر ۱۸۷۷ء سے لے کر ۱۸۹۵ء تک کے حالات پر مشتمل ہیں جب کہ تیسری فصل کا صرف ایک جزو لکھا گیا تھا کہ کتاب کی اشاعت کا فیصلہ کر لیا گیا۔ کتاب کے ابتدائیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیازی مرحوم تقریباً دس ہزار صفحات پر مشتمل آٹھ جلدوں میں حیاتِ اقبال مکمل کرنا چاہتے تھے لیکن موت نے انہیں مہلت نہیں دی۔ مگر ضمناً و تبعاً اس کتاب میں حیاتِ اقبال کی اہم باتیں بیان ہو گئی ہیں۔

ایڈریس کا ترجمہ

ایڈریس سے مراد علامہ اقبالؒ کا وہ تاریخی خطبۂ صدارت ہے جو انہوں نے ۲۹ ردسمبر ۱۹۳۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدۂ الہ آباد میں دیا تھا۔ اس میں اقبال نے شمال مغربی ہندوستان میں واقع مسلم اکثریت کے باہم منسلک صوبوں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو اسلامی ریاست کی صورت میں منظم کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ یہ کوئی ہنگامی رائے یا خیال کی عارضی رَو نہ تھی بلکہ برسوں کے غور و فکر کا نتیجہ تھی۔ علامہ اقبالؒ زندگی کے آخری لمحوں تک نہ صرف اس رائے پر قائم رہے بلکہ انہوں نے بعد میں بنگال کو بھی مجوزہ ریاست میں شامل کرنے کی تجویز پیش کی۔ خطبۂ الہ آباد کے بعد آنے والے برسوں میں اقبال اپنی تجویز کی وضاحت میں مصروف رہے ۲۱ رمارچ ۱۹۳۲ء کو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس لاہور میں صدارتی خطبہ دیتے ہوئے اقبال نے الہ آباد کے خطبہ کا حوالہ دیا۔ ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء میں منعقد ہونے والی دوسری اور تیسری گول میز کانفرنسوں میں بھی انہوں نے مسلمانوں

کے جداگانہ قومی تشخص کے حوالے سے برصغیر کے سیاسی مسائل کے حل کے لیے آواز اٹھائی۔ ایکٹ ۱۹۳۵ء کے بعد انہوں نے اپنی مسلسل علالت کے باوجود مسلم لیگ کی تنظیم نو میں قائدِ اعظم کا ساتھ دیا اور قائدِ اعظم مئی ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ وغیرہ کے سلسلے میں لاہور آئے تو انہوں نے دیگر سیاسی رہنماؤں کے علاوہ علامہ اقبالؒ سے بھی ملاقات کی اور علامہ نے انہیں مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء میں اقبال جناح خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا اس میں بھی انہوں نے اپنے اسی مؤقف کا اظہار کیا جس کی تفصیل خطبۂ الٰہ آباد میں ملتی ہے۔

برصغیر کو تقسیم کرنے اور مسلم مملکت قائم کرنے کے لیے اقبال نے اپنے خطبہ الٰہ آباد میں جو فلسفیانہ بنیادیں مہیّا کی تھیں وہ اتنی زوردار اور مؤثر تھیں کہ ان کی بدولت ان کی تجویز نے بہت جلد قبولِ عام حاصل کر لیا۔ بہر حال جب یہ خطبہ دیا گیا تو ظاہر ہے کہ ملکی اخبارات نے اس کو اہمیّت دی ہو گی اور اس کے بارے میں خبریں بھی دی ہوں گی لیکن خطبہ کے مکمل ترجمہ کی شدید ضرورت محسوس ہوتی تھی خطبۂ اقبال کے اسلوب بیان کا بہترین نمونہ تھا۔ لیکن اس کے مطالب کی اشاعت وقت کا اہم تقاضا تھی، اس تقاضے کی اولین تکمیل روزنامہ "انقلاب" لاہور کے صفحات میں ہوئی۔ انقلاب میں شائع ہونے والا ترجمہ جیسا کہ اقبال کے خط سے معلوم ہوتا ہے غالبًا مولانا غلام رسول مہر نے کیا تھا جو اس اخبار کے مدیر تھے۔ اسی زمانے میں رسالہ "صوفی" منڈی بہاؤ الدین کے اصرار پر سید نذیر نیازی نے بھی اس خطبہ کا ترجمہ کیا اور اس کی نقل علامہ اقبال کی خدمت میں ارسال کر دی۔ یہ ترجمہ رسالہ "صوفی" کے زیرِ اہتمام شائع ہوا اور ہزاروں کی تعداد میں مفت تقسیم کیا گیا۔

اقبال فسٹ

فسٹ دراصل جرمن لفظ Fest ہے جو Festival یعنی جشن کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین اور ڈاکٹر ذاکر حسین کا خیال تھا کہ جرمن یونیورسٹیوں میں اکابر اہلِ علم کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے جس طرح جشن منائے جاتے ہیں اسی

طرح ہندوستان میں بھی اقبال فسٹ کے نام سے ایک تقریب منعقد ہونی چاہیئے جس میں پورے ملک کے ممتاز اہلِ علم اور نامور شخصیتیں شریک ہوں اور مہمان خصوصی یعنی علامہ اقبال کی خدمت میں متعدد علمی و فلسفیانہ مقالات کا ہدیہ بطورِ عقیدت پیش کیا جائے۔ یہی نہیں بلکہ یہ تجویز بھی پیش نظر تھی کہ فکرِ اقبال کے مختلف گوشوں پر تحقیق کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے ایک خالص علمی، ثقافتی اور تحقیقی ادارے کا قیام عمل میں لایا جائے[1] اس مقصد کے لیے جامعہ ملّیہ دہلی نے اپنی خدمات پیش کر دی تھیں۔ اقبال کے خطوط میں مجوزہ فسٹ کا تذکرہ پہلی مرتبہ ان کے مکتوب بنام سید نذیر نیازی مورخہ ۱۱ر دسمبر ۱۹۳۰ء میں ملتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں:۔

> "وسط جنوری یا جنوری کے آخر میں آپ کیا منانے والے ہیں میں نے اپنا نام پڑھ لیا مگر دوسرا لفظ نہ پڑھ سکا۔ آپ نے لکھا ہے "Iqbal Fest" معلوم نہیں Fest سے آپ کی کیا مراد ہے؟
> بہرحال چودھری صاحب کو آپ کا خط دکھا دوں گا۔"[2]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید نذیر نیازی نے اپنے خط میں اس لفظ کی وضاحت کر دی تھی جس کے جواب میں اقبال نے زیرِ نظر خط لکھا اور اس میں مجوزہ جشن میں شرکت پر رضامندی کا اظہار کر دیا تھا اور اس سلسلے میں چودھری محمد حسین صاحب کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ اربابِ جامعہ ملّیہ کی فرمائش پر مضمون لکھیں۔ لیکن یہ تقریب منعقد نہ ہو سکی۔ اقبال دہلی گئے لیکن اس تقریب میں شرکت کرنے کے لیے نہیں بلکہ ملک کے سیاسی زعماء سے گفت و شنید کے لیے اور اپریل کے آغاز میں چند روز وہاں رہ کر واپس چلے آئے۔

تبادلۂ آبادی

اقبالؒ نے اس خط میں آبادی کے تبادلے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ انہوں نے خطبۂ الہ آباد میں اسلامی ریاست کے قیام کا جو تخیل پیش کیا تھا اس کی پشت پر ان کا یہ احساس کار فرما تھا کہ ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں مسلمان صرف

---

[1] ایضاً، صفحہ: ۴۷
[2] ایضاً، صفحہ: ۴۵۔

ایک قوم کی حیثیت سے شریک ہو سکتے ہیں جب کہ ہندو اور انگریز اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ علامہ اقبالؒ بجا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں کوئی پائیدار مفاہمت ہو سکتی ہے تو اس کے لیے ناگزیر ہے کہ کوئی باعزت اور منصفانہ بنیاد تلاش کی جائے۔ ورنہ ہندوستان کا سیاسی مسئلہ حل نہیں ہو سکے گا۔ اقبال کا خیال تھا کہ جدید تصورات کی روشنی میں مسلمان ہی دراصل ایک قوم ہیں۔ ہندو ایک قوم بننے کے خواہشمند ضرور ہیں لیکن ابھی تک وہ ان خصوصیات سے محروم ہیں جو ایک قوم کے لیے لازمی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لیے اقبال کا یہ نقطۂ نظر ان کی سیاسی بصیرت کا آئینہ دار تھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں صرف برابری کی بنیاد پر سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔ مسلمان اقلیتی فرقہ نہیں ہیں جیسا کہ کانگریس شور مچا رہی تھی اگر یہ اقلیتی فرقہ ہیں تو ان کو صرف رعائتوں اور تحفظات کی ضرورت ہے حقوق کی نہیں اس صورت میں مسلمان اپنی جداگانہ ثقافتی زندگی کو پروان چڑھانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے اس روش کا انجام مسلم قومیت کا خاتمہ ہوگا۔ بقول سید نذیر نیازی ”اسلام ایک ریاست، ایک تہذیب، ایک معاشرہ، اور اس لیے ایک ہیئتِ سیاسیہ اور اجتماعیہ ہے۔ یہ ہیئت برقرار ہے تو اسلامی تہذیب و تمدن کو بھی فروغ ہوگا اور اسلامی ثقافت (کلچر) کے تحفظ کا پہلو بھی نکل آئے گا۔ مسلمان کوئی مذہبی جماعت نہیں تھے کہ اقلیت کے درجے پر قانع ہو جاتے۔ ان کی آبادی، ان کے ماضی کی تاریخ ان کی تعداد اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے دین اور شریعت کا تقاضا تھا کہ وہ اپنے ملی وجود کے تحفظ، اپنی جداگانہ قومیت پر اصرار اور اپنی تہذیب و تمدن برقرار رکھنے کے لیے ایک متحدہ محاذ قائم کرتے۔“

اقبالؒ کے نزدیک یہی وہ طریق کار تھا جس پر عمل کر کے مسلمان اپنے اکثریتی خطوں میں سیاسی اقتدار حاصل کر کے اپنی اجتماعی زندگی کی بقا کا سامان بہم پہنچا سکتے تھے اقبال کو یقین تھا کہ اگر مسلمان ان خطوط پر کام کریں اور ہندو ان کی جداگانہ حیثیت تسلیم کر لیں تو بدگمانی اور بے اعتمادی کی وہ فضا ختم ہو سکتی ہے جو ہندو کانگریس کی ضد اور ہٹ دھرمی کی

وجہ سے قائم ہو چکی ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ہندوستان ایک ملک نہیں کئی ملکوں کا مجموعہ ہے ایک قوم نہیں کئی قوموں کا مجموعہ ہے۔ اس کے مختلف حصّوں میں صلح و آشتی کا قیام صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ کسی حصّے کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ اس لیے مسلمانوں کو بجا طور پر یہ مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہے کہ انہیں ان کے اکثریتی علاقوں میں حکومت قائم کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس بحث کے نتیجے میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر مسلمانوں کو ان کے اکثریتی علاقوں میں اسلامی ریاست بنانے کی اجازت دی جائے تو کیا اس طرح مسلم اور غیر مسلم خطّوں کے درمیان تبادلۂ آبادی بھی ہو گا؟ اقبال نے کہا یہ لازمی نہیں تاہم بعید از امکان بھی نہیں۔ اس وقت بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اقبال کی مجوزہ ریاست ان کے مذہبی تعصب کی آئینہ دار ہے۔ لیکن علامہ اقبال نے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ ان کی اپنی رائے نہیں بلکہ بعض ہندو رہنما بھی قبل ازیں اس قسم کی رائے کا اظہار کر چکے تھے مثلاً لالہ لاجپت رائے۔ لالہ جی کانگریس سے منسلک تھے اور ایک مسلم دشمن تحریک "سنگھٹن" کے بانی تھے۔ انہوں نے ۱۹۲۵ء میں سی آر داس کے نام ایک خط لکھا تھا جس میں انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت و اہمیت تسلیم کی، مسلم قائدین کے خلوص پر اعتماد کا اظہار کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ہم حکومتِ برطانیہ کے خلاف تو متحد ہو سکتے ہیں لیکن برطانوی طرزِ جمہوریت سے ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے متحد نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ قرآن حکیم تاریخ اسلام اور اسلامی قانون اس میں مزاحم ہے۔ ہندو مسلم اتحاد نہ تو ممکن ہے نہ قابلِ عمل۔ اور دونوں قوموں کی جدائی ناگزیر ہے[۱] لالہ صاحب نے ہندوستان کو ہندو اور مسلم ریاستوں میں تقسیم کرنے کی تجویز بھی پیش کی[۲] اسی لیے اقبال نے ان کی رائے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ دلچسپ بات یہ کہ لالہ جی کے ان خیالات کا حوالہ صرف اقبال ہی نے نہیں دیا۔ ۱۹۴۰ء میں قائد اعظم نے

۱؎ Muslim Separatism in India By Abdul Hamid, p. 172, 173

۲؎ Muhammad Ali Jinnah By M.A. Saiyid, p. 108, 109

نے بھی اپنے خطبۂ لاہور میں اس طرف اشارہ کیا تھا۔ اس طرح یہ ثابت ہو گیا کہ اگر یہ تعصب ہے تو اس کا دو ٹوک اظہار ہندوؤں کی طرف سے پہلے ہی ہو چکا ہے مسلمانوں نے اپنے قومی حقوق کے لیے آواز بلند کرنے کی جسارت کی ہے۔ اور وہ تو صاف نیت کے ساتھ چاہتے ہیں کہ جن علاقوں میں ہندو اکثریت میں ہیں ان پہ ہندو حکومت کریں اور جن میں مسلمان اکثریت میں ہیں ان پہ مسلمانوں کو حکومت کرنے کا موقع دیا جائے اور دونوں قومیں اپنے خطوں میں اپنی اقلیتوں کے ساتھ رواداری اختیار کریں اور آزادانہ طور پہ اپنے تہذیبی نصب العین کے حصول کے لیے جدوجہد کریں ان جداگانہ ریاستوں کا قیام باہمی مخاصمت و عداوت میں اضافہ کرنے کے لیے نہیں سیاسی مصالحت و مفاہمت کی راہ ہموار کرنے کی غرض سے ضروری ہے۔

مآخذ

اُردو:

۱۔ مکتوباتِ اقبال، سید نذیر نیازی، اقبال اکیڈمی کراچی، ۱۹۵۷ء۔

۲۔ "شیرازہ"، لاہور، بابت ۲ر دسمبر ۱۹۳۸ء۔

۳۔ روحِ مکاتیبِ اقبال، محمد عبداللہ قریشی، اقبال اکیڈمی لاہور، نومبر ۱۹۷۷ء۔

انگریزی:

1 . Muslim Separatism in India
A Brief Survey 1857-1947
By Abdul Hamid, Oxford University
Press 1967

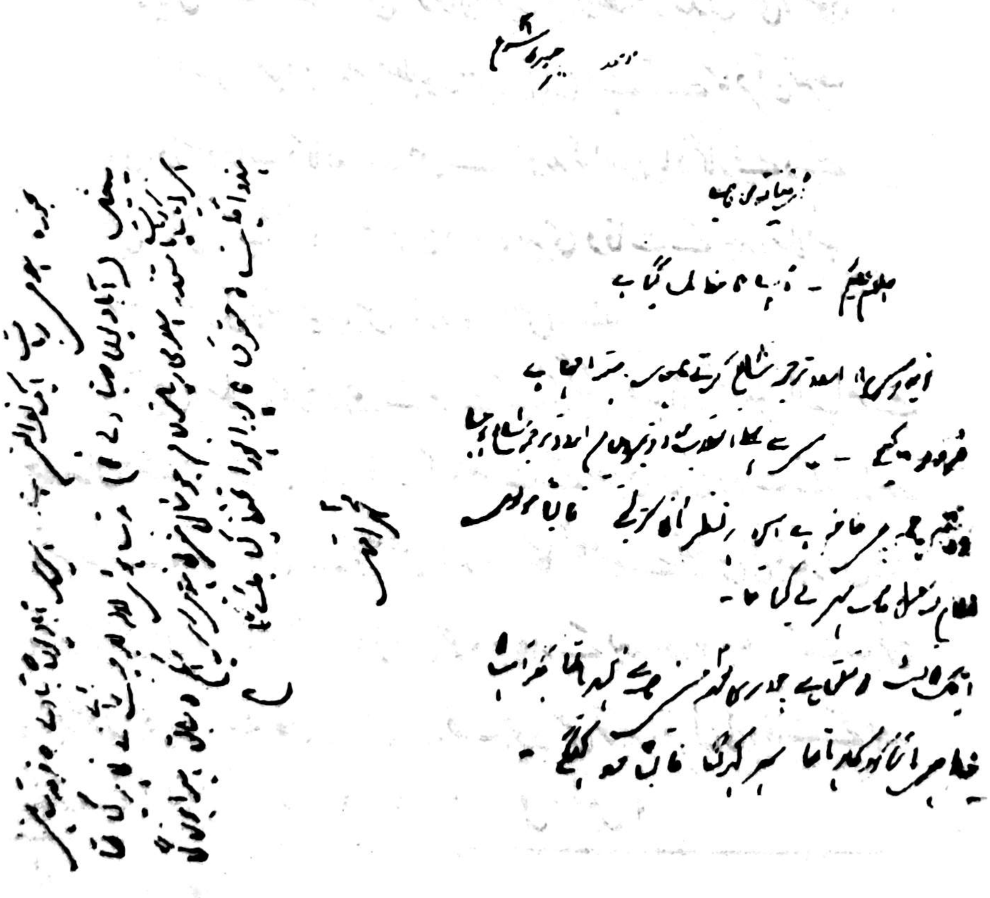
2. Mohammad Ali Jinnah
A Political Survey By M.H.Saiyid
Elite Publishers Limited, Karachi, 1970

ؔ۱ مجلہ "فاران" جون ۱۹۶۲ء۔ ؔ۲ ملاحظہ کیجیے مظفر حسین کا مقالہ اقبال کا تصورِ بقائے دوام مشمولہ متعلقات خطبات اقبال مرتبہ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ۔

علامہ اقبال مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ خط

سید نذیر نیازی کے نام

ذیل میں حضرت علامہ اقبال مرحوم کے ایک غیر مطبوعہ خط کا عکس شائع کیا جاتا ہے جس میں مرحوم نے اسلامی ریاست کے متعلق ایک اہم نکتہ کی وضاحت کی ہے۔



اقبال کا ذخیرۂ کتب

علامہ اقبال اپنی عمر کے آخری حصے میں صحت کی خرابی، بیوی کی وفات اور اولاد کے نابالغ ہونے کی بناء پر بہت فکرمند تھے اس لیے انہوں نے دُوراندیشی سے کام لیتے ہوئے ۱۳؍اکتوبر ۱۹۳۵ء کو اپنا وصیت نامہ قلمبند کیا۔ اس میں انہوں نے دیگر ضروری باتوں کے بارے میں اظہارِ خیال کے ساتھ ساتھ ان کتابوں کا بھی ذکر کیا جو ایک مدت تک ان کی رفیقِ دمساز رہی تھیں۔ اس وصیت نامہ کا متعلقہ حصہ یہ ہے:۔

"کتب فلسفہ و لٹریچر وغیرہ۔ ان میں سے چند کتب یعنی اپنی تصنیف کردہ کتب کے مطبوعہ نسخے مع مسوّدات۔ مثنوی مولانا روم فارسی و انگریزی مرتبہ ڈاکٹر نکلسن۔ دیوان مرزا عبدالقادر بیدل قلمی، مثنوی مرأۃ معنوی (مولانا روم۔ مطبوعہ حیدرآباد) اپنے پڑھنے کا قرآن شریف باقی اور مسودات و کاغذات میں نے جاوید کو بطور یادگار دے دیئے ہیں۔ باقی کتب مطبوعہ انگریزی وغیرہ میری وفات کے بعد اسلامیہ کالج لاہور کی لائبریری میں رکھ دی جائیں۔[۱]

یہ کتابیں اسلامیہ کالج لاہور کے حوالے کب کی گئیں؟ یہ ایک تحقیق طلب امر ہے چندسال پیشتر میرا خیال تھا کہ اقبال کی وصیت کے مطابق ان کی وفات کے فوراً بعد یہ مجموعہ کتب مذکورہ ادارے کو منتقل نہ کیا جا سکا۔[۲] میرے قیاس کی بنیاد اس بات پر تھی کہ اس میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جو ۱۹۳۸ء کے بعد اور ۱۹۴۲ء تک شائع یا موصول ہوئیں۔ اگر کتابوں کی منتقلی بروقت ہوئی تھی تو پھر اقبال کی وفات کے بعد کے زمانے کی کتابیں کس طرح اس مجموعے میں شامل ہو گئیں؟

---

[۱] روزگارِ فقیر، جلد دوم، صفحہ: ۵۷-۵۸۔

[۲] Momentos of Iqbal P. ۴۵

اسی سلسلے کا دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ کتابیں تو اسلامیہ کالج لاہور کے حوالے کی گئی تھیں اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور میں کس طرح پہنچیں؟ جہاں آجکل "اقبال کولیکشن" کے نام سے موجود ہیں۔

پروفیسر محمد صدیق نے اس مجموعے میں شامل کتابوں کی جو توضیحی فہرست مرتب کی ہے اس کے دیباچے میں انہوں نے ان سوالوں کا جواب دینے کی کوشش بھی کی ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اقبال کا ذخیرۂ کتب اقبال کی وصیت کے مطابق ان کی وفات کے فوراً بعد اسلامیہ کالج لاہور کو دے دیا گیا تھا لیکن جب انجمن حمایت اسلام نے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا[1] تو یہ اس انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں رکھ دیا گیا۔ اس موقع پر بعض ایسی کتابیں بھی اس میں شامل ہو گئیں جو اقبال کی زندگی میں شائع نہیں ہوئی تھیں لہٰذا جب اسلامیہ کالج سول لائنز قائم ہوا اور اس کے پرنسپل پروفیسر حمید احمد خان مقرر ہوئے تو ان کی کوشش سے یہ سب کتابیں اس کالج کی لائبریری میں منتقل ہو گئیں یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ کے ذخیرہ کتب میں اب دو قسم کی کتابیں ملتی ہیں ایک قسم کی کتابیں تو وہ ہیں جو اقبال کی وصیت کے مطابق اسلامیہ کالج کو دی گئیں اور دوسری قسم کی کتابیں وہ ہیں جو بعد میں اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے لیے بہم پہنچائی گئی تھیں[1]۔

---

[1] اقبال نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ قائم کرنے کی خواہش کا اظہار فرمایا تھا ۹ جنوری ۳۸ء کو یوم اقبال منایا گیا تو سر سکندر حیات خان نے مسلم برادر ہڈ کے نام اپنے پیغام میں کہا کہ شیدائیان اقبال کو اس موقع پر علامہ اقبال کی خدمت میں تھیلی پیش کرنی چاہیے۔ اقبال اس وقت شدید علیل تھے انہوں نے یہ سن کر بیان دیا کہ انہیں کسی تھیلی کی ضرورت نہیں اگر قوم ان کی قدر کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ ان کی تعلیمات کی اشاعت ہو تو اسے چاہیے کہ اسلامیہ کالج لاہور میں اسلامک ریسرچ (باقی بر صفحہ ۲۶۴)

۱۹۶۲ء میں جب شعبہ فلسفہ کے پروفیسر سعادت علی خان نے اس وقت کے پرنسپل جناب حمید احمد خان کے ایما پر ان کتابوں کی فہرست تیار کی تو ان کے پیشِ نظر وہ تمام کتابیں تھیں جو اقبال کولیکشن میں موجود ہیں۔ ان کی تیار کردہ فہرست اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور کے مجلہ "فاران"[۵] میں شائع ہوئی تھی۔ فہرست کے آغاز میں جو تعارفی نوٹ دیا گیا تھا اس کی مندرجہ ذیل سطور سے اندازہ ہوتا ہے کہ کالج کی انتظامیہ کو اس ذخیرے کی اہمیت کا اندازہ تھا۔

"اقبال ہمارے قومی شاعر ہیں انہوں نے اپنی لائبریری کا ایک بڑا حصہ ہمارے کالج کو عطا کر دیا تھا یہ ذخیرہ ہمارے ہاں" Iqbal Collection" کے نام سے الگ طور پر محفوظ ہے۔ یہ کتابیں عام طور پر لائبریری کے اراکین کو مستعار نہیں دی جاتیں۔"[۶]

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶۳) انسٹی ٹیوٹ قائم کرے جس کے ذریعے عصر حاضر میں اسلام کی اصل تعلیم واضح اور مؤثر صورت میں پیش کی جائے۔ اقبال نے اپنی جیب سے ایک سو روپیہ کا چندہ بھی دیا (حرف اقبال، صفحہ: ۲۳۱-۲۳۲) اقبال کی وفات کے بعد انجمن حمایت اسلام لاہور کی جنرل کونسل نے ۱۳ مئی ۱۹۳۸ء کے اجلاس میں اقبال کی یادگار کے طور پر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے انتظامات کے سلسلے میں چوہدری محمد حسین کی سربراہی میں ایک کمیٹی بھی قائم کی گئی۔ بعد کے چند اجلاسوں میں بھی اس انسٹی ٹیوٹ کا تذکرہ ملتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا یا نہیں اور اگر قائم ہوا تو کس انداز پر اور اگر نہیں تو پھر اقبال کے ذخیرہ کتب میں شامل بعض کتابوں پر اس انسٹی ٹیوٹ کی مہر کیسے لگی؟ ایسے سوالات ہیں جن کے جوابات ہنوز تاریکی میں ہیں۔

میں نے جب فہرست دیکھی تو مجھے پہلی نظر ہی میں اندازہ ہو گیا کہ یہ مطالعہ اقبال کے سلسلے میں بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے اس لیے میں نے اس کو مختصر تعارف کے ساتھ ۱۹۷۴ء میں اپنی کتاب Mementos of Iqbal میں شامل کر لیا۔ اس فہرست کو دیکھ کر بعض ماہرین کو اقبال کے اس ذخیرہ

کتب کا پہلی مرتبہ علم ہوا اور انہوں نے اس سے استفادہ بھی کیا۔ ۱۹۷۷ء میں جناب ذوالفقار احمد تابش نے اصرار کیا کہ مختصر اردو تعارف کے ساتھ یہ فہرست انہیں مہیا کروں میں نے فہرست تیار کرکے انہیں دے دی اور انہوں نے اس کو نومبر ۱۹۷۷ء میں ماہنامہ کتاب لاہور کے اقبال نمبر میں شائع کیا۔ گو اس وقت بھی مجھے احساس تھا کہ یہ فہرست کئی اعتبار سے ناقص ہے لیکن اس کی تصحیح اور ترتیب تو ایک ایسا کام تھا جس کے لیے لاہور میں مسلسل قیام ناگزیر تھا۔ خدا بھلا کرے پروفیسر محمد صدیق کا جن کی وساطت سے ان کتابوں کی توضیحی فہرست مرتب ہوئی ہے اور جسے ۱۹۸۳ء میں اقبال اکیڈمی لاہور نے شائع کیا ہے[۱] پروفیسر صدیق کے اپنے قول کے مطابق انہوں نے اس کام میں کئی سال صرف کیے ہیں لیکن خیال رہے کہ اس فہرست میں وہ کتابیں شامل نہیں ہیں جو اگرچہ بعد میں وارد ہوئیں لیکن اب اقبال کے ذخیرۂ کتب کا حصہ ہیں اور پھر یہ کہ ابھی تک بعض اغلاط موجود ہیں اس کے باوجود فہرست کے فاضل مرتب کی محنت شاقہ اور اقبال دوستی کی داد نہ دینا یقیناً ناانصافی ہوگی۔ یہ امر خوشی کا باعث ہے کہ انہوں نے اس ذخیرے کو کما حقہٗ اہمیت دی اور اس کے شایانِ شان فہرست مرتب کرکے اقبال شناسی کے شعبے میں ٹھوس علمی خدمت انجام دی ہے۔ اس طرح میری دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ توقع ہے کہ اس سے شائقین بہت استفادہ کر سکیں گے۔ تاہم اس فہرست کو موضوع وار مرتب کرنے کی ضرورت بہر حال موجود تھی۔ اس لیے میں نے ابتدائی فہرست کے انداز کو برقرار رکھتے ہوئے کتابوں کی موضوع وار فہرست از سرِ نو مرتب کی ہے اور حتی الامکان ان

غلطیوں اور خامیوں کو دُور کرنے کی کوشش کی ہے جو ابتدائی فہرست میں موجود تھیں۔ علاوہ ازیں مَیں نے ابتدائی فہرست میں پہلے سے درج کتابوں کے علاوہ اردو فارسی اور عربی کی وہ کتابیں بھی شامل کر لی ہیں جن کی نشان دہی پروفیسر محمد صدیق نے کی ہے۔

اس ذخیرہ کتب کے سلسلہ میں بعض معلومات بہت دلچسپ اور مفید ہیں۔

(۱) موضوع وار کتابوں کی تعداد یہ ہے:

جمالیات	۲	متفرق	۳۶
سوانح	۲۳	تصوف	۲
حیاتیات	۳	فلسفۂ تاریخ	۲
تنقید	۱۹	طبیعیات	۶
معاشیات	۱	قیافہ شناسی	۱
تعلیم	۲	شاعری	۳۸
مضامین	۵	سیاسیات	۳۸
اخلاقیات	۱۳	نفسیات	۲۴
افسانوی ادب	۶۰	کتب حوالہ	۷
تاریخ وجغرافیہ	۳۲	مذہب ودینیات	۴۶
تاریخ فلسفہ	۴	سائنس	۲
قانون	۱۱	عمرانیات	۱۲
ادب	۱	روحانیات	۲
منطق	۶	اردو، عربی اور فارسی کتب	۷

(۲) کتابوں کی کل تعداد ۵۶۴ ہے اور موضوعات کی تعداد ۳۰ کے لگ بھگ ہے

کتابوں کی تعداد اور موضوعات کے تنوع سے ایک نابغہ ہستی کی عادت مطالعہ کا بے حد دلچسپ مطالعہ ہو سکتا ہے، ان کتابوں سے اقبال کی کثرت مطالعہ، دلچسپی کے موضوعات

اور مطالعہ کے طریقے کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۳) ان کتابوں میں اقبال کی اپنی صرف دو کتابیں ملتی ہیں جو ذخیرہ کتب کی اسلامیہ کالج لاہور منتقلی کے بعد شامل کی گئیں۔ کتابیں یہ ہیں:

The Reconstruction of Religious Thought in Islam
Oxord University Press, London, 1938.

مسافر یعنی سیاحت چند روزہ افغانستان، لاہور، ۱۹۳۴ء

(۴) ذخیرہ کتب میں سے سب سے پرانی کتاب یہ ہے:

The Task of Cowper, W James Neslect & Co.,
London, 1855

(۵) ذخیرہ میں جو کتاب سب سے آخر میں شامل ہوئی وہ یہ ہے:

Some Recent Speeches and Writings of Mr. Jinnah.
Edited by Ahmad J.D., Sh. M. Ashraf Lahore, 1942

(۶) انگلستان کے ناشر میکملن کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

(۷) سب سے زیادہ کتابیں ۱۹۲۸ء کی مطبوعہ ہیں۔

(۸) موضوع کے اعتبار سے سب سے زیادہ کتابیں مابعد الطبیعات کی ہیں، کتابوں کی تعداد کا موضوع وار جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کو مذہب، دینیات، نفسیات، سیاسیات، شعر و ادب، تاریخ و جغرافیہ اور سوانح سے خاص دلچسپی تھی۔

(۹) ذخیرہ کتب میں شامل بہت سی کتابوں کے سرورق پر اقبال کے دستخط ہیں، متعدد کتابیں اقبال کی طالب علمی کے دور کی یادگار ہیں۔ کتابوں کی اصل اہمیت اس بنا پر ہے کہ یہ کتابیں مختلف ادوار میں اقبال کے زیر مطالعہ رہیں انہوں نے ان کے حواشی پر نوٹس لکھے مشکل الفاظ کے معانی اور مصنفین کے سوانحی اشارے تحریر کیے قرآن حکیم کی آیات اور اہم کتابوں کے متعلقہ نکات درج کیے۔ یہ نوٹس زیادہ تر پنسل سے لکھے ہوئے ہیں

البتہ کہیں کہیں قلم سے بھی لکھے گئے ہیں جو اگرچہ مدہم پڑ چکے ہیں لیکن صاف اور واضح خط میں ہونے کی وجہ سے بخوبی پڑھے جاسکتے ہیں۔ بہرحال اقبال کے یہ نوٹس ان کے ذہنی ارتقاء کے مطالعے کے ضمن میں بے حد اہمیت رکھتے ہیں۔ مثلاً تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" میں اقبال نے نطشے کے نظریہ تکرار دوام پر بحث کرتے ہوئے زیادہ تر تسناف (R.A. Tasnaf) کی کتاب The Problem of Immorality کے پانچویں باب بعنوان The Doctrine of External Recurrence پر مبنی ہے۔

اقبال کے ذخیرہ کتب میں اس کتاب کا جو نسخہ پایا گیا ہے اس میں انہوں نے متعدد مقامات کو پنسل سے نشان زد کرکے حواشی لکھے ہیں اور باب کے آخر میں (صفحہ ۲۰۸ پر) اپنے ہاتھ سے جو اشارات لکھے ہیں ان کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

(۱) توانائی کا غلط تصور۔

(۲) زمان کا غلط تصور۔ دوری یا مستقیم۔

(۳) لامتناہیت کا غلط تصور۔ لامتناہی کو دوری ہونا چاہیے۔

(۴) نطشے کا تضاد۔ آرزوئے دوام اور تکرار دوام کا تضاد۔

(۵) بدترین قسم کی تقدیر پرستی۔

اس مثال سے اس ذخیرۂ کتب کی علمی قدر و قیمت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

سلہ: پروفیسر محمد صدیق نے یہ تعداد ۳۴۳ درج کی ہے دیکھیے کتاب مذکور۔ بحوالہ ص ۲۹۶

List of Books in English Donated by Allama Dr. Sir Mohammad Iqbal

Aesthetics

S. No.	*Name of the Book*	*Author*	*Publisher and Edition*
1.	The Philosophy of the Beautiful "Being a contribution to its theory, and to a discussion of the Arts"	Knight, William	John Murray, London 1893
2.	The Philosophy of the Beautiful. "Being outline of the history of Aesthetics".	Knight, William	John Murray, London 1895
Biography			
1.	Socrates	Goldley, A.D.	Seeley & Co., London 1896
2.	Four Dialogues of Plato	Jewett, B.	Oxford Clarendon Press 1903
3.	John Mc-Taggart Ellis Mc-Taggart.	Dickinson, G. Lowes	Cambridge University Press London 1931

4.	Talks with Ralph Waldo Emerson	Woodbury, Charles	Kegan Paul London	1890
5.	Mohammad (In German Language)	Grimme. Hubert	Munchen	1904
6.	Mathew Arnold	Saintsbury, George	William Blackwood Edinburgh	1894
7.	Representative Indians	Chatterjee, Lalitmohan	The Popular Agency Calcutta	1931
8.	Controlling Minds of Asia	Iqbal Ali Shah	Herbert Jenking Ltd. London	1937
9.	Tazkirat ul Ulema or a Memoir of the Learned men of Jaunpur, edited by Mohammad Sana Ullah.	Khair uddin Muhammad	Abul Faiz Co. Calcutta	1934
10.	Maulana Shibli & Umar Khayyam	Bhaji Walla, K.P.	I.P. Mission Press Surat	1932
11.	Akbar	Laurence Binyon	Peter Davies Ltd., Edinburgh	1932
12.	Mir Qasim	Chatterji, N.	Indian Press, Allahabad	1940
13.	Aurangzeb and his Time	Faruk. Z.	D.B. Taraporewala Sons & Co., Bombay	1935
14.	An Early Mystic of Baghdad	Smith, M.	Shelden Press London	

15.	Alfred Lord Tennyson	Andrew Lang	Sons, Edinburgh	1901
16.	Harun-al-Rashid	Philby, J.	Peter Davies Ltd. P. House K. Bazar Lahore	1973
17.	Alfred Lord Tennyson' A memoir by his son		Macmillan and Co. London	1899
18.	Swinburne	George Edward Woodberry	William Heinemann London	1905
19.	Sri Guru Nanak Dev	Thapar, S.S.	Commercial Union Press Rawalpindi	1904
20	Sher Shah Suri	Z. A. Khan	Civil and Military Gazette, Lahore	1925
21.	Raza Shah	Essad Bey	Hutchinson & Co., London	
22.	Muhammad the Prophet, An Essay	Durrani, F.K.K.	Office of Truth, Railway Road, Lahore	1935
23.	Muhammad the Holy Prophet	Sarwar, G.	Islamic Literature P. House, K. Bazar Lahore	1937

Biology

1. Story of creation	Clodd, Edward	Longmans Green, New York	1898
2. The Evolution of Man. Vol. 1	Haeckel, Ernest	Kegan Paul, London	1883
3. The Evolution of Man. Vol. 2	Haeckel, Ernest	Kagan Paul, London	1883

Criticism

1. Brownings' message to his time "His religion, Philosophy, and Science".	Berdoe, Edward	Sonnenschein London	1906
2. Studies of the mind and art of Robert Browning	Fortheringham, James	Horace Marshall London	1900
3. An Introduction to the study of Browning	Symons, Arthur	Cassell, London	1897
4. Tennyson, Ruskin, Mill and other Literary estimates.	Harrison, Frederic	Macmillan, London	1899
5. The Literary history of England Vol. 1	Oliphant, Mrs.	Macmillan, London	1894
6. -do- Vol. 2	-do-	-do-	1894
7. -do- Vol. 3	-do-	-do-	1894
8. Browning as a Philosophical and religious Teacher	Jones, Henry	James MacLeohose Glasgow	1899

9.	A Handbook to the works of A.L. Tennyson	Luce, Morton	George Bell, London	1895
10.	Browning for beginners	Rain, Thomas	Swan Sonnenschein London	1904
11.	Shelley "An Essay"	Jack, Adolphus Alfred	Archibald Constable London	1904
12.	A History of German Literature	Francke, Kuno	Henry Hoit New York	1907
13.	Criticism, reflections and Maxims of Goethe. Translated by W.B. Ronnfeidt	Goethe, Johann Wolfgang Von	Walter Scott London	
14.	A History of Persian Language and Literature at the Mughal Court, (with a brief survey of the growth of Urdu Language) Babur to Akbar Pt. II. Humayun	Ghani, M. A.	Indian Press Allahabad	1930
15.	-do- Pt. III Akbar	-do-	-do-	1930
16.	Hali's Poetry : A study	Jauli T.	D. B. Taraporewala Sons, Bombay	1938
17.	Modern Humanists	Robertson. John M.	Swan, London	1901

18.	The Makers of Modern Poetry. "A Popular Hand book to the Greater Poets of the Century"	Dawson, W.J.	Hodder & Stoughton London	1899
19.	A Book of Homage to Shakespeare	Gollancz, Israel	Humphrey Milford London	1916

Economics

1.	The Right to the whole produce of Labour "The origin and develoment of the theory of labour's claim to the whole product of industry"	Menger, Anton	London	1899

Education

1.	Genetic Psychology for teachers	Judd, Charles Hubbard	Edward Arnold London	1903
2.	The higher education as a training for business	Judson, Harry Pratt	University of Chicago Press, Chicago	1911
3.	The Secret of Harbart "An essay on education and reply to Prof. James of Harvard.	Hayward, F.H.	Swan Sonnenschein London	1904
4.	Education. "Intellectual, Moral and Physical"	Spencer, Herbert	William & Norga London	1891

5.	The place of industries in elementary education	Dopp, Katharine Elizabeth	University Press Chicago	1891
6.	The Idea of University	Newman, John Henry Cardinal	Longmans Green London	1891

Essays

1.	Essays Vol. I	Emerson, Ralph Waldo	David Mackay, Philadelphia	1888
2.	Essays Vol. II	-do-	-do-	1888
3.	Essays of Montaigne, Edited by Percival Chubb	Montaigne	Walter Scott. London	
4.	Essays edited bp William Clarke	Mazzini, Joseph	-do-	
5.	Essays, Literary, Moral and Political	Hume, David	Ward, Lock and Bowden, London	

Ethics

1.	Psychology of the moral self	Bosanquet, B.	Macmillan, London	1897
2.	Kantian Ethics and the ethics of evolution. "A critical study"	Schurman, J. Gould	William and Norgate London	1881

3.	*First Principles*	Spencer, Herbert	D. Appleton New York 1890
4.	Constructive Ethics. "A review of Modern Moral Philosophy in its three stages of Interpretation, Criticism and Reconstruction".	Courtney, W. L.	Chapman & Hall London 1886
5.	A study of ethical principles	Seth, James	W. Blackwood Edinburgh 1905
6.	The Ethical Philosophy bf Sidgwick	Hayward, F.H.	Swan Sonnen Schein & Co., 1901
7.	A short history of ethics "Greek and Modern"	Rogers, A. P. Reginald	Macmillan London 1911
8.	The moral life and moral worth.	Sorley, W. R.	Cambridge University Press, London 1911
9.	A review of the systems of ethics founded on the theory of evolution	Williams, C.M.	Macmillan London 1893
10.	Religion and morality. "Their nature and mutual" relations, historically and doctrinally considered	Fox, James, J	Willam H Young New York 1900

11.	A History of English Sexual Moral	Block I	Francis Aldor, London	1936
12.	Sexual Ethics	Ford, August	The New Age Press London	1908
13.	The Nicomachean Ethics of Aristotle translated by F. H. Peters.	Aristotle	Kegan Paul London	1894
	Fiction			
1.	Moon beams from the larger Lunacy	Leacock, Stephen	John Lane London	1916
2.	A book of Homage to Shakespeare	Gollance, Israel	Humphrey, Milford London	1916
3.	The undying fire	Wells, H. G.	Cassell, London	1920
4.	Waveriey or Tis Sixty years since	Scott, Sir Walter	Cassell, London	1907
5.	The adventures of Hajji Baba Ispahan	Morier, James,	Oxford University Press London	1923
	History and Geography			
1.	The Mediterranean "Seaports and Sea Routes", Handbook for Travellers	Baedeker, Karl	Karl Baedeker Leipzig	1911
2.	Akbar	Laurence Binyon	Peter Davies Ltd Edinburgh	1932

3.	Mirat-i-Ahmadi Part I	Hassan, M. M.	Baptist Mission Press, Calcutta	1922
4.	The Partition of Turkey : a diplomatic history 1913—1923	Howard, Harry N	University of Oklahoma Press Norman	1931
5.	Short History of the Fatimid Caliphate	O' Leary	Kegan Paul & Co. London	1923
6.	Central Structure of the Mughal Empire	Ibn-i-Hussain	University Press Oxford	1936
7.	Stories from the History of Rome	Beesly, Mrs.	Macmillan London	1923
8.	The History of the Decline and Fall of the Roman Empire. Vol. I	Gibbon, Edward	Oxford University Press	1907
9.	-do- Vol. II	-do-	-do-	
10.	-do- Vol. III	-do-	-do-	
11.	-do- Vol. IV	-do-	-do-	
12.	-do- Vol. V	-do-	-do-	
13.	-do- Vol. VI	-do-	-do-	
14.	-do- Vol. VII	-do-	-do-	

15.	Der Erste Kreuzzug. The First Crusade. English Translation by Wilhelm Wagner	Raumer, F. Von	Cambridge University Press, Cambridge	1882
16.	England	Inge, William Ralph	Ernest Benn London	1926
17.	Napoleon and Russian Campaign	Tolstoi, L.N.	W. Scott & Co. London	1926
18.	Turkey and Eastern Question	Macdonald, John	T.C. and E.C. Jack London	
19.	Glimpses into Modern Turkey	Chelebi, E.R.	Makhdumi Library Calcutta	1940
20.	The making of India	Keene, Henry George	Indian Press Allahabad	1896
21.	An Arab Account of India in the 14th Century	Spies, O		
22.	Crescent in India	Sharma, S. R.	Karnatak Publishing House Bombay	
23.	Brief History of Persia	Majid, S. A.	Indian Press Allahabad	1929
24.	Ahsanu't Tawarikh Vol. I	ed : by Seddon, G.N.	Oriental Institute, Baroda	1931
25.	Foundation of the Ottoman Empire	Edile, H.	Maktaba Jamia Millia Islamia Delhi	

26. Conflict of East and West in Turkey	Edile, H.	Maktaba Jamia Millia, Islamia Delhi	
27. The Abbasides. Part I. The period of aggrandisement together with six lectures on the Collapse of the Omayyad Empire	Jalal Uddin Qazi	A. M. Zaman Bros, Publishers Moradabad	
28. Emancipation of Egypt translated from Italian	A. Z.	Chapman & Hall Ltd. London	190
29. Secret History of the English occupation of Egypt	Blunt, Wilfred	T. Fisher London	1907
30. Making of Modern Egypt	Colvin, A	Seeley & Co. Ltd., London	1906
31. Muhammadan Emirates of Nigeria	Hogben, S. J.	University Press Oxford	1930
32. History of Jahangir	Prasad, B	Indian Press Allahabad	1940

History of Philosophy

1. A Critical history of Greek Philosophy	Stace, W.T.	Macmillan London	1920
2. The Systems of Indian Philosophy	Muller, F. Max	Longmans Green London	1899

3. Modern philosophers, "Lectures delivered at the University of Copeuhagen during the autumn of 1902 and lectures on Bergson deliverd in 1913 Translated by by Alfred C. Mason.	Hoffding, Harald	Macmillan, London	1915
4. Literary history of Sanskrit Buddhism	Nariman, G. K.	D. B. Taraporevala Bombay	1920

Law

1. An Introduction to the Study of Mohammadan Law	Fyzee, A.A,A.	Oxford University Press	1931
2. Musalman Law of Waqf	Fida Hussain	Central India Printing Works Nagpur	1939
3. Elements of Law. "Principles of general jurisprudence"	Markby, Sir William	The Clarendon Press Oxford	1896
4. The Date of Jurisprudence Edinburgh	Miller, William Galbraith	William Green Edinburgh	1903
5. Administration of Justice during the Muslim Rule in India	Husain, W	University of Calcutta	1934
6. International Law	Smith, F E.	Bedford Street London	1903

7.	The Philosophy of Proof	Gulson, J. R.	George Rutledges London	1905
8.	Illustrations in advocacy	Harris, Richard	Stevens and Haynes London	1904
9.	The Law relating to bad linelihood	Roy's	Wilkins Press, Calcutta	1903
10.	Criminal responsibility	Mercier, Charles	Clarendon Press Oxford	1905
11.	Punishment and reformation. "An historical sketch of the rise of the penitentiary system"	Wines, Frederick Howard	Swan Sonnenschein London	1895

Literature

1.	Life and Works of Amir Khusrau	Mirza, M. W.	Baptists Mission Press, Calcutta	1935

Logic

1.	Essentials of logic : "Being the Lectures on judgement and inference"	Bosanquet, Bernard	Macmillan London	1895
2.	Elementary lessons in logic deductive and inductive. Copy 1	Jevons, W. Stanley	Macmillan London	1890

3.	Elementary lessons in logic deductive and inductive. Copy 2	Jevons, W. Stanley	Macmillan	1907
4.	Elementary Textbook of Inductive Logic	Shastri, Prabhu Dutt	Macmillan Calcutta	1923
5.	The Logic of Hegel : Translation from the Encyclopedia of the Philosophical science".	Wallace, William	Clarendone Press Oxford	1892
6.	Picture Logic	Swinburne, Alfred James	Longmans, London	1899

Metaphysics

1.	Brahmadarsanam or intuition of the Absolute : "Being an introduction to the study of Hindu Philosophy"	Acharya, Sir Ananada	Macmillan London	1917
2.	Elements of general philosophy "edited by Davids F. R. from the notes of the Lectures delivered at the College 1870—1892"	Robertson, George Groom	John Murray London	1896
3.	Three Lectures on the Vedanta Philosophy delivered at the Royal Institution in March 1894	Muller, F. Max	Longmans Green London	1894

4. Modern theories in philosophy and religion	Tulloch, John	William Blackwood London	1884
5. Tragic Sense of Life in Men and in Peoples	Unomund, M. D.	Macmillan & Co., London	1921
6. Space, Time and Deity. Vol. I	Alexander, S.	Macmillan, London	1920
7. Space. Time and Deity. Vol. II "The Gifford Lectures at Glassgow 1916—1918"	-do-	-do-	1920
8. Meeting of extremes in Contemporary Philosophy	Bosanquet, Bernard	Macmillan London	1921
9. Introduction to philosophy	Fullerton, George	Macmillan, New York	1908
10. The Tyranny of Time Einstein or Bergson ? Translated from French by E.E. Founder D. Albe	Nordmann, Charles	T. Fisher Unwin, London	1925
11. Tertium Organum : "The third canon of thought : a key to the engimas of the world" : Translated from Russian by Nicholas Bessaraboff and Claude Bragdon	Ouspensky, P.D.	Kegan Paul London	1926

12.	Philosophy and the new physics. "An essay on the relativity theory and theory of quanta" translated by Morton Masius	Rougier, Louis	George Routledge London	1921
13.	The Philosophy of "As if" "A system of theoretical, practical and religious fictions of mankind" translated by C.K. Ogden	Vaihinger, Hans	Kegan Paul London	1924
14.	The Grammar of Life	Wrench, G. T.	William Heinemann London	1908
15.	The Emergence of Life. " Being a treatise on mathematical philosophy and symbolic logic by which new theory of space and time is evolved"	Burke, John Butler	Oxford University Press London	1931
16.	The metaphysical foundations of modern physical science "A historical and critical essay"	Burtt, Edwin Arthur	Kegan Faul London	1925
17.	The Elements of Metaphysics. Translated from German by C.M. Duff.	Deuseen, Dr. Paul	Macmillan, London	1894
18.	Lectures on metaphysics and Logic. Edited by H. C. Mansel and M. A. Edinburgh. Vol. I	Hamilton, Sir William	William Blackwood London	1849

19.	Lectures on metaphysics and Logic Edited by H. C. Mansel and M. A. Edinburgh. Vol. II	Hamilton, Sir William	William Blackwood London	1849
20.	-do- Vol. IV	-do-	-do-	1850
21.	A Scientific demonstration of the future life	Hudson, Thomson Jay	G. P. Putman, London	1296
22.	The System of animate nature Vol. I	Thomson, J. Arbur	Williams and Norgate, London	1920
23.	The System of animate nature Vol. II	Thomson, J. Arthur	Willimas & Norgate London	1920
24.	Consciousness, Life and the Fourth dimension. "A study in Natural Philosophy"	Eriksen, Richard	Gyldendal London	1923
25.	Science and Creation : "The Christian interpretation"	D'Arcy, Charles F	Longmans Green New York	1925
26.	The Philosophy of spiritual activity. "A modern philosophy of life developed by scientific methods" Translated by Mrs. R. F. Alfred Noernle	Steiner, Rudolph	G. B. Putman London	1922
27.	The Art of creation. "Essays on the self and its powers"	Carpenter, Edward	Allen and Unwin, London	1924
28.	The problem of immortality. "Studies in Personality and Value"	Tsanoff, A. Radoslav	Allen and Unwin London	1924

29.	Mind, Medicine and Metaphysics. "The philosophy of a physician"	Brown, William	Oxford University Press London	1936
30.	Personality. "The begining and end of metaphysics and a necessary assumption in all positive philosophy"	Momerie, Alfred Williams	William Blackwood London	1880
31.	The Problems of individuality	Driesch, Hans	Macmillan London	1914
32.	The Problems of personality. "A critical and constructive study in the light of recent thought"	Merrington, Ernest Northcroft	Macmillan London	1916
33.	The nature of pesonality	Temple, Wiiliam	Macmillan London	1915
34.	Science and immortality	Osler, William	Archibald Constable London	1906
35.	Kant's Critical Philosophy : for English readers	Mahaffy John P.	Macmillan & Co. London	1898
36.	Last words on materialism and Kindred subject. Translated by Joseph Mecabe	Buchner, Ludwig	Watt's & Co. London	1901
37.	Life and matter. "A criticism of Prof. Haeckel's" (Riddle of the Universe)	Lodge. Oliver	William and Norgate London	1905

38.	Modern materialism and emergent evclu-tion	MeDougall, William	Methuen, London	1929
39.	Spiritual pluralism and recent philosophy	Richardson. C.A	Cambridge University Press London	1919
40.	A defence of idealism "some questions and conclusions"	Sinclair, May	Macmillan London	1917
41.	Dualism and monism and other essays	Veitch, John	William Blackwood London	1895
42.	The New Monism	Holt and Others	Macmillan & Co. London	1912
43.	A theory of reality. "An essay in meta-physical system upon the basis of human cognitive experience"	Ladd, George Trumbull	Longmans Green London	1899
44.	Realism. "An attempt to trace its origin and development in its chief repre-sentatives"	Zafar ul Hassan Syed .	Cambridge University Press London	1928
45.	Experience of Reality	Holmes, E.	Richard Cobden-Sanderson, London	1928

46.	A metaphysique of mysticism. "Vedically Viewed"	Svamin, V. Govindacharya	Mysore, Vedagriham	1923
47.	The Philosophy of Mysticism. Translated from the German by C. C. Messey Vol. I	Carl Du Prel	George Redway London	1889
48.	-do- Vol. II	-do-	-do-	
49.	Adversaries of the sceptic or the specious present. "A new inquiry into human knowledge"	Hodder, Alfred	Swan Sonnenschein London	1901
50.	Reality "A new co-relation of science to to religion"	Streeter, Burnett Hillman	Macmillan London	1927
51.	The self, Its Body and Freedom	Hocking, W.E.	Yale University Press London	1928
52.	Mysterious Kundalini. "The physical basis of the "Kundali (Hatha) Yoga" in terms of Western Anatomy and physiology"	Rele, Vasant, G	D.B. Taraporevala Sons, Bombay	1929
53.	Studies in the psychology of the mystics. Translated by Algar Thorold	Marechal. Joseph	Burns Oates London	1927

54.	Locke edited by William Knight	Fraser, Alexander Cambell	William Blackwood Edinburgh	1890
55.	Reformed Logic : "A system based on Berkeleys Philosophy"	Mc-Lachlan, D.B.	Swan Sonnenschein London	1892
56.	HUME (David)	Knight, William	William Blackwood London	1886
57.	An Examination of Sir William Hamilton's philosophy and of the Principal philosophical questions discussed in his writings	Mill, John Stuart	Longmans Green London	1889
58.	Kant (Immanuel)	Wallace, William	William Blackwood London	1896
59.	Origin and significance of Hegel's logic, "A general introduction to Hegel's system"	Baillie, J.B.	Macmillan London	1901
60.	Kant and his English critics " A comparison of critical and empirical philosophy"	Watson, John	James Maclehose Glasgow	1881
61.	From Hegel to Marx. "Studies in the intellectual development of Karl Marx"	Hook, Sidney	Victor Gollancz London	1936

62.	Hegel and Hegelianism	Mackintosh, R	T.T. Clark Edinburg	1903
63.	Studies in the Hegelian dialectic	Mc-Taggart, John Mc-Taggart Ellis	Cambridge University Press, London	1896
64.	Secret of Hegel "Being the Hegelian system in origin, principle, form and matter"	Sterling, James Hutchinson	Edinburgh, Oliver and Boyd	1898
65.	Hegelianism and personality	Seth, Andrew	William Blackwood Edinburgh	1893
66.	A holiday with a Hegelian	Sedlak, Francis	A.C. Field London	1911
67.	The social philosophy and religion of Comte	Caird, Edward	James Maclhose Glasgow	1893
68.	Bergson and his philosophy	Gunn, J. Alexander	Methuen London	1920
69.	Iqbal's Educational Philosophy	Saiyidain, K G.	S. M. Ashraf Kashmiri Bazar, Lahore	
70.	The point of view. ' an anthology of religion and philosophy selected from the works of Paul Carus edited by Cooh. C	Carus, Paul	Open Court Publishing Co., Chicago	1927

71.	Man's consciousness of immortality	Mackenize W. Doughlas	Harvard University Cambridge	1929
72.	Persian Mystics	Jogendra Singh	John Murray, A Street, London	1939
73.	Three treatises on mysticism. Translated by Otto Spies and S.K. Khatak	Maqtul, Shahabuddin Suhrawardi		1935
74.	Mujaddid's Conception of Tawhid	Faruqi, B.A.	S. M. Ashraf Kashmiri Bazar Lahore	
75.	Reconstruction of Religious Thought Islam	Iqbal, M.	Oxford University Press London	1934
76.	The theory of mind as pure act. Translated into English H. Wildon Carr.	Gentile, Giovanni	Macmillan London	1922
77.	Philosophy of the Quran	Sarwar	Sh. M. Ashraf, Kashmiri Bazar Lahore	
78.	Space, Time and Deity. Vol. I	Alexander, S.	Macmillan London	1920
79.	Space, Time and Deity. Vol. II "The Gifford Lectures at Glassgow 1916—18"	-do-	-do-	1920

80.	Idealistic Reaction against Science, translated by Agness McCaskill	Prof. Aliota	-do-	1914
81.	The nature of the physical world	Eddington, A. S.	University Press Cambridge	1929
82.	"Substance and function and Einsteins' theory of relativity. Translated by William Curtis Swabey	Cassirer, Ernest	Open Court Pub. Chicago	1923
83.	The reign of relativity	Haldane, Viscount	John Murray London	1921

Miscellaneous

1.	Sibylla or "The revival of Prophecy"	Mace. C. A.	Kegan Paul London	—
2.	Laughter : "An essay on meaning of comic" Translated by Cloudesly Breseton and Fred Rothwell	Bergson, Henri,	Macmillan London	1911
3.	Human Intercourse	Hamerton, Philip Cibert	Macmillan, London	1906
4.	Problems of the future and essays	Laing, S	Chapman & Hall, London	1895
5.	Some Recent Speeches and Writings of Mr. Jinnah	Edited by : Ahmad, J.D.	Sh. M. Ashraf K. B. Lahore	19[illegible]2

6.	America Conquers Britain. "A record of economic war"	Denny, Ludwell	Alfred A. Knoff London	1930
7.	Vindication of the Rights of Women	Renuell	-do-	
8.	Icarus or the future of science.	Russell, Bertrand	Kegan Paul London	1926
9.	Galileo or the Tyranny of Science	Sullivan J. W. N	-do-	
10.	Science and theology : "Their common aims and methods"	Westaway, F. W.	Blackie London	1910
11.	Science and a future life with other essays	Myers, F. W. H	Macmillan London	1901
12.	The life of Space. Translated by Bernard Miall.	Maeterlinck, Maurice	George Allen Unwin London	1928
13.	Relativity : The special and the General theory. Translated by Robert W. Lawson	Einstein Albert	Methuen, London	1920
14.	The Gerneral principles of relativity	Carr, H. Wilson	Macmillan, London	1920
15.	Einstein the Searcher, His work explained from dialogues with Einstein. Translated by Henry L. Brose	Mosztowski	Metuen London	1921

16.	Space and time in Contemporary Physics. "An introduction to relativity and gravitation. Translated by Henry L. Brose.	Schlick, Moritz.	The Clarenden press Oxford.	1920
17.	The Ideas of Einstein's theory. "The theory of relativity in simple language" Translated by Rhoda A. B. Russell.	Thirring, J. H.	Methuen London	1921
18.	The Ethics of the Dust	Ruskin, John	George Allen, London	1898
19.	A Commentary on Tennyson's 'In Memoriam.'	Bradley. A. C.	Macmillan, London	1902
20.	A Companion to 'In Memoriam'	Chapman, E. R.	-do-	1888
21.	Letters from abroad	Tagore, R	Madras, S. Ganesan	1924
22.	The prose writings of H. H edited by Havelock Ellis	Heine, Heinrich.	Walter Scott. London	
23.	The Laocoosn, and other prose writings of lessing ed. by W. B. Ronnfeldt	Lessing.	London	
24.	The Evolution of the Aryan. Translated from German by A. Drucker.	Ihering, Rodolph Von	London Swan Sonnenschein.	1897

25.	The Decline of the West. "Form and actuality" Translated by Charles Francis Atkinson. Vol. I	Spengler, Oswald	George Allen & Unwin London	1920
26.	The Decline of the West. Perspectives of Wold History Translated by Charles Francis Atkinson. Vol. II	-do-	-do-	1928
27.	The Purpose of History	Woodbridge, F. J. E.	Columbia University Press New York.	1916
28.	The Soul of a People	Fielding, H	Macmillan London	1898
29.	Eothen	Kinglake, Alexander William.	George Routledge London	
30.	Lectures on Arabic Historians	Margotionth, P.S.	Herbert Jenking Ltd. London	1937
31.	Recueil de Texts Indits	Massignon, Louis	Librarie Orientaliste Paris	1929
32.	Court Poets of Iran and India	Masani, R.P.	New Book Co, Bombay	1938
33.	Glavigo	Translated by : Strange, G.	George Routledge & Sons, London	

34.	Alberuni's India, Vol. I	Elucidated by : Sachan, E.C.	Kegan Paul & Co. London	
35.	The pageant of Persia	Filmer, H.	-do-	
	Mysticism			
1.	Sufism its Saints and shrines. "introduction to the study of Sufism with special reference to India"	Subhan. John	Publishing House Lucknow.	1938
2.	An Introduction to the History of Mysticism	Smith, Margaret	Macmillan London	1930
	Philosophy of History			
1.	Consolidation and decline.	Salter, Charles Neeld	Kegan Paul London	1903
2.	Hegel's philosophy of the state and of History	Morris, George S.	S. C. Griggs Chicago	1887
	Physics			
1.	The fourth dimension simply explained "A collection of essays selected from those submitted in the scientific America's Prize competition".	Manning, Henry P. ed.	Methuen London	1921

2.	Theory of Relativity	Einstein. A., translated by Swabey, W.D. and Swabey, M. C.	Methuen & Co, London	1920
3.	From Kant to Einstein	Montmorency	W. Haffer, Cambridge	1926
4.	Easy lessons in Einstein	Slosson, Edwin, E.	George Routledge London	1920
5.	Relativity and the Universe. "A popular introduction into Einsteins' theory of space and time". Translated by Karl Wichmann.	Schmidt. Harry	Methuen, London	1921
6.	The ideas of Einsteins' theory. The theory of relativity in simple language". Translated by Rhoda A. B. Russell.	Thirring, J. H,	Methuen, London	1921

Physiognomy

1.	The Mongol in our midst. "A study of man and his three faces"	Crookshank, F. G.	Kegan Paul, London	1925

Poetry

1.	The Golden Treasury	Palgrave, Francis T.	Macmillan, London	1904

2.	The Poems of E. Browning	Barrett, E. Browning	Frederick Warne, London	1850
3.	The Song of Silence	Swami Sbri Purohit	V. S. Chitale, Poona.	
4.	The Cycle of Spring	Tagore, Rabindranath	Macmillan. London	1923
5.	Milton's Lycidas	Milton.	Blackie, London	1902
6.	The Satires of Dryden	Collins, J. C.	Macmillan, London	1903
7.	Pope's Rape of the Lock. Edited by F. Ryland	Pope	Blackie, London	
8.	The poetical works of Thomas Gray and essays on criticism, Rape of the lock and Essay on man by Pope.	Pope, A	George Routledge, London	1895
9.	The Task	Cowper, W.	James Nesbet & Co., London	1855
10.	The Poetical works of W. Wordsworth edited by William Knight Vol. I	Wordsworth William	William Paterson Edinburgh	1882
11.	-do- Vol. II	-do-	-do-	
12.	-do- Vol. III	-do-	-do-	

13.	The Poetical works of W. Wordsworth edited by William Knight Vol. IV	Wordsworth William	William Paterson Edinburgh	1982
14.	-do- Vol. V	-do-	-do-	
15.	-do- Vol. VI	-do-	-do-	
16.	-do- Vol. VII	-do-	-do-	
17.	-do- Vol. VIII	-do-	-do-	
18.	Primer of Wordsworth, with a critical essay	Magnus, Laurie	Methuen, London	1897
19.	The Poetical Works of Robert Browning Vol. I	Browning, Robert	Smith Eldger, London	1896
20.	-do- Vol. II	-do-	-do-	
21.	Shelley's Poetical Works, Vol. I	Foreman, H. B.	Reeves & Turner, London	1886
22.	-do- Vol. II	-do-	-do-	
23.	In Memoriam	Tennyson, A	Hoddr and Stoughton London	1901
24.	The Works of Alfred Lord	Tennyson, A.	Macmillan & Co., London	1900

25.	Poems. V. III	Emerson, Ralph Waldo	Macmillan, London	1897
26.	The Poetical Works of Robert Browning Vol. I	Browning, Robert	Smith Eldger, London	1896
27.	-do- Vol. II	-do-	-do-	
28.	Lyrical Poems	Austin, Alfred	Macmillan & Co. London	1896
29.	Faust (in German Language)	Goethe	Der Verlag Berlin.	1929
30.	Faust ed by Calvin Thomas	Goethe	D.C. Heath, London	—
31.	The Rose Garden of Persia	Castello, Louisa Stuart.	Gibbings London	1899
32.	Ballads and Sonnets	Rossetti, Dante Gabriel	Ellis, London	1882
33.	Virgil's Aeneid. Translated by John Dryden.	Virgil.	George Routledge, London	1895
34.	Indian Ballads	Waterfield, William	Panini Office, Allahabad.	1913
35.	Lovers' gift and crossing	Tagore, R	Macmillan, London	1905
36.	Fruit Gathering	Waterfield, William	Panini Office Allahabad.	1923

37.	Stray Birds	Tagore, R	Macmillan London	1923
38.	Earth	Townshend, Frank	Knoff, London	1929
39.	Selection from the Poetry of the Afghans. "From 16th Century to 19th Century"	Raverty, H. G.	Williams Norgate London	1862

Political Science

1.	Constitutional Developments in the Islamic World.	Ghosh. R. C.	The Book Co. Ltd, Calcutta	1941
2.	Selections from Treitachke's Lectures on Politics. Translated by Admn L. Gowans.	Treitachkə	Gowans & Gray London	1914
3.	A Century of Political Development	Macpherson, Hector	William Blackwood Edinburg	1908
4.	Government	Mc Arthnr, J. N.	Longmans Green London	1892
5.	The State and the Individual. " An introduction to political science, with special reference to socialistic and individualistic theories".	M'kechanie William Sharp	James Maclehose Glasgow	1896

6.	Politics and Islam	Bukhsh, S. K.	Baptist, Mission Press Calcutta	
7.	Independent Egypt	Bcy, A. Y.	John Murray, A. Start London	1940
8.	Some important Indian problems	Sir, Mohammad Shafi	Modern Electric Press Lahore	1914
9.	Politics in Pre-Mughal Times	Topal	Kitabistan, Allahabad and London	1938
10.	Towards democracy	Clarke	Swan Sonnenachein London	1905
11.	Unforeseen tendencies of Democracy.	Godkin, Edwin Lawrence	Archibald Constable Westminister	1903
12.	Democracy and empire with studies of their psychological, economic and moral foundations.	Giddings, Franklin Henry	London	1901
13.	Democracy and reaction	Hobhouse, L. T.	T. Fisher Unwin London	1904

14.	Democracy versus Socialism "A critical examination of Socialism as a remedy for social injustice and an exposition of the single tax doctrine"	Hirsch, Max	Macmillan, London	1904
15.	England and the Moslem World "Articles, addresses and essays on Eastern subjects.	Majid, Syed H. R. Abdul Majid.	Yorkshire Printing Co. New York	1912
16.	The Indian Moselms	An Indian Muhammedan	Ardenne Publishers London	1928
17.	Theory of the State	Bluntschli, H. K	Clarendon Press Oxford	1901
18	The Libral State : a speculation.	Whittaker, Thomas	Watts, London	1907
19.	World politics : At the end of nineteenth century as influenced by the oriental situation.	Reinsch, Paul S	Macmillan New York	1904
20.	The spiritual basis of democracy. With an introduction by Bertrand Russell.	Wellock, Welfred	S. Ganesan Madras	1924
21	Making of Modern Iraq	Foster, H. A.	University of Oklahoma Press, Norman	1931

22.	Mussalman Culture. Translated from Russian by Shahid Suhrawardy	Bartold, V.V.	University, Calcutta	1934
23.	The History of the Foreign Policy of Great Britain.	Burraws, Montague.	William Blackwood Edinburgh.	1897
24.	World politics in modern civilization "The contributions of Nationalism. Capitalism, Imperialism and Militarism to Human culture and International anarchy"	Barnes, Harry Elmer.	Alfred A. Knoff. New York	1930
25.	Lectures on the Principles of Political Obligation.	Green, Thomas Hill	Longmans Green New York	1907
26.	The economic foundations of Society. Translated by Lindley M. Keasbey.	Loria, Archille	Swan, London	1907
27.	An Introduction to the history of Government in India "The British Period"	Anand, Chuni Lal	The Punjab Printing Works, Lahore	1923
28.	Civil Government for Indian Students.	Morris, William	S.C. Sanial, Calcutta	1921
29.	The Biology of British Politics	Harvey, Charles, H	Swan Sonnenschein, London	1904

30.	Studies of Contemporary Superstition.	Mallock, W. H.	Ward E Downey. London	1895
31.	Nationalism	Tagore, Rabindranath	Macmillan, London	1923
32.	History of medieval Civilization	Seignobos, Charles.	T. Fisher, London	1908
33.	The Economic Interpretation of History	Seligman, Edwin, R. A.	Columbia Uuiversity Press, New York	1907
34.	History of Ancient Civilization	Seignobos, Charles	T. Fisher London	1907
35.	The Development of Western Civilization	Forrest, J. Dorsey	Uuiversity. Chicago	1907
36.	Success Among Nations	Reich, Emil	Chapman, London	1904
37.	Psychic Factors of Civilization	Ward, L. E.	Ginn & Co. London	
38.	The New spirit in Egypt	Fyfe, H. Hamilton	William Blackwood, Edinburgh	1911

Phychology

1.	Social and ethical interpretations in mental development. "A study in social psychology"	Baldwin, James Mark.	Macmillan, New York	1906

2. Psychology ; 'An introductory study of the structure and function of human consciousness.	Angell, James Rowland	Constable, London	1908
3. Psychology	James, William	Macmillan, London	1892
4. Samadarsana (Synthetic Vision) "A study of Indian Psychology)	Cousins, James H	Ganesh, Madras	1925
5. Mind and personality. "An essay in psychology and philosophy"	Brown, William.	University of London Press, London	1926
6. Essentials of psychology	Radha Krishanan, S	Oxford University Press London	1912
7. Psychology of politics and history	Dewe, J. A.	Longmans Green, New York	1910
8. Psychology and Common Life	Hoffman. Frank Sargent	Puttman, New York	1903
9. Psycholiogy	James, William	Macmillan Co.	1872
10. Essentals of psychology	Buell, Colin S	Boston, Ginn	1900
11. Elementary psychology	Shastri, Prabhu Dutt.	Longmans Green, London	1920
12. A Manual of psychology.	Stout, G. F.	W.B. Clive, London	1904

13.	An outline of psychology	Titchner, Edward Bradford	Macmillan, New York	1898
14.	A textbook of psychology	-do-	-do-	1910
15.	Analytical psychology. "Presenting the fects and Principles of mental analy s is"	Witmer, Lightner,	Ginn, Boston.	1902
16.	Studies in the evolutionary psychology of feeling	Stanley, Hiram M	Sonnenschein London,	1895
17.	New interpretation of Herrbarts Psychology and educational theory through the philosophy of Leibniz	Davidson, John	William Backwood London	1906
18.	Problems of the Self. "An essay based on the Shaw Lectures given in the University of Edinburgh March, 1914	Laird, John	Macmillan‘ London	1917
19.	Life, a study of self	Maxwell, W. B.	Thornton Butterworth London	1926
20.	The Future of an illusion. Translated by W. D, Robson-Scott	Freud, Sigmund.	Leonard, London	1928
21.	The Making of Character	Maccunn. J.	Cambridge University Press,	1912

22.	Encyclopaedia of Sexual Knowledge edited by Norman Haire	Costler, A. A. Willy and others	Francis Aldor London	1935
23.	Love's coming-of-age. "The relations of the sexes"	Carpenter Edward	Swan Sonnensechein London	1906
24.	The Criminal mind	Fleury, Maurice De	Ward E Downey, Co. London	1901
25.	The Soul of Woman	Lambrose, Gina	Jonathan Cape, London	1924

Reference Books

1.	Black's new and complete German Dictionary	Thieme, F. W. ed	Alexander Black London	—
2.	English Synonyms explained in alphabetical order	Grabb, George	George Routledge, London	—
3.	School German Grammar	Eve, H. W.	David Nutt, London	1903
4.	Lange's new German method. V. II	Lange, Hermann.	Clarendon Press, London	1899
5.	Elementary grammar of the German Language	Otto, Emil	Sampson Low, London	—

6.	German for the English, "First reading Book"	Sonnenschein, A.	Williams and Norgate London	1875

Religion and Theology

1.	The supernatural its origin, nature and evolution Vol. I	King, John H	Williams and Norgate London	1892
2.	-do- Vol. II	-do-	-do-	
3,	The Natural and the supernatural	Oman, John	Cambridge University Press, London	1931
4.	Transcendental Universe	Harrison, C. G.	James, Eliot & Co, London	
5.	Science and the religious life. "A psycho-physiological approach"	Rahn, Carl	Hale University Press New Haven	1928
6.	Religion and modern psychology, "A study of present tendencies, particularly the religious implications of the scientific belief in survival with a discussion on mysticism"	Hill, J. Arthur	William Rider London	1911
7.	The varieties of religious experience and study in human nature".	James, William	Longmans Green New York	1903

8. A study of religion. "Its sources and contents" Vol. I	Martineau, James	Clarendon Press Oxford.	1889
9. A Study of Religion. "Its sources and contents" Vol. II	-do-	-do-	1889
10. The reign of religion in contemporary philosophy	Radha Krishman S.	Macmillan London	1920
11. The foudation of belief. "Being notes introductory to the study of theology"	Balfour, Arthur James.	Longmans Green London	1896
12. The World's religions against war. "The proceedings of the preliminary conference held at Geneva, Sept. 1928 to make arrangements for a Universal Religious Peace Conference.	Atkinson, Henrp, A. ed.	Church Peace Union Paris	1928
13. The analogy of religion to the constitution and course of nature also fifteen sermons	Butler, Joseph	The religious tract Society, London	
14. Essays in the history of religious thought in the West.	Westcott, Brooke Foss.	Macmillan, Londan	1903
15. Religious experience its nature, types and validity.	Bouquet, A. C.	W. Heffer Cambridge.	1932

16.	History of Religion. "A sketch of primitive Religious beliefs and practices, and of the origin and character of the great systems.	Menzies, Allan	John Murray, London	1903
17.	Studies of religious history	Renan, Ernest	William Heinemann London	1893
18.	Religious systems of the world "A contribution to the study of comparative religion". A collection of addresses delivered at South Place Institute, during 1888-1889 and 1891.	Sheowring, W. M. Thies, C. W. ed.	Swan Sonnenschein London	1901
19.	Agnosticism.	Flint, Robert	William Blackwood Edinburgh	1903
20.	Without God. "negative science and natural ethics"	Grey, Percy	Hurse and Blackett London	1913
21.	Some dogmas of religion.	Mc Taggart, J Mc E.	London	1906
22.	Newman's apologia provita sua "the two versions of 1864 and 1965 preceded by Newman's and Kingsley's pamphlets with an introduction by Wilfred Ward.	Newman	Oxford University Press London	1913

23.	The apocrypha : translated out of the Greek and Latin tongues	O.U.P.	Oxford University Press, London 1937
24.	Theism : being the Baird Lecture for 1876.	Robert Flint.	W. Blackwood, and Sons, Edinburgh. 1891
25.	Experience of God. "A brief enquiry into the grounds of Christian Conviction	Farmer, Herbert.	Student Christian Movement Press, London 1929
26.	The attributes of God. "The Gifford Lectures delivered in the University of St. Andrews in the year 1924-25	Farnell, Lewis Richard.	Oxford Clarendon Press London 1925
27.	The meaning of God in human experience "A philosophic study of religion	Hocking, William Ernest.	Oxford University Press London 1912
28.	Prolegemena to theism	Justus.	Andrew H. Kellogg New York 1910
29.	Aspects of Theism	Knight, William	Macmillan & Co. London 1893
30.	Sibyls and seers. "A survey of some ancient theories of revelation and inspiration	Bevan, Edwyn	George Allen & Unwin London 1928

31.	The Sources of Christianity	Kamal ud Diu	Basheer Muslim L'brary Woking.	1925
32.	The trial of Jesus Christ "A legal monograph"	Innes, A. Taylor	T. T. Clark Edinburgh	1905
33.	The endless life	Crothers, Samuel McChord.	Archibald Canstable London	1906
34.	The Eternal Life	Munsterberg, Hugs,	Archibald Constable London	1906
35.	Human immorality. "Two supposed objections to the doctrine"	James, William	-do-	1906
36.	Re-thinking missions. "A layman's inquiry after one hundred yaars.	Hocking, William Ernest	Harper, New York	1932
	"The Gifford Lectures delivered in the University of Glassgow in the years 1920 and 1921	Jones, Henry	Macmillan, London	1922
38.	Pantheism and Christianity	Hunt, John	Wm Isbister, London	1884
39.	Aids to the study of German theology	Matheson, George	T.T. Clark, Edinburgh	1877
40.	The Sisters of the Spinning Wheel and other Sikh Poems original and translated.	Puran Singh	J. M. Dent, London	1921

41.	A brief Sketch of the Zoroastrian religion and customs. "An essay written for the Rahnumai Mazdayasnan Sabha"	Bharucha, E S.D.	D.B. Taraporevala Bombay	1928
42.	The Mysteries of Nithra ; Translated by Thomas J. Mc Cormack from French.	Cumont, Franz.	Open Court Publishing Co., Chichago	1910
43.	Life and teachings of Zoroaster "the great Persian'	Whitney, L. H.	Loren Harper Whitney Chicago	1905
44.	Jewish mysticism and legends of Baalshem. Translated from German by Lucy Gohen.	Buber, Martin	J. M. Dent, London	1931
45.	The Jews of prediction and fulfilment on argument for the times.	Kellogg, Samuel H.	James Nisbet Co. London	1883
46.	The Khilafat	Barakatullah Mohammad	Luzac, London	1925
47.	Notes on Islam by Sir Ahmad Hussain "Nawab Amin Jung" Edited by Mohammad Hussain	Ahmad Hussain (Amin Jung)	Government Central Press Hyderabad Deccan.	1922
48.	The future of Islam	Blunt, Wilfred Scawen	Kegan Paul, London	1882
49.	"An Introduction to the Commentary on the Holy Quran "being an English translation of "Al Bayan.	Haqqani, Mohammad Abdul Haqq.	Thacker, Spink Calcutta	1910

50.	Mohammadanism. "Lectures on its origin, its religious and political growth and its present state.	Hurgronje, C. Snouck	Putmans New York	1916
51.	The Teachings of Islam "A solution of five fundamental religious problems from the Muslims point of view"	Ghulam Ahmad Mirza of "Qadian"	Luzac, London	1910
52.	Leaves from three ancient "Qurans" "Possibly pre-Othmani" with a list of their Variants.	Mingana, Alphonse, Lewis, Agenes Smith.	University Press Cambridge	1914
53.	Islam, "Her moral and spiritual value and psychological study" with a fore-word by Syed Ameer Ali.	Leonard, Arthur Glyn	Luzac London	1909
54.	The Kingdom of Heaven	Mustafa Khan	Islamic World Library, Lahore	
55.	The Cultural side of Islam "A Lecture delivered at Madras in January, 1927	Pickthall, Mohammad Marmaduke.	Hoe & Co., Madras	1927
56.	Einfluses Des Islam	Pischon	F.A. Brookhous Leipzing	1881
57.	The Quranic Gems	Rathor, Ghulam Mohammad	Ripon Printing Press Lahore	1934

58.	An account of the rise and progress of Mahmoetanism with the life of Mahmoet and a vindication of him and his religion from the calumnies of the christians. Edited with an introduction by Hafiz Mahmud Khan Shairani.	Stubbe, Henry.	Luzac, London	1911
59.	The Original Sources of the Quran	Tisdall, W. St. Clair	Society for Promoting Christian Knowledge, London	1905
60.	Der Islam in Neuzehnten Jahrhundert	Vambery, Hermann	F.A. Brockhous Leipzig.	1875
61.	Islam : translated from French by Halida Edib.	Masse, Henri	Putmans, New York	1938
62.	A geographical history of the Quran. Vol. I	Muzaffar ud Din Nadvi	S. Zahid Ullah Nadvi 106 Harrison Road, Calcutta.	1936
63.	Islam at the Cross Roads	Asad, M.	Sh. Muhammad Ashraf K. B.	1941
64.	Message of Islam	Yusuf Ali	John Murray A Street London	1940

65.	The Wisdom of the Quran "set forth in selected verses conveying the moral, religious and social philosophy of Islam. English translation by John Naish.	Muhtar, Katricioglu Mahmud	University Press, Oxford	1937
66.	Religion and the rise of Capitalism ("A historical study" Holland memorial Lectures, 1922)	Tawney, R. H.	John Murray London	1926
	Science			
1.	The bases of modern science	Sulivan, J. W. N.	Ernest Bew, London	1928
2.	Einstein and the Universe. Translated by Joseph McCabe	Nordmann, Charles	T. Fisher Unwin London	1922
	Sociology			
1.	Foundations of Sociology	Alsworth Ross, Edward	Macmillan New York	1905
2.	Introduction to Sociology	Fairbanks, Arthur	Charles Scribners Sons New York	1905
3.	Social Evolution	Kidd, Benjamin	Macmillan, London	1898
4.	The level of social motion. "An inquiry into the future conditions of human society"	Lane, Michael	Macmillan. New York	1902

5.	Graeco – Roman Institutions : "from anti-evolutionist point of view" Roman Law : Classical Slavery, Social Conditions.	Reich, Emill	Parker & Co., Oxford.	1890
6.	Social Laws, "An outline of Sociology"	Trade. G.	Macmillan New York	1904
7.	Outlines of Sociology	Ward, Lester, F	Macmillan New York	1904
8.	Principles of Western Civilization "A sociological study	Kidd Benjamin	Macmillan London	1908
9.	Civilization and Ethics. "The philosophy of Civilization" P. II Translated into English John Naish.	Schweitzer, Albert.	A & C Black, London	1923
10.	The decay and the restoration of civilization "the philosophy of civilization" P. I Translated into English by C.T. Campion.	Schweitzer, Albert.	-do-	1923
11.	Sociology	Saleeby, C. W.	T. C. & E. C. Jack, London	—
12.	The Social mind and education	Vincent, George Edgar.	Macmillan. New York. London	1897
	Spiritualism			
1.	Studies in psychical research	Podmore, Frank.	Kegan, Paul, London	1897
2	Natural law in the spiritual world.	Drummond, Henry	Hodder and Stoughton, London	1888

اردو، فارسی اور عربی کتب

Urdu, Persian and Arabic Books.

۱۹۳۲ء	اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو	ریاست یا تحقیق عدل	افلاطون مترجم ڈاکٹر ذاکر حسین	۱۰
۱۹۱۷ء	لکھنؤ، نولکشور	بحر الفصاحت	محمد نجم الغنی نجمی	۲۰
۱۹۳۴ء	لاہور	مسافر یعنی سیاحت چند روزہ افغانستان	اقبال محمد اقبال	۳۰
۱۹۲۷ء	دہلی جامعہ ملیہ اسلامیہ	عربوں کا تمدن	سیل جوزیف مترجم سید نذیر نیازی	۴۰
۱۹۰۳ء	مصر مطبع المیمنہ	الکنز المدفون والفلک المشحون	شیخ جلال الدین السیوطی	۵۰
۱۹۰۰ء	مصر مطبع المیمنہ	تعلیم المتعلم طریق التعلم	امام برہان الاسلام الزرنوجی	۶۰
۱۸۶۷ء ۱۲۲۳ھ	بمبئی، مطبع فیض رساں	حاجی بابا اصفہانی	موریر جیمینس جسٹینان مترجم شیخ احمد کرمانی روحی	۷۰

علامہ اقبالؒ اور نقاش فطرت ایم اسلم

لاہور میں علامہ اقبالؒ کے جس خاندان سے مراسم بہت گہرے تھے وہ لاہور کا مشہور "میاں" خاندان ہے جو حسن اتفاق سے اقبال کے آبائی وطن کشمیر سے تعلق رکھتا ہے۔ لاہور کے اس معزز خاندان کے ایک بزرگ میاں نظام الدین رئیس اعظم لاہور تھے۔ موصوف آنریری مجسٹریٹ اور انجمن حمایت اسلام لاہور کے اعزازی تاحیات صدر تھے۔ مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے ایک مضمون میں میاں صاحب کے بارے میں لکھا ہے کہ رئیس شہر ہونے کے باوجود انتہائی سادہ مزاج، ہنس مکھ، بے ریا، اور کم گو تھے۔ دوستوں اور قوم کی فلاح و بہبود ان کا مقصد دلی تھا۔ علامہ سے دوستانہ تعلقات تھے وہ آموں کے موسم میں علامہ اقبال کو دعوت دیتے تو علامہ اپنے بعض نیازمندوں مہر، سالک، چودھری محمد حسین اور ڈاکٹر عبداللہ چغتائی وغیرہم کی معیت میں شریک ہوتے۔ علامہ ان لوگوں کو لے کر صبح ہی صبح میاں صاحب کے دولت کدے پر پہنچ جاتے وہاں باغ جانے کے لیے سواریوں پر بیٹھنے سے پہلے ایک ایک گلاس دودھ پلایا جاتا۔ باغ میں کنوؤں کے چہ بچے قسم قسم کے آموں سے بھرے ہوتے علامہ کے لیے چارپائی بچھی ہوتی۔ میاں صاحب علامہ صاحب کے ساتھ بیٹھ جاتے اور سب لوگ آم کھاتے واپسی پر ہر ایک کے اہل خانہ کے لیے ایک ایک ٹوکرا آم بھجوا دیتے۔ میاں نظام الدین مرحوم کے صاحبزادے نقاش فطرت اور معروف ناول نگار ایم اسلم[1] ہیں انہیں یہ خصوصیت حاصل ہے کہ ان کے حقیقی بھانجے میاں صلاح الدین سے علامہ کی صاحبزادی منیرہ کی شادی ہوئی نیز انہیں بڑی کثرت سے علامہ کی صحبت میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی ہے اس کے باوجود انہوں نے

---

[1] ایم اسلم کی ولادت ۶ راگست ۱۸۸۵ء کو ہوئی۔ میٹرک اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ سے (باقی بر ص ۳۲۲)

بعض وجوہات کی بنا پر اپنی یادداشتیں قلم بند کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔ ۱۹۷۱ء میں "جام نو" کراچی کا "ایم اسلم نمبر" شائع ہوا تو اس سے غالباً پہلی مرتبہ ہم ایسے لوگوں کو معلوم ہوا کہ علامہ اقبال سے ایم اسلم کے صرف خاندانی مراسم ہی نہیں ہیں بلکہ وہ علامہ اقبال کی شاگردی کے شرف کے حامل بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جنوری ۱۹۷۳ء کے آغاز میں برادر محترم عابد نظامی صاحب کی معرفت ایم اسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جنہوں نے کمال شفقت سے میرے سوالات کا جواب دیا۔ اس لیے میرے لیے یہ ممکن ہوا کہ میں علامہ اقبال کے بارے میں ان کی یادداشتوں کو مرتب کر سکوں۔

(بقیہ حاشیہ ص ۳۲۱) پاس کیا۔ ۱۹۰۸ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا، ۱۹۱۰ء میں حکومت پنجاب نے لائل پور (اب فیصل آباد) میں پنجاب ایگریکلچرل کالج قائم کیا تو حکومت نے اس کالج کے پہلے سال کے لیے جن تیرہ طلبہ کا انتخاب کیا ان میں ضلع لاہور سے میاں ایم اسلم شامل تھے چنانچہ وہ گورنمنٹ کالج کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر لائل پور چلے گئے گویا میاں صاحب اس کالج کے اولین طالب علموں میں شمار ہوتے ہیں، دو سال کی تعلیم کے بعد انہیں محکمہ انہار میں ضلعدار مقرر کر دیا گیا اس ملازمت کو پانچ سال تک نبھاتے رہے۔ ہندو ایگزیکٹو انجینئر سے اَن بَن ہو گئی اور انہوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اس کے بعد انہوں نے کبھی ملازمت نہیں کی اور افسانوی ادب کی تخلیق میں ہمہ تن مصروف ہو گئے ان کا پہلا ناول "عروسِ غربت" تھا جو دراصل وکٹر ہیوگو کے مشہور ناول لامزرابیل کا ترجمہ تھا، ان کی آخری کتاب "تاک تاز" ہے جس میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے آخری ایام خلافت سے لے کر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ تک چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ پر ایک نظر ڈالی گئی ہے میاں صاحب نے شاعری کی، بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں، انگریزی ناولوں کے ترجمے کیے، طبع زاد افسانے اور ناول لکھے افسانوں کی تعداد سینکڑوں اور ناولوں کی تعداد دو سو سے اوپر ہے ان کی کتابوں کے صفحات کی تعداد کا تخمینہ ایک لاکھ لگایا گیا ہے، میاں ایم اسلم ۲۳ نومبر ۱۹۸۳ء کو لاہور میں فوت ہوئے۔ ہجری سن کے اعتبار سے ان کی عمر ایک سو تین سال پانچ ماہ پندرہ یوم بنتی ہے۔

مولانا حالی اور علامہ اقبال

میاں صاحب کہتے ہیں کہ جب وہ اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ میں پڑھتے تھے تو سکاؤٹ ہونے کی بنا پر ایک مرتبہ ان کی ڈیوٹی انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں سٹیج پر لگی۔ اس جلسہ میں شرکت کے لیے جو مشاہیر قوم تشریف لائے تھے ان میں سر فہرست مولانا الطاف حسین حالی تھے۔ جب وہ نظم پڑھنے کے لیے آئے تو ضعیفی کی بنا پر آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہے تھے۔ ایم اسلم نے انہیں سہارا دے کر سٹیج پر پہنچایا لیکن وہ کمزوری کی بنا پر اپنی نظم نہ سنا سکے۔ علامہ اقبالؒ انہی دنوں انگلستان سے واپس آئے تھے آگے بڑھے اور خود حاضرین جلسہ کو مولانا حالی کی وہ نظم سنائی اور اس سے قبل انہوں نے فی البدیہہ یہ دو شعر پڑھے:

مشہور زمانے میں ہے نام حالی
معمور مئے حق سے ہے جام حالی
میں کشور سخن کا نبی ہوں گویا
نازل میرے لب پر ہے کلام حالی!

علامہ اقبالؒ پروفیسر کی حیثیت سے

میٹرک کرنے کے بعد ایم اسلم صاحب ۱۹۰۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے اسی زمانہ میں علامہ اقبالؒ گورنمنٹ کالج میں پروفیسر[1] کی حیثیت سے

---

[1] اقبال کی معلمانہ حیثیت کے بارے میں ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین کے کچھ تاثرات ڈاکٹر وحید قریشی نے "کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ" (صفحہ ۳۲۸) میں دیے ہیں۔ میاں عطاء الرحمٰن گورنمنٹ کالج میں اقبال سے ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء میں درس لیتے رہے، انہوں نے ایک مضمون میں اقبال کے طرز تدریس پر روشنی ڈالی ہے یہ مضمون انہوں نے ۱۹۴۰ء میں رام پور رضا انٹر کالج کے زیر اہتمام منعقدہ یوم اقبال کی تقریب میں پڑھا تھا بعد میں صالحہ اکبری عرشی کے قلم سے مختصر تعارف کے ساتھ "اقبال کی زندگی کا ایک گم شدہ ورق" کے زیر عنوان سہ ماہی مجلہ "اقبال ریویو" کراچی، جنوری ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔

پڑھاتے تھے اور اس طرح ایم اسلم کو علامہ سے اکتساب علم کی سعادت حاصل ہوئی۔
میاں صاحب کے بیان کی رو سے ان کی جماعت پچیس تیس (۲۵/۳۰) طلبہ پر مشتمل
تھی۔ اور انگریزی کا مضمون دو استاد پڑھاتے تھے۔ پروفیسر گلبرٹ Gilbert
اور پروفیسر محمد اقبال۔ اوّل الذکر کے ذمے انگریزی کی تدریس تھی اور وہ سر والٹر سکاٹ
Sir Walter Scott کا مشہور ناول "اوان ہو" Ivanho۔ اور The
Roman Life in the Days of Cicero پڑھاتے تھے۔ یہ کتابیں بہت دلچسپ
تھیں لیکن ان کا پڑھانے کا انداز ایسا تھا کہ طلبہ جلدی اکتا جاتے تھے۔ پروفیسر
اقبال کے ذمے انگریزی نظم پڑھانا تھا وہ ہفتے میں دو پیریڈ ایف اے کے لیتے
تھے۔ اور اونچی جماعتوں کو فلسفہ پڑھاتے تھے۔ ایف اے کے نصاب میں مشہور
انگریزی شاعر ٹینی سن Tennyson کے کلام کا انتخاب لارئیٹ Laureate
شامل تھا۔ ہر پیریڈ تقریباً پون گھنٹہ کا ہوتا تھا۔ علامہ اس زمانے میں ایک قومی
شاعر کی حیثیت سے منظر عام پر ابھر رہے تھے اس لیے طلبہ ان کا بہت احترام
کرتے تھے اور وہ بھی استاد کی حیثیت سے بڑی محنت سے اپنا لیکچر تیار کر کے
آتے تھے۔ ان کا قاعدہ یہ تھا کہ کمرۂ جماعت میں داخل ہونے کے فوراً بعد طلبہ کی
حاضری لیتے اور اس کے بعد بڑی خوبصورتی اور صفائی سے نظم کا ایک بند Stanza
پڑھتے اور بورڈ پر لکھتے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہر بند کے مختلف حصوں کے
لیے ہم معنی اردو اور فارسی اشعار لکھ دیتے کبھی کبھی اپنے اشعار بھی استعمال کرتے
اور کبھی کبھی عربی کا ایک آدھ شعر بھی لکھ دیتے سب سے پہلے ان اشعار کی اس طرح
تشریح کرتے جس سے ان اشعار کی فنی خوبیوں پر بھی روشنی پڑتی تھی۔ اس مرحلے کے
بعد زیر بحث انگریزی اشعار کی طرف متوجہ ہوتے اور ایسے دلنشین پیرائے میں
ان کا مطلب بیان کرتے کہ تقریباً مکمل مفہوم اور شعری نزاکتیں واضح ہو جاتیں۔
طلبہ بھی لیکچر کے ضروری ضروری نکات ساتھ ساتھ نوٹ کرتے جاتے خصوصاً
جو کچھ علامہ بورڈ پر لکھتے وہ لازماً طلبہ کی بیاضوں میں محفوظ ہو جاتا۔ یہ تمام لیکچر

انگریزی میں ہوتا۔

علامہ اقبالؒ کا یہ قاعدہ تھا کہ سبق تھوڑا پڑھاتے جو عام طور پر ایک بند Stanza سے زیادہ نہ ہوتا اور یہ بند خواہ چھ مصرعوں کا ہوتا یا نو مصرعوں کا۔ جب اپنا موضوع مکمل کر لیتے تو کمرۂ جماعت سے چلے جاتے خواہ ابھی گھنٹی ہونے میں دس پندرہ منٹ باقی ہی کیوں نہ ہوتے۔ دورانِ تدریس وہ ہمیشہ سنجیدہ اور پُر وقار رہتے تھے۔ اور بعض اساتذہ کے طریقِ کار کے برعکس صرف اپنے موضوع ہی سے تعلق رکھتے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں انہوں نے کبھی نہیں کیں اور نہ ٹرخانے کی کوشش کی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہمیشہ تیاری کر کے آتے تھے۔ انہوں نے شاید ہی کسی طالب علم کا آموختہ سُنا ہو۔ وہ کتاب کی قرأت Reading بھی نہیں کراتے تھے۔ بلکہ خود ہی پڑھتے تھے۔ اسی طرح وہ ہفتہ وار یا ماہانہ آزمائشی پرچے لینے کے بھی قائل نہ تھے۔

ان کے پڑھانے کا طریقہ اتنا دلکش تھا کہ غالباً ان کے گھنٹے میں تمام اساتذہ کے مقابلہ میں زیادہ حاضری رہتی جو ان کی مقبولیت اور لیاقت کا منہ بولتا ثبوت تھا وہ پنجابی طلبہ کی کمزوریوں سے پوری طرح واقف تھے اس لیے انگریزی الفاظ کی ادائیگی میں بہت احتیاط برتتے جس سے ایک ایک لفظ آسانی سے سمجھ میں آجاتا۔ ان کے پڑھانے کا طریقہ اتنا مؤثر ہوتا کہ سبق کلاس ہی میں یاد ہو جاتا۔

علامہ اقبال کی ایک دلچسپ عادت تھی وہ کمرۂ جماعت میں داخل ہونے کے بعد تختۂ سیاہ کے اس رُخ کو جو پہلے سے طلبہ کی طرف ہوتا اُلٹا دیتے اور خود دوسرے یا اُلٹے رُخ کو استعمال کرتے ممکن ہے کہ ان کے پیشِ نظر طلبہ کی سہولت ہو کہ اگر کوئی طالب علم پہلے گھنٹے کے نوٹس نہیں لکھ سکا تو مٹا دینے سے اس کا حرج نہ ہو۔ اسلم صاحب نے اس عادت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک روز ان کے آنے سے پیشتر تختہ سیاہ کی اُلٹی طرف مشہور انگریزی شاعر ٹینی سن Tennyson کی ایک نظم بعنوان And we kissed again with Tears کا منظوم اردو ترجمہ لکھ دیا۔

اس میں ایسے میاں بیوی کا ذکر ہے جو اپنے مرحوم بچے کی قبر پہ جا رہے ہیں لیکن باہم ناراض ہیں اور ان کی ہر بات سے ناراضگی کا اظہار ہوتا ہے لیکن جب بچے کی قبر پر پہنچتے ہیں تو ناراضگی کافور ہو جاتی ہے۔ اس نظم کا آخری بند اس طرح ترجمہ کیا گیا ہے۔

پہنچے جب گور پہ اس طور سے دونوں باہم
ماتم لختِ جگر میں تھیں نگاہیں پُر نم
ابھی چند روز ہوئے ہم نے جسے کھویا تھا
چھوڑ کر ہم کو وہ اب قبر کی آغوش میں سوتا تھا
اپنے بچے کی اسی چھوٹی سی پھر تربت پر
ہم نے کس پیار سے بوسے لیے پھر رو رو کر

علامہ آئے تو حسبِ معمول تختۂ سیاہ کو الٹایا تو اس طرف اشعار لکھے دیکھ کر سنجیدگی سے صرف اتنا پوچھا **Who wrote this** اس پر اسلم صاحب نے کھڑے ہو کر ادب سے جواب دیا **Sir, I have written this** اس مختصر سے مکالمے کے بعد آپ سبق پڑھانے میں مصروف ہو گئے۔

اس دور میں گورنمنٹ کالج میں جو دیسی ارکان تھے ان میں سب سے زیادہ عزت و احترام کی نگاہ سے صرف علامہ اقبال کو دیکھا جاتا تھا۔ انہی لوگوں میں انگریزی کے ایک متعصب ہندو اسسٹنٹ پروفیسر مسٹر گھوسلہ تھے وہ ایف اے کے طلبہ کو ترجمہ کی مشق کرلاتے تھے ان کا طریق کار یہ تھا کہ وہ از راہِ تعصب چُن کر وہ پیرا ترجمے کے لیے دیتے جس میں کسی نہ کسی پہلو سے مسلمان بزرگوں کی توہین ——— اور مسلمانوں کی دل آزاری کا پہلو نکلتا تھا۔ ایک دن انھوں نے معمول سے زیادہ دریدہ دہنی کا مظاہرہ کیا طلبہ تو پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے اسلم صاحب نے فوراً کھڑے ہو کر کہا:—

Sir, how long will you abuse?

our conscience یعنی آپ کب تک ہمارے ضمیر کو کچوکے لگاتے رہیں گے۔

پروفیسر گھوسلہ نے زہر میں بجھے ہوئے لہجے میں غیظ و غضب کا اظہار کیا

" Get out چلے جاؤ۔

اس پر تمام طلبہ کمرۂ جماعت سے احتجاج کی صورت میں باہر نکل گئے اور لان میں جا بیٹھے۔ اگرچہ طلبہ نے کوئی ہنگامہ وغیرہ نہیں کیا تاہم اس طرح انھوں نے مسٹر کھوسلہ کے خلاف اپنے جذبات کا زبردست مظاہرہ کیا۔ دو دن تک یہ مقاطعہ جاری رہا۔ بعض سرکردہ طلبہ مثلاً خواجہ صادق وغیرہ علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے طلبہ کے دینی جذبہ کو سراہتے ہوئے ہڑتال ختم کرنے کا مشورہ دیا۔ اگلے دن کالج کے پرنسپل مسٹر رالبسن نے جو اپنی سخت مزاجی کے لیے مشہور تھے طلبہ کو اکٹھا کیا۔ پیشتر اس کے کہ مسٹر رالبسن کچھ کہتے اسلم صاحب نے کھڑے ہو کر کہا — Sir, I beg to say ان کا جملہ مکمل ہونے سے پیشتر ہی اس نے سختی سے کہا:
I give you one hour otherwise I shall expel you out.
یعنی ایک گھنٹے کے اندر اندر جماعتوں میں حاضر ہو جاؤ ورنہ میں تمہیں کالج سے نکال دونگا۔ بہر حال طلبہ تو علامہ اقبال کے مشورے کے مطابق پہلے ہی پڑھنے پر آمادہ ہو چکے تھے وہ تو صرف اپنا مدعا پرنسپل صاحب تک پہنچانا چاہتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر رالبسن نے پروفیسر کھوسلہ کو بھی سخت ڈانٹ پلائی کیونکہ اس کے بعد ان صاحب نے پھر کبھی ایسی حرکت نہیں کی۔

انقلاب انگیز مشورہ

اسلم صاحب اسکول کے زمانہ ہی میں شعر و شاعری کا شغل اختیار کر چکے تھے اور منشی محمد ناظر (علیگ) سے بذریعہ خط و کتابت اصلاح لیتے تھے کالج میں داخل ہونے کے بعد بھی ان کا یہ شغل رہا۔ گورنمنٹ کالج میں ہر سال، سالانہ امتحانات کے نتائج کے موقعہ پر تقسیم انعامات کی تقریب میں فطری شاعری کے لیے بھی ایک انعام مخصوص تھا جس کا نام Prize for natural poetry. تھا۔ جس ٹالیفی گروپ Tutorial Group میں ایم اسلم تھے اس کے نگران شعبہ کیمسٹری کے پروفیسر جونز B.M. Johns تھے۔ وہ ہمیشہ اس امر کے خواہش مند رہتے کہ زیادہ

سے زیادہ انعامات ان کے فریق کے حصے میں آئیں ۱۰-۱۹۰۹ء میں شاعری کا جو مقابلہ ہوا۔ اس کے لیے سٹر جونز نے ایم اسلم کو ایک نظم لکھنے کا حکم دیا انہوں نے "وسط ایشیا" کے عنوان سے ایک نظم لکھی جب نظم تیار ہو گئی تو انہوں نے اپنے اتالیق کے سپرد کر دی جنہوں نے اس کو علامہ اقبالؒ کی خدمت میں پیش کیا کیونکہ آپ اس مقابلے کے مستقل منصف تھے۔ اس مرتبہ تقریباً تیس بتیس (۳۰-۳۲) نظمیں پیش کی گئیں۔ علامہ اقبالؒ نے ایم اسلم کی نظم کو اوّل قرار دیا یہ نظم تیس چالیس اشعار پر مشتمل ہے۔ چند اشعار درج ذیل ہیں:

پھر بُلا لے اپنے ویرانوں میں وسط ایشیا
اب تو خاکِ ہند میں میرا گزارا ہو چکا
پھر چھپا لے اپنے دامانوں میں ہندو کش مجھے
یاد پھر آتے ہیں منظر وہ ترے دلکش مجھے
بات لیکن جو ترے سنسان ویرانوں میں تھی
صورت آبادی میں بھی اس کی نہیں ملتی کبھی
تھا جہاں صدق و صفا واں مکر ہے اور جھوٹ ہے
سچ کہا ہے میوہ اس ہندوستان کا پھوٹ ہے

تقسیم انعامات کے جلسے کی صدارت صوبے کے لیفٹیننٹ گورنر نے کی۔ اس تقریب میں کالج کے پروفیسروں، طالب علموں کے علاوہ شہر کے معززین بھی شریک تھے۔ ایم اسلم کو اول انعام دیا گیا اور اسی محفل میں ایک ڈرامہ پیش کیا گیا جس کے بعد انہوں نے اپنی نظم ترنم سے سنائی علامہ اقبالؒ کے خادم خاص علی بخش مرحوم کو بھی اس محفل میں ایم اسلم کی نظم سننے کا اتفاق ہوا۔

ان دنوں علامہ اقبال بھاٹی دروازے کے ایک مکان میں فروکش تھے اسلم صاحب ہفتے میں ایک دو مرتبہ ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے تقسیم انعامات کے جلسے کے اگلے روز کالج میں چھٹی تھی۔ اسلم صاحب علامہ کے ہاں پہنچے تو مشہور فارسی شاعر اور نظام دکن کے

استاد مولانا گرامی جالندھری بھی موجود تھے جو اکثر علامہ سے ملنے کے لیے لاہور آتے اور کئی کئی دن تک آپ کے ہاں قیام کرتے تھے۔ گرمیوں کا موسم تھا دونوں بزرگ اپنی اپنی چارپائی پر دراز تھے۔ چھت میں لٹکا ہوا پنکھا علی بخش کھینچ رہا تھا۔ اسلم صاحب نے حسبِ معمول بڑے ادب سے سلام عرض کیا۔ دونوں بزرگوں نے شفقت سے جواب دیا۔ تقریباً اسی وقت علی بخش نے پنجابی میں کہا "واہ اسلم جی! راتیں تسیں حد کر دِتی" (واہ اسلم صاحب رات آپ نے کمال کر دیا) مولانا گرامی اونچا سنتے تھے۔ انہوں نے علی بخش سے پنجابی میں دریافت کیا "کی گل اے؟" (کیا بات ہے؟) علی بخش نے گزشتہ رات کی تقریب اور اسلم صاحب کی نظم کا ذکر کیا جو بہت پسند کی گئی تھی۔ یہ سن کر مولانا گرامی نے فرمایا "او منڈیا کجھ سانوں بھی سُنا" (اے لڑکے کچھ ہمیں بھی سناؤ) میاں صاحب نے چونکہ کبھی علامہ کی موجودگی میں شعر نہیں پڑھا تھا اس لیے وہ خاموش رہے۔ مولانا گرامی نے غالباً اس خاموشی کو اپنی توہین خیال کیا اور گرج کر کہا "او منڈیا تُوں سُنیاں نئیں؟" (ارے لڑکے کیا تُو نے میری بات نہیں سُنی) اسلم صاحب نے علامہ کی طرف دیکھا جنہوں نے اجازت دی تو اسلم صاحب نے جھجکتے ہوئے ایک شعر سُنایا ؎

قیس اڑائے نہ جنوں سے جو کبھی گردو غبار
سُرمہ پھر زیب دہِ چشمِ غزالاں نہ رہے

یہ سُن کر گرامی صاحب بولے "ایہہ تے تیرے اُستاد دا رنگ اے کجھ ہور سُنا" (یہ تو تمہارے استاد کا رنگ ہے کچھ اور سُناؤ) اس جملے میں استاد سے مراد علامہ اقبال تھے۔ کیونکہ وہ اسلم صاحب کے کالج میں پروفیسر تھے ورنہ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اسلم صاحب چوہدری خوشی محمد ناظر سے اصلاح لیتے تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا گرامی حضرت علامہ ہی کو اسلم صاحب کا استاد سمجھتے تھے بہرحال مولانا گرامی کے ارشاد کی تعمیل میں ایک شعر اور سنایا ؎

جس طرح سے بنے گزارا کر ٭ اب زمانہ نہیں شکایت کا

علامہ اقبالؒ اب تک خاموش رہے تھے یہ شعر سُن کر انہوں نے فرمایا "پھر پڑھو" یہ علامہ کے داد دینے کا طریقہ تھا۔ اسلم صاحب نے شعر دہرایا۔ علامہ سن کر کچھ دیر خاموش رہے پھر فرمانے لگے "اسلم شعر مت کہا کرو نثر لکھا کرو"۔ اس ایک جملے نے اسلم صاحب کے دل کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ انہوں نے "شاعری" چھوڑ دی لیکن سوال یہ تھا کہ لکھا کیا جائے انہوں نے ایک روز علامہ سے اپنی الجھن کا ذکر کیا کہ نثر میں ناول اور افسانے ہی لکھے جا سکتے ہیں اور یہ اکثر بے مقصد ہوتے ہیں اس کا کیا کیا جائے؟ اقبال نے فرمایا "تم افسانہ لکھو یا ناول وہ بے مقصد نہیں ہونا چاہیے"۔ اسی طرح ایک روز فرمایا "جو کچھ لکھو قومی نقطۂ نظر سے لکھو"۔

میاں صاحب کے والد کو ان کی افسانہ نگاری کا شغل بالکل پسند نہیں تھا ایک دن علامہ اقبال ان کے ہاں تشریف لائے تو انہوں نے اس کی شکایت کی اور کہا کہ وہ اسلم کو افسانے وغیرہ لکھنے میں وقت ضائع کرنے سے منع کریں اس پر علامہ نے مسکرا کر فرمایا:

"مَیں نے اسلم کو ہدایت کر دی ہے کہ جو کچھ لکھے کسی مقصد کے تحت لکھے۔ مقصد کے تحت لکھنا برا نہیں"۔ ظاہر ہے یہاں مقصد سے قومی مقصد مراد ہے جس کے لیے خود علامہ اقبال نے اپنی تمام صلاحیتیں وقف کر دی تھیں۔ بہرحال علامہ کی مردم شناسی اور اصابت رائے کی داد دینا پڑتی ہے کہ انہوں نے اسلم صاحب کو جو مشورہ دیا وہ انہیں بہت زیادہ راس آیا۔ میاں صاحب نے پوری یکسوئی سے اس میدان میں کام شروع کر دیا اور جلد ہی غیر معمولی شہرت و عظمت کے مالک بن گئے۔ اگر وہ شعر و شاعری ہی کرتے رہتے تو شاید اونچے شاعر نہ بن سکتے۔

مسلم نوجوانوں کی تربیت

اسی زمانے کا ذکر ہے کہ علامہ نے بعض طلبہ کے ذوق و شوق سے متاثر ہو کر یہ پروگرام بنایا کہ وہ اپنے دوست مرزا جلال الدین کی کوٹھی پر دس بارہ مخصوص طلبہ کو جمع کرتے اور ان کے سامنے اپنے اس کلام کی تشریح فرماتے جو انہوں نے انجمن حمایت

اسلام وغیرہ کے اجلاسوں میں پڑھا اور کتابچوں کی صورت میں شائع کیا جا چکا تھا اس محفلِ خاص میں ایم اسلم کو بھی شرکت کا موقع ملا یہ سلسلہ تقریباً ایک مہینہ تک جاری رہا۔ اس کے بعد اچانک منقطع ہو گیا بعد میں معلوم ہُوا کہ انسپکٹر جنرل پولیس (پنجاب) جو علامہ اقبال کا ذاتی طور پر قدردان تھا ایک دن علامہ سے کہنے لگا کہ آپ کی محفل خاص کے شرکا میں دو چار ہمارے (سرکاری) مخبر بھی ہیں تو علامہ نے اپنے کلام کی تشریح کا کام ختم کر دیا۔

"مرزا مینڈکی" سے "مرزا جی" تک

ایم اسلم صاحب نے ایک مرتبہ مشہور امریکی ادیب مارک ٹوین Mark Twain کے ایک انشائیے Jim Smiley & his jumping frog کا آزاد ترجمہ "مرزا مینڈکی" کے نام سے کیا جو اس وقت کے مشہور ادبی رسالے "نیرنگِ خیال" میں شائع ہُوا۔ اس کے بعد ایک روز اسلم صاحب علامہ اقبالؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو علامہ نے مسکراتے ہوئے یہ فقرہ چست کیا "لو مرزا مینڈکی آ گئے" چوہدری محمد حسین بھی پاس بیٹھے تھے انہوں نے کہا "علامہ تمہارا ترجمہ پڑھ چکے ہیں" چونکہ اس زمانے میں کانگریس کا بڑا زور تھا۔ علامہ نے اسی بنا پر ارشاد فرمایا "اسلم صاحب! جس انداز میں تم نے مرزا مینڈکی لکھا ہے اسی رنگ میں کانگریس کے متعلق لکھو" اس ضمن میں انہوں نے کچھ ضروری ہدایات بھی دیں۔ علامہ اقبالؒ کی تعمیلِ حکم میں ایم اسلم صاحب نے مزاحیہ انداز میں کانگریس کے خلاف کئی مضامین لکھے جن میں ہندو نیتاؤں کی کافرانہ ذہنیت اور کہیں کہیں "شریمتی کانگریس بائی" کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ پھر ان مضامین کو انہوں نے ایک مجموعے کی صورت میں "مرزا جی" کے نام سے شائع کیا جو بہت پسند کیا گیا۔ لیکن "ہندوستانی" اس پوسٹ مارٹم کی تاب نہ لا سکی۔ ہندو پریس نے اس کتاب اور مصنف کے خلاف طوفان بدتمیزی برپا کر دیا مشہور ہندو اخباروں ٹربیون (لاہور) اور امرت بازار پتریکا (کلکتہ) نے بھی خوب زہر اگلا حکومت سے مطالبہ ہونے لگا کہ "مرزا جی" کو فی الفور ضبط کیا جائے۔ مصنف پر مقدمہ چلایا جائے وغیرہ۔ بہت سے

اخباروں نے مطالبہ کیا کہ ایم اسلم کو پنجاب بدر کیا جائے ۔ دوسری طرف مسلم پریس چپ سادھے ہوئے تھا ۔ صرف ماہنامہ ساقی (دہلی) اور انگریزی روزنامہ سٹیٹسمین (کلکتہ) میں ایم اسلم کی حمایت میں کچھ شائع ہوا ۔ اس پہ اسلم صاحب اور خصوصًا ان کے والد ماجد میاں نظام الدین مرحوم بہت پریشان ہوئے ۔ علامہ اقبال کو خبر ہوئی تو انہوں نے میاں نظام الدین کو تسلی دی اور فرمایا "میاں صاحب فکر نہ کریں انشاء اللہ اسلم کا بال تک بیکا نہ ہوگا" ہندوؤں کے شور و غوغا سے متاثر ہو کر حکومت پنجاب کے سیکرٹری مسٹر گاربٹ نے حکم دیا کہ ایم اسلم کی کتابوں میں ہندوؤں کے نقطۂ نظر سے جو قابلِ اعتراض تحریریں ہوں ان کا ترجمہ پیش کیا جائے ۔ یہ صاحب بہت سخت گیر مشہور تھے لیکن انہیں کوئی قانون نہ مل سکا جس کی مدد سے وہ میاں صاحب کی ان تحریروں پہ انہیں سزا دے سکتے ۔ آخرکار حکومت پنجاب کی طرف سے ایک پریس نوٹ شائع ہوا جس میں اعلان کیا گیا تھا کہ ایم اسلم نے خلافت پارٹی احرار پارٹی اور کانگریس پارٹی کی سرگرمیوں پہ مزاحیہ انداز میں تنقید کی ہے لہٰذا کوئی اقدام نہیں کیا جا سکتا ۔ آخری الفاظ کچھ اس قسم کے تھے :

Book is humorous and harmless
Therefore no action is needed

اس طرح علامہ اقبال کی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی کہ "ایم اسلم کا بال تک بیکا نہ ہوگا"

انقلابِ اسلام

مئی ۱۹۳۴ء کی بات ہے اسلم صاحب کوہ مری جا رہے تھے ۔ جانے سے ایک دو روز پیشتر آپ حسبِ معمول علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد آپ نے قریب پڑی ہوئی ایک کرسی پر رکھی ہوئی دو چار انگریزی کتابوں میں سے ایک کتاب اٹھائی اس کتاب کا نام The Political and Religious Revolution in Islam تھا اور ایک آسٹریلین نومسلم فیلکس ویلائی Felex Vilai نے لکھی تھی ۔ علامہ نے یہ کتاب اسلم صاحب کو دی اور فرمایا "یہ کتاب لے جاؤ اور اسے اپنے انداز میں اردو

میں منتقل کر دو۔" اسلم صاحب کتاب ساتھ لے گئے اور بڑی محنت سے ترجمہ کیا اور اس کا عنوان "انقلابِ اسلام" رکھا۔ ڈھائی تین مہینے بعد جب مری سے واپس آئے تو ایک روز مسودہ اور اصل کتاب لے کر علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے علامہ نے مسودہ دیکھ کر مسکراتے ہوئے فرمایا "بڑی ہمت کی تم نے" اور مسودہ رکھ لیا چند دن بعد جب اسلم صاحب پھر ان کی خدمت میں گئے تو علامہ نے بہت تحسین و آفرین کی اور اسلم صاحب کی درخواست پر حوصلہ افزائی کے لیے پانچ سات سطریں بطورِ تبصرہ لکھ دیں مسودے پر کئی ایک جگہ اصلاح بھی فرمائی۔ اس سے علامہ کے احساسِ ذمہ داری کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک مقام پر مسٹر گاندھی کا بھی ذکر تھا حضرت علامہ نے مسودے کے حاشیے پر اپنے قلم سے لکھا تھا "گاندھی بین الاقوامی مساوات کا حامی نہیں فیلکس ویلائی کا خیال بالکل غلط ہے اور ہندوستان کی سیاست سے اس کی بے خبری کی دلیل ہے۔" اسلم صاحب اس کتاب کی اشاعت کی فکر میں تھے۔ کہ ایک روز ایک ملنے والے جو بڑے علم دوست سمجھے جاتے تھے آ گئے۔ باتوں باتوں میں "انقلابِ اسلام" کا ذکر آ گیا وہ دو ایک روز میں واپس کرنے کے وعدے پر مسودہ مستعار لے گئے لیکن پھر نہ وہ لوٹ کر آئے نہ مسودہ بھیجا۔ اسلم صاحب نے اس واقعہ کا ذکر علامہ سے بھی کیا۔ اس واقعے کے تقریباً ۱۲ سال بعد گم گشتہ مسودہ اچانک مل گیا کوئی دوست امرتسر سے لے کر آئے تھے۔ استفسار پر فرمانے لگے کہ فلاں مقام پر یہ کتاب ردی کے بھاؤ بک رہی تھی میری نظر اس پر جا پڑی تو ردی کے حساب سے تلوا کر لے آیا ہوں۔" اسلم صاحب بہت خوش ہوئے دوست کا شکریہ ادا کیا لیکن انہیں اس امر کا ہمیشہ افسوس رہا کہ کتاب پر علامہ اقبالؒ کی تعریفی و تعارفی تحریر والا صفحہ کہیں گم ہو چکا تھا۔ یہ کتاب اب چھپ چکی ہے اور غالباً نایاب ہے اس کا مطبوعہ نسخہ مجھے ایم اسلم کی مہربانی سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس کے آغاز میں اسلم صاحب کے مسودے کے ایک صفحہ کا عکس بھی شامل ہے جس پر علامہ اقبالؒ کے ہاتھوں سے اصلاح کا نمونہ بھی ہے اگر اصل مسودے پر علامہ اقبال کی اصلاحات کا جائزہ لیا جائے تو اس سے علامہ کی شخصیت کے مطالعے

میں خاصی سہولت پیدا ہوگی۔ بہرحال اس کتاب کے موضوع سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ کو ۱۹۳۴ء میں اپنی وفات سے تین چار سال پیشتر بھی مسلمانوں کی بیداری کا کس قدر خیال تھا اور وہ اپنی ملت کے نوجوانوں کو ایسے علمی کاموں کے لیے ہمیشہ آمادہ کرتے رہتے تھے جو بعد میں ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کا سبب بنیں۔

ایم اسلم نے "انقلاب اسلام" (مسلمانان عالم کا سیاسی پس منظر) مطبوعہ دارالبلاغ لاہور کا پس منظر کتاب کے صفحہ نمبر ۳ تا ۵ پر "بارہ سال بعد" کے عنوان سے جو کچھ بیان کیا ہے اس کا متعلقہ حصہ درج ذیل ہے:۔

۱۹۳۴ء کی گرمیوں میں کوہ مری جانے سے پیشتر ایک روز میں استاد مکرم حضرت علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ حضرت علامہ کرسی پر بیٹھے تھے پاس ہی ایک اور کرسی پر دو تین کتابیں رکھی تھیں۔ حضرت مرحوم و مغفور نے ان میں سے ایک کتاب دی پولیٹیکل اینڈ ریلجس ریوولیوشن اِن اسلام The Political and Religious Revolution in Islam. مصنفہ فیلکس ویلائی (آسٹرین نومسلم) اٹھا کر مجھے دی اور ارشاد فرمایا کہ میں اس کتاب کا مطالعہ کروں اور اگر ہو سکے تو اسے اردو میں منتقل کر دوں۔ میں نے عرض کیا کہ میں تو ایک دو روز میں تبدیل آب و ہوا کے لیے کوہ مری جا رہا ہوں ارشاد فرمایا کہ "کتاب ساتھ لے جاؤ" کچھ دیر بعد میں اجازت لے کر واپس چلا آیا۔

پہاڑ پر آکر میں نے اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا فیلکس ویلائی کی اس مشہور عالم کتاب کا ترجمہ یورپ کی اکثر زبانوں میں بھی ہو چکا تھا۔ میں نے حضرت علامہ کے ارشاد کے مطابق اسے اردو میں منتقل کر دیا کوئی دو اڑھائی مہینے بعد جب میں واپس آیا تو ایک روز حضرت علامہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوا اور کتاب اور ترجمہ پیش کر دیا آپ ترجمہ دیکھ کر ذرا مسکرائے اور فرمایا "بڑی ہمت کا کام ہے" مسودہ آپ نے دیکھنے کو رکھ لیا۔

چند روز بعد جب میں پھر حاضر ہوا تو حضرت ممدوح نے مسودہ مجھے واپس عنایت فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ کہیں دو ایک جگہ نوٹ لکھ دیا گیا ہے اب اسے جلد شائع کروا دو۔

مَیں نے دبی زبان سے عرض کیا کہ اگر مناسب ہو تو کتاب کے متعلق اپنے دست مبارک سے کچھ لکھ دیں۔ قلم دوات کرسی پر پاس رکھی تھی جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے حضرت علامہ نے پانچ سات سطریں لکھ کر کاغذ مجھے دے دیا اور مَیں نے وہیں بیٹھے بیٹھے حضرت علامہ کی تحریر بھی مسوّدہ میں شامل کر لی۔

مَیں نے واپس آکر مسوّدہ دیکھا تو استاد مکرم نے بہت سے مقامات پر اپنے قلم سے کچھ اصلاح اور درستی بھی فرمائی تھی۔

اب مَیں یہ کتاب شائع کرنے کی فکر میں تھا کہ ایک روز ایک صاحب ملنے تشریف لے آئے۔ مَیں نے جب مسودہ کر ذکر کیا تو انہوں نے مسوّدہ پڑھنے کی خواہش ظاہر فرمائی اور دو تین روز میں مسوّدہ واپس کر دینے کا وعدہ کیا۔ مَیں نام تو نہیں بتلانا چاہتا لیکن آدمی چونکہ بظاہر معقول تھے مَیں نے مسوّدہ دے دیا اور وہ نامعقول آدمی مسوّدہ لے کر ایسا غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ کچھ روز بعد مَیں نے یہ تمام واقعہ حضرت علامہ کی خدمت میں عرض کر دیا اور آپ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ یہ ۱۹۲۴ء کا واقعہ ہے پورے بارہ سال گزر گئے نہ وہ صاحب خود تشریف لائے نہ مجھے مسوّدہ واپس ملا۔ لیکن ۱۹۴۶ء کے اختتام پر ایک عجیب اتفاق سے مسوّدہ مجھے مِل گیا۔ مسوّدہ ملنے کی تو جو خوشی ہوئی سو ہوئی لیکن یہ دیکھ کر افسوس بھی بے حد ہوا کہ حضرت علامہ کی تحریر غائب تھی آج اتنی مدت کے بعد مجھے اس تحریر میں سے صرف ایک فقرہ یاد ہے:

"یہ کتاب ہر پڑھے لکھے مسلمان کو پڑھنی اور اپنے ناخواندہ بھائیوں کو پڑھ کر سنانی چاہیے"۔

ان الفاظ کے بعد حضرت علامہ کے دستخط تھے۔

قرآن حکیم کا احترام

میاں صاحب کہتے ہیں کہ "مَیں نے متعدد مرتبہ قرآن مجید کو اقبالؒ کے مطالعے کی میز پر دیگر کتابوں کے ساتھ پڑا دیکھا۔ ایک مرتبہ مَیں نے ادب کے ساتھ انہیں اس طرف متوجہ کیا تو فرمانے لگے "یہ کسی قیمتی اور خوبصورت غلاف

میں لپیٹ کر اور عطر میں بسا کر اونچی جگہ پر رکھنے والی کتاب نہیں بلکہ یہ تو انسان کے ہر وقت کام آنے والی کتاب ہے۔ چونکہ مجھے اکثر اس کے حوالے کی ضرورت پیش آتی ہے اس لیے یہاں رکھی ہے۔" اس پر مجھے معلوم ہوا کہ علامہ کی نگاہ میں قرآن مجید کی عظمت اور تقدس کا سبب اور معیار کیا تھا۔

بقاء دوام

ایم اسلم صاحب نے اولاد سے محرومی کی بنا پر اپنی ہمشیرہ کی بچی لے کر پرورش کی۔ اس بچی کا نام اصغری تھا ایم اسلم اور ان کی بیوی، اصغری کو بہت لاڈ پیار سے رکھتے تھے۔ ۲۸ اگست ۱۹۲۶ء کو یہ بچی اچانک فوت ہو گئی اس حادثہ جانکاہ سے اسلم صاحب بہت متاثر ہوئے اظہارِ غم کے طور پر ایک نظم "میرا بچہ"، کے عنوان سے لکھی۔ علامہ کو جب اسلم صاحب کے رنج و غم کی شدت کا علم ہوا تو انہوں نے چار پانچ اشعار موت وحیات کے فلسفے پر لکھ بھیجے جو اب دستیاب نہیں ہو سکے۔ علامہ نے انہیں روح اور زندگی کے موضوع پر لائبریری سے چند کتابیں بھی منگوا کر دیں ان کتابوں کے مطالعہ کے بعد اسلم صاحب نے "بقاء دوام" کے نام سے ایک کتاب لکھی جو ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کو اہلِ نظر نے بہت پسند کیا۔ اس طرح علامہ اقبال نے شدید رنج و غم کے منفی جذبے کو تعمیری راہ پر ڈال دیا۔ ایم اسلم اس کے بعد بھی اس موضوع پر پڑھتے رہے اور کئی سال بعد انہوں نے اپنی تحقیقات کو "موت کے بعد" نامی کتاب کی صورت میں شائع کر دیا ہے۔

ہرن کا گوشت

علامہ اقبال کو ہرن کا گوشت بہت پسند تھا اور اسلم صاحب جو شکار کے بہت شوقین رہے ہیں جب کبھی شکار سے لوٹتے تو ہرن کا گوشت علامہ کی خدمت میں پیش کرتے جب زیادہ دن گزر جاتے تو پوچھتے "اسلم صاحب! ہرن کا گوشت کب کھلائیں گے"

اختلاط مرد و زن

ایک روز میاں صاحب کے گھر میں کوئی تقریب تھی میاں صاحب کی والدہ نے ان سے کہا کہ جا کر علامہ سے عرض کریں کہ اگر ان کی بیگم صاحبہ بھی تقریب میں شامل ہوں تو ہماری عزت افزائی ہوگی۔ میاں صاحب نے اپنی والدہ کا پیغام عرض کر دیا یہ سُن کر علامہ خاموش ہو گئے کچھ توقف کے بعد فرمایا:

"میاں صاحب کی خدمت میں میرا اسلام عرض کریں اور کہیں کہ میں عورتوں کا محفلوں میں مِل جُل کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا یہ ہمارے لیے مفید نہیں ہے۔"

یونیورسٹی کا تعارف

ایک دفعہ مسلمانوں کا ایک وفد سر آغا خاں کی قیادت میں لاہور آیا ان دنوں اخبارات میں علی گڑھ یونیورسٹی کا بڑا چرچا تھا۔ سر آغا خاں کی صدارت میں برکت علی محمڈن ہال میں ایک جلسہ ہوا اسلم صاحب بھی وہاں موجود تھے جلسہ میں حضرت علامہ نے ایک رباعی پڑھی۔

وہ رباعی یہ ہے:۔

باہر ہوئے جاتے ہو کیوں جامے سے
پوچھو کسی پنڈت سے نہ علامے سے
میں تم کو بتاتا ہوں یونیورسٹی کیا ہے
پتلون کی ٹکرار ہے پاجامے سے!

ایک شعر کا پس منظر

جس زمانے میں علامہ اقبال انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں اپنی شاہکار نظمیں سنایا کرتے تھے۔ ایم اسلم صاحب ان جلسوں میں حاضر ہو کر علامہ کی نظمیں سُنا کرتے تھے علامہ ایک خاص لَے کے ساتھ اپنا کلام سناتے تھے ان کی یہ لَے اس قدر مقبول ہوئی کہ طلبہ ان کا کلام ان ہی کی لَے میں جلسوں اور مشاعروں میں پڑھنے لگے

اسی بات سے متاثر ہو کر علامہ نے یہ شعر کہا:

اڑالی قمریوں نے، طوطیوں نے، عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

کتابوں کے تحفے

علامہ اقبالؒ کی زندگی میں ان کے کلام کے جو مجموعے شائع ہوئے۔ علامہ نے تقریباً ہر مجموعے کا ایک نسخہ ایم اسلم کے والد ماجد میاں نظام الدین رئیس اعظم لاہور کی خدمت میں پیش کیا۔ اس وقت میاں صاحب کے پاس ایسی صرف تین کتابیں ہیں جن پر علامہ اقبال کے دستِ خاص کی مختصر تحریر اور دستخط ہیں۔

(۱) "بانگِ درا" ۱۹۲۴ء میں پہلی بار اشاعت پذیر ہوئی۔ اس کے سرورق پر درج ہے۔

بخدمت جناب میاں نظام الدین صاحب رئیس لاہور
محمد اقبال ۳ر ستمبر ۱۹۲۴ء

(۲) ۱۹۲۴ء میں علامہ کا فارسی مجموعہ کلام "پیام مشرق" دوسری بار شائع ہوا، اس کا ایک نسخہ علامہ نے میاں صاحب کی خدمت میں بدیں الفاظ پیش کیا۔

بخدمت جناب قبلہ میاں نظام الدین صاحب رئیس اعظم
مخلص محمد اقبال ۲۷ر مارچ ۱۹۲۴ء

(۳) ۱۹۲۷ء میں آپ کا فارسی مجموعہ کلام "زبور عجم" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے سرورق پر علامہ نے یہ لکھا:

بالخدمت میاں نظام الدین رئیس لاہور
محمد اقبال ۱۹ر جون ۱۹۲۷ء
لاہور

کتبہ نذیر احمد ابن عبید اللہ۔ موضع امراؤ خورد